حصہ چہارم

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

تصحیح وتنقیح شدہ جدید ایڈیشن



مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

استاذ دار العلوم بڑودہ، گجرات

ومجازِ صحبت عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی



باہتمام: محمد ناصر خان

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

(حصۂ چہارم)

تصحیح وتنقیح شدہ جدید ایڈیشن (۲۰۱۶ء)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اور اشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاء اللہ اس گلدستہ سے زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں علم وعمل اور رشد و ہدایت کے خوشگوار اور سدابہار پھول کھل اُٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

استاذ: دارالعلوم بڑودا، گجرات

ومجازِ صحبت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی مدظلہ العالی

تفصیلات

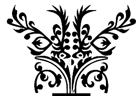
نام کتاب	:	گلدستۂ احادیث (حصۂ چہارم)
مؤلفہ	:	مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی
تصحیح وتنقیح	:	قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات
کمپیوٹر کتابت	:	رشید احمد آچھودی (فون: 09428689113)
طبع رابع	:	۱۴۳۷ھ مطابق: ۲۰۱۶ء
تعدادِ صفحات	:	۴۵۳

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی (09825315073)

(۲) مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

(۳) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,



اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ



تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَ الْمُرْسَلِيْنَ، وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

اَمّابعد...... اللہ رب العزت نے کسی بھی ظاہری سبب و وسیلہ کے بغیر محض اپنے فضل و کرم سے رحمۃ للعالمین ﷺ کو کتاب و حکمت کے علوم عطا فرمائے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء : ۱۱۳)

جس کی وجہ سے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں سب سے بڑے معلم بن گئے، عجیب بات تو یہ ہے کہ دنیا والوں میں سے کسی سے آپ ﷺ نے تعلیم حاصل نہیں کی، دنیا میں کوئی آپ ﷺ کا استاذ نہیں، مگر آپ ﷺ سب کے استاذ ہیں، آپ ﷺ نے اگر چہ کسی سے نہیں پڑھا، لیکن ساری دنیا کو پڑھا دیا، یہ آپ ﷺ کا نہایت عظیم اور روشن ترین معجزہ ہے؛ کیوں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ ایک ایسے علاقہ اور ماحول میں پیدا ہو کر پلے بڑھے جو علم و ہدایت سے دور اور جہالت و ضلالت سے بھرپور تھا، مزید برآں آپ ﷺ بظاہر یتیمی اور بے بسی کے عالم میں پیدا ہوئے، جس میں تعلیم و تربیت اور کسی کتاب سے استفادہ کا آپ ﷺ کے لیے تقریباً امکان نہ تھا، ایسی حالت میں انسانی فطرت کے عام تجربہ کے لحاظ سے آپ ﷺ کا جو حال اور رنگ ڈھنگ ہونا چاہیے اس کا اندازہ لگانا کسی کے لیے بھی مشکل نہ تھا۔

لیکن بعثت کے بعد رب العالمین نے جیسے ہی رحمۃ للعالمین ﷺ کو اپنے تلمذ (شاگردی) میں لیا، تو حضور ﷺ کے لیے علوم و معارف اور معانی و حقائق کے دفتر کھول دیے، اور

آپ ﷺ کی تعلیم و ہدایت سے دنیا میں بے شمار کتب خانے تیار ہو گئے، ان کتب خانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک حصہ وہ جس کا تعلق آپ ﷺ کے لائے ہوئے قرآنِ کریم سے ہے، جو دراصل کلام اللہ ہے، جس کے الفاظ بھی آسمانی اور الہامی ہیں، اور دوسرا حصہ وہ جس کا تعلق آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات، تعلیمات، ارشادات اور ان قولی وفعلی ہدایات سے ہے جو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول اور کلام اللہ کے معلم و شارح اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے امت کو دیتے تھے، جس کو اولاً صحابہ رضی اللہ عنہم نے (اپنی خداداد قوتِ حافظہ، آپسی مذاکرہ اور تعامل کے ذریعہ) محفوظ رکھ کر بعد والوں تک پہنچایا، ثانیاً بعد والوں نے اسے پورے احساسِ ذمہ داری اور امانت داری کے ساتھ کتابی شکل میں محفوظ کر دیا، آپ ﷺ کی تعلیمات اور قولی وعملی ہدایات کے اس حصہ کا عنوان ''حدیث'' یا ''سنت'' ہے۔

اس میں جہاں تک تعلق ہے قرآنِ کریم کا، تو وہ کلام اللہ ہے، اور شرعی اعتبار سے اس کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ پوری قطعیت کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، اس کی صحت اور استناد میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، لیکن احادیث طیبہ کو بھی یہ اہمیت حاصل ہے کہ شریعت مطہرہ کے تفصیلی احکام ہمیں اسی دلیل شرعی کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں، بلکہ قرآنِ کریم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے بھی احادیث طیبہ اور سنن نبویہ کی رہنمائی لازم ہے، ان کے بغیر آیاتِ قرآنیہ کے معانی ومقاصد کی افہام وتفہیم ناممکن اور ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ کے مترادف ہے۔

سنن نبویہ اور احادیث طیبہ کی اسی اہمیت وعظمت کے پیش نظر علماء نے انہیں اپنی توجہات کا مرکز بنایا، اور ان کی حفاظت واشاعت کے لیے اپنے اپنے زمانوں میں مختلف جہتوں سے حدیث پاک کی بے مثال خدمات انجام دیں۔

جیسے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ کے بقول: عصر حاضر میں ہوائی جہاز جب کسی ائیر پورٹ پر کھڑا ہوتا ہے تو عملہ کے مختلف گروہ اس پر اپنے اپنے کام شروع کر دیتے ہیں، کوئی سیڑھی لگا کر مسافروں کو اتارتا ہے، کوئی لفٹر لگا کر سامان جہاز سے نکالتا اور اسے کنوئیر بیلٹ (Conveyor belt) تک پہنچاتا ہے، کوئی تخریب کاری سے جہاز کی حفاظت کے لیے مسلح ہو کر اس کے ارد گرد چکر لگانا شروع کر دیتا ہے، کوئی جہاز کے پرزوں کی چیکنگ شروع کر دیتا ہے،

11

کوئی اس میں آئندہ سفر کے لیے پیٹرول ڈالنا شروع کر دیتا ہے، تو کوئی کیبن کی صفائی پر لگ جاتا ہے، غرض مختلف قسم کے لوگ جہاز سے متعلق احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، احادیث طیبہ کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح ہے، حضور ﷺ کی ایک ایک حدیث پر حضراتِ علماءِ کرام کی مختلف جماعتوں نے مختلف جہتوں سے کام کیا، کسی نے متن حدیث پر کام کیا تو کسی نے سند حدیث پر، کسی نے احادیث طیبہ کا مجموعہ اور گلدستہ اس طرح تیار کیا کہ ہر ایک صحابی کی تمام مرویات یکجا کر دیں، محدثین کی اصطلاح میں اسے مسند کہتے ہیں، جیسے ''مسند احمد، '' مسند حمیدی'' وغیرہ، کسی نے صحابی کے بجائے اپنے ہر استاذ کی مرویات علیحدہ جمع کیں، ایسے مجموعہ اور گلدستہ کو ''معجم'' کہتے ہیں، جیسے طبرانی کی "المعجم الکبیر، "المعجم الأوسط" اور "المعجم الصغير" وغیرہ، کسی نے احادیث طیبہ میں فقہی ابواب ہی کو جمع کیا، اس کو ''سنن'' کہتے ہیں، جیسے ''سنن ابی داؤد'' اور ''سنن نسائی'' وغیرہ، تو بعض علماء نے دین وشریعت کے تمام ابواب پر حاوی احادیث طیبہ کو یکجا کیا، اس کو جامع کہا جاتا ہے، جیسے ''صحیح بخاری، صحیح مسلم اور جامع ترمذی'' وغیرہ۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ احادیث طیبہ کے جو ہزاروں مجموعے مسانید، معاجم، سنن اور جوامع وغیرہ کی شکلوں میں عہدِ نبوی سے لے کر عصر حاضر تک تیار ہوئے ہیں، پھر ان ہی کتبِ احادیث سے ہر ہر دور اور علاقے کے مخصوص تقاضوں کے مطابق بعد کے علماء نے مختلف جہتوں سے جو تحقیقی، تشریحی اور اصلاحی انداز میں کارنامے انجام دیے یہ اللہ جل شانہ کی حکمت بالغہ اور قدرتِ کاملہ کی نظیر ہونے کے ساتھ رحمت عالم ﷺ کے زندہ معجزہ ہونے کی بڑی دلیل بھی ہے۔

یہ سلسلہ ''گلدستۂ احادیث'' بھی (جس کی اب چوتھی جلد آپ کے سامنے ہے، مؤلف کی علمی تہی مائیگی اور بے حیثیتی سے قطع نظر) اپنے مبارک موضوع کے لحاظ سے اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔

بالیقین اس ربِ کریم کا شکر ادا کرنے سے زبان قاصر اور عاجز ہے، جس نے اپنے ایک نااہل اور گنہگار بندے پر فضل عظیم فرما کر یہ توفیق بخشی کہ وہ اسلام کا پیغام انسانیت کے نام عام کرنے کے لیے ریاض الحدیث سے اپنے موضوع کے مطابق احادیث طیبہ کا انتخاب کر کے ایک گلدستہ پیش کرے، اور اس طرح اپنے ہفتہ واری خطاب کو کتاب کی شکل دے کر خدامِ حدیث کے

زمرہ میں شامل ہو۔

يَا رَبِّى ! لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِى لِجَلَالِ وَ جُهِكَ وَ عَظِيمِ سُلْطَانِكَ.

من آں خاکم کہ ابرنو بہاری ☆ کند از لطف بر من قطرہ باری
اگر روید از تن صد زبانم ☆ چو سبزہ، شکر لطفش کے توانم؟

بحمد اللہ ! اب تک تین گلدستے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں، اب چاروں حصوں کو صدیق مخلص حضرت مولانا قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی دامت برکاتہم (استاذِ حدیث دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر) کی تصحیح و تنقیح کے ساتھ از سرنو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اس سے قبل کہ قارئین محاسبہ کا کام انجام دیں راقم آثم "حَاسِبُوْا قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوْا" (ترمذی) پر عمل کرتے ہوئے قصورِ علم و عمل بلکہ تقصیرات کے مجموعہ کا اعتراف کرتے ہوئے قارئین کرام سے عفو و نصح کا طالب اور آرزومند ہے، نیز "گلدستۂ احادیث کو بحمد اللہ اشاعت دین کی غرض سے ترتیب دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی صاحب توفیق بندہ یا ادارہ بغیر کسی ترمیم کے اسی غرض سے شائع کرنا چاہے تو عاجز کی طرف سے اجازت ہے۔ فقط والسلام......

العبد العاصی الراجی الیٰ عفو الباری
ابو خلیق محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی
نزیل: جامع رشید، دیوبند
۷/ ربیع الثانی / ۱۴۳۷ھ
مطابق: ۱۸/ جنوری/ ۲۰۱۶ء/ بروز پیر

دعائیہ اشعار

از

شاعرِ اسلام حضرت مولانا قاری احسان محسنؔ صاحب دامت برکاتہم

حمد کرتا ہوں خدائے پاک کی ☆ اور مدحت صاحبِ لولاک کی
خالقِ کُل نے ہمیں پیدا کیا ☆ خیرِ اُمت کا ہمیں مژدہ دیا
ہم کو سنت کا بتایا راستہ ☆ علمِ دیں سے کر دیا آراستہ
حضرت مولانائے مفتی شفیق ☆ تیری ہی نظرِ کرم سے ہیں خلیق
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وفا ☆ اہلِ تقویٰ، صاحبِ صدق و صفا
اک معلّم، اک مصنف، اک ادیب ☆ اک محقق، اک مدبر، اک نقیب
پیر و مرشد حضرتِ قمر الزماں ☆ ان کے تقوے پر ہیں نازاں بے گماں
متعدد لکھیں کتابیں آپ نے ☆ دینِ حق کی کی اشاعت آپ نے
کتنی تاثیر آپ کی باتوں میں ہے ☆ جو کتابیں آپ کے ہاتھوں میں ہیں
ان کے علم و فضل کی بین دلیل ☆ پڑھنے والوں کے لیے تحفہ جلیل
آپ کی تحریر کو دل سے پڑھو ☆ جس قدر ہو فائدہ حاصل کرو
جو پڑھو اس پر عمل پیرا رہو ☆ اور حضرت کو دعاءِ خیر دو
یہی محسنؔ کی دعا ہے اے خدا! ☆ عام ہو اور آپ کا فیضِ ہُدیٰ

☆......☆......☆

مقدمہ

از

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان جب بازار سے کوئی مشین خرید کرتا ہے تو اس کے طریقۂ استعمال اور میکانزم کو جاننے کے لیے اسے دو چیزیں دی جاتی ہیں: ایک تو مشین کا تعارفی کتابچہ، جس میں اس کی تفصیلات اور اس کے طریقۂ استعمال کے سلسلہ میں ہدایات درج ہوتی ہیں، دوسرے مشین کے میکانزم سے واقف اور اس کے استعمال میں مہارت رکھنے والا نمائندہ جو عملی طور پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے، یہ دونوں چیزیں جیسے مشین کے استعمال کے لیے ضروری ہیں ویسے ہی انسان کی اپنی زندگی کے سلسلہ میں صحیح راستہ پر قائم رہنے کے لیے بھی لازمی ہیں؛ کیوں کہ انسان صرف ایک مشین ہی نہیں ہے؛ بلکہ بے شمار مشینوں کا مجموعہ ہے، اس کا ایک ایک عضو ایک مشین ہے، ایسی مشین جس کا کوئی بدل نہیں، اور خالقِ کائنات کے علاوہ کسی کے لیے ایسی صنعت اور کاریگری ممکن نہیں، پھر انسان کے گرد جو وسیع و عریض کائنات پھیلی ہوئی ہے اور جس کو انسان ہی کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس میں سے وہ کس چیز کو اور کس طرح استعمال کرے؟ اس کے لیے بھی اسے کسی باخبر ذات کی رہنمائی مطلوب ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ رہنمائی کون کرسکتا ہے؟ قرآنِ مجید نے اس سلسلہ میں ایک واضح اصول بتلایا ہے کہ جو انسان کا خالق ہے، جس نے اسے پیدا کیا ہے اُسی کو یہ بات سزاوار ہے کہ وہ زندگی گذارنے کے اصولوں کی رہنمائی بھی کرے، اور اس کے لیے احکام وقوانین متعین کرے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْأَمْرُ﴾ کیوں کہ جو خالق

ہوگا، وہ انسان کی فطرت، اس کے مزاج و مذاق، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات نیز اس کی ضروریات اور مصلحتوں سے پوری طرح واقف ہوگا، اس لیے اسی کا فیصلہ انسان کے لیے مفید اور قابل عمل ہوسکتا ہے؛ چنانچہ قرآنِ حمید نے بار بار زور دیا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾

اور یہ بات بھی واضح فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین اور اس کی نازل کی ہوئی شریعت پوری طرح فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾

اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور مرضیات سے واقف ہونے کے لیے خالق کائنات کی طرف سے دو انتظام فرمائے گئے: پہلا کتاب کا؛ چنانچہ ہر عہد میں اور ہر قوم کے لیے آسمانی کتابیں نازل کی گئیں، جو انسانیت کے لیے چراغِ راہ کا کام انجام دے سکیں، دوسرے: ہر زمانہ میں اللہ نے اپنے رسول بھیجے، جن کی دو بنیادی ذمہ داریاں تھیں: ایک اللہ کی کتاب کو بے کم وکاست اللہ کے بندوں تک پہنچا دینا، دوسرے: اپنے قول اور فعل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو واضح کرنا، اور انسان کے لیے مرضیاتِ ربّانی کا عملی نمونہ پیش کرنا، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، ان ہی سے اس مبارک سلسلہ کا آغاز ہوا، اور پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اس کا حسن اختتام ہے، اس لیے قرآنِ مجید آخری کتاب ہے اور پیغمبر اسلام آخری رسول ہیں۔

قرآنِ مجید جہاں ہمیں انسانی زندگی کے سلسلہ میں بنیادی ہدایات اور اساسی تعلیمات سے روشناس کرتا ہے وہیں رسول اللہ ﷺ اپنے قول وفعل کے ذریعہ ان تعلیمات کی تفصیلات اور اس پر عمل آوری کے طریقے کو واضح فرماتے ہیں؛ اسی لیے آپ ﷺ کا یہ منصب بتایا گیا کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری قرآن مجید کو پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح و توضیح بھی ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہم تک جو باتیں پہنچی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح الفاظِ قرآن آپ ﷺ پر اتارے ہیں اسی طرح بیان القرآن بھی آپ پر وحی کیا گیا ہے: ﴿وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی﴾

جہاں قرآنِ مجید کو دلیل شرعی کے اعتبار سے یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ پوری قطعیت کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، اور اس کی صحت واستناد میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، وہیں حدیث کو بھی یہ اہمیت حاصل ہے کہ شریعت کے تفصیلی احکام ہمیں اسی دلیل شرعی کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں؛ بلکہ حدیث کے بغیر ہم قرآنِ مجید کو بھی کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتے، اسی لیے امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ ”اَلۡکِتَابُ اَحۡوَجُ اِلَی السُّنَّۃِ، مِنَ السُّنَّۃِ اِلَی الۡکِتَابِ“ یہی وجہ ہے کہ علمِ حدیث پوری اسلامی تاریخ میں اپنے اپنے عہد کے اکابر اہل علم اور اصحابِ تحقیق کی جدوجہد کا مرکز رہا ہے، اور اسلامی تاریخ کی بہترین ذہانتیں اور صلاحیتیں اس میدان میں صرف ہوئی ہیں۔

ایک دور حدیث کے زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کا تھا، پھر دوسرا دور اس کی تنقیح و ترتیب کا آیا، جب معتبر اور غیر معتبر حدیثوں کے درمیان خطِ فاصل کھنچے، اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب غیر معتبر روایات کو چھانٹنے کی کوشش کی گئی، اور بعض لوگوں نے راوی کے اعتبار سے اور بعض نے مضمون کے اعتبار سے احادیث کے مجموعے مرتب کیے، اور زیادہ تر مجموعے آج کسی تحریف وتصحیف کے بغیر محفوظ ہیں۔ تیسرا مرحلہ احادیث کی تشریح وتوضیح کا تھا، علماء نے اس جانب توجہ کی، اور کتبِ احادیث کی ایسی مبسوط شرحیں لکھیں جو اپنی مثال آپ ہیں، وہ ہمیشہ سے امت کے لیے سرمۂ چشم بنتی رہی ہیں، اور قیامت تک لوگ اس سے نفع اٹھاتے رہیں گے۔

لیکن ظاہر ہے کہ حدیث کے متون اور شروح کا یہ سارا سرمایہ عربی زبان میں ہے،

اور اسلام ایک آفاقی دین ہے، جو جغرافیائی اور لسانی حدود سے بالاتر ہے، اسی لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں قرآن مجید کے ترجمے کیے گئے، اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً اٹھارہ سو زبانوں میں اس وقت قرآنِ پاک کا ترجمہ موجود ہے، اسی طرح احادیثِ نبویہ کے ترجمہ کی طرف بھی توجہ کی گئی، اگرچہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کام باقی ہے، اور اس پہلو سے جو کچھ خدمت ہوئی ہے وہ ضرورت کے اعتبار سے بہت کم ہے۔

اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کی آغوش میں پیدا ہوئی ہے، اور اردو نثر ونظم کی ابتداء ان اہل علم سے ہوئی ہے جو قرآن وحدیث کے ترجمان اور اسلامی علوم و معارف کے حامل تھے، اسی لیے شروع ہی سے اس زبان میں اسلامی لیٹریچر کی تالیف و تصنیف کا کام ہوتا رہا ہے، یہ کام تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں میں ہوا ہے، حدیث میں یہ کوشش مختلف جہتوں سے ہوئی ہے، متونِ حدیث کا ترجمہ، احادیث کے ترجمہ کے ساتھ ان کی تشریح وتوضیح اور خود اردو قارئین کے لحاظ سے فضائل وآداب اور عقائد واحکام سے متعلق منتخب احادیث کے ایسے مجموعوں کی ترتیب جو حدیث کے متن، اس کے ترجمہ، اور اس کے ساتھ ساتھ تشریحی نوٹس پر مشتمل ہوں، جہاں کتبِ حدیث کے ترجمہ وحواشی کے اعتبار سے نواب قطب الدین صاحب کی ”مظاہرِ حق“ کو بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے، اسی طرح احادیث کے مستقل مجموعوں اور ترجمہ وتشریح کے اعتبار سے ماضی قریب کی خدمات میں حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ کی ”ترجمان السنۃ“ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی ”معارف الحدیث“ کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہے، جہاں مولانا میرٹھیؒ کی کتاب کو علماء و خواص کے درمیان قبولیت حاصل ہوئی وہیں مولانا نعمانیؒ کی اس خدمت کو امت کے تمام طبقات کے اور خاص کر عوام کے درمیان غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی، اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کی ضرورت کے لحاظ سے احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب خدمات کو جو اس کی مرضی اور خوشنودی کے مطابق ہوں قبول فرمائے۔ آمین۔

اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ''گلدستۂ احادیث'' ہے، جس کو میرے عزیز دوست محبّی فی اللہ وعزیزی الاعز جناب مولانا مفتی محمد شفیق صاحب شاہ بھائی بڑودوی صاحب زیدت حسناتہ نے تالیف کیا ہے، مؤلف نے اس کتاب میں ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جو مسلمانوں کی ہمہ جہتی دینی ضروریات سے متعلق ہیں، اس میں عبادات کے ساتھ ساتھ معاشرت اور معاملات سے متعلق نبوی ہدایات کو شامل رکھا گیا ہے، اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ حدیثیں زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ اور خاص کر ''مشکوٰۃ المصابیح'' سے لی جائیں، حدیثوں کو مع اعراب لکھا جائے؛ تاکہ عوام کو پڑھنے میں سہولت ہو، پھر حدیث کا سلیس اور عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے، پھر حدیث کی تشریح اس طور پر کی گئی ہے کہ اس مضمون سے متعلق آیات اور احادیث یکجا ہو جائیں، لوگوں پر واقعات اور اپنے ہی جیسے انسانوں پر گذرے ہوئے حالات کا زیادہ اثر ہوتا ہے، اس لیے اس مضمون سے متعلق صحابۂ کرامؓ اور بزرگوں کے واقعات کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ہر بات میں حوالہ ذکر کرنے کا اہتمام، موضوع سے متعلق اشعار اور بعض جگہ پوری پوری نظمیں بھی ذکر کر دی گئی ہیں، کہ بعض دفعہ ایک شعر ایک صفحہ پر بھاری ہوجاتا ہے، زبان و بیان میں سلاست بھی ہے اور شیرینی بھی، اور ان سب کے ساتھ ساتھ عام فہم ہے، مؤلف چوں کہ ایک کامیاب خطیب بھی ہیں اس لیے انہوں نے جابجا حسبِ ضرورت خطیبانہ لب ولہجہ میں بھی عوام کو اپنا مخاطب بنایا ہے، غرض کہ احادیث کا یہ مجموعہ مضامین کے اعتبار سے جامع، زبان کے اعتبار سے عام فہم، ماٰخذ کے اعتبار سے مستند اور استفادہ کے اعتبار سے عوام وخواص دونوں حلقوں کے لیے نافع بھی ہے۔

کتاب کے مؤلف ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، والد ماجد ایک ممتاز عالمِ دین اور علومِ اسلامیہ کے کہنہ مشق مدرس ہیں، خود مؤلفِ عزیز گجرات کی ایک اہم اور مقبول دینی درسگاہ دارالعلوم بڑودا کے فاضل اور اب اسی بافیض درسگاہ میں کامیاب استاذ بھی ہیں، ''گلدستۂ احادیث'' کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے بھی ان کی متعدد تالیفات منظرِ عام پر

آ چکی ہیں، اور انہیں عوام وخواص نیز علماء ومشائخ کے درمیان یکساں پذیرائی حاصل ہوئی ہے، ''گلدستۂ احادیث'' جو امید ہے کہ پانچ جلدوں میں آئے گی اور جس کی چوتھی جلد اس وقت پریس میں ہے ایک ایسی کاوِش ہے جو مؤلف کی عالی ہمتی، بلند حوصلگی، جذبۂ سعیِ پیہم، فکر ونظر کی سلامتی اور علماء و اہل اللہ کے ساتھ تعلق کا شاہدِ عدل ہے، ہندوستان میں فقہی مسائل کی تحقیق اور جدید شرعی مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو ادارے قائم ہیں ان کے سیمیناروں میں مؤلف کے مقالات وقعت واعتبار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

علومِ ظاہری میں ترقی کے ساتھ ساتھ مؤلف تزکیہ واحسان کی منزلوں کو طے کرنے میں بھی مشغول ہیں، اور موجودہ دور کے ایک صاحبِ دل بزرگ، مخدومی و معظمی حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی متعنا اللہ بطول حیاتہ کے مسترشد اور مجاز بھی ہیں، اور اپنے مزاج کی سلامتی اور سعادت مندی کی وجہ سے اپنے بزرگوں کی محبت اور توجہ سے انہیں حظِ وافر ملا ہے، یہ یقیناً ان کے لیے ایک بڑی خوش بختی ہے، اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ سے زیادہ دین اور علمِ دین کی خدمت لیں، اور وہ راہِ علم کے ایسے مسافر ثابت ہوں جن کے لیے ہر ہر منزل راستہ بنتی چلی جائے۔

امید ہے کہ ان کی یہ تالیف عنداللہ بھی مقبول ہوگی اور عندالناس بھی، ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم.

خالد سیف اللہ رحمانی
۱۵/ ذوالقعدۃ/ ۱۴۳۵ھ
وارد: سری نگر، کشمیر

تقریظِ بلیغ

از

پیر طریقت مفکرِ ملت حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلا شبہ قرآن مجید ہی اسلام کا اصل ماخذ واساس ہے، تاہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کے اُتارنے سے پہلے انسانیت کے شفیق پروردگار نے ایک برگزیدہ رسول کو بھیجا، تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں؛ بلکہ اسی رسول کے قولی وعملی بیان وتشریح میں اللہ کے کلام کو سمجھیں، اور اِسی وجہ سے روزِ اوّل سے ہی قرآن مجید کی تفسیر وتوضیح کے ساتھ حامل قرآن سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کی تشریح وتفہیم اور ان کے اعمال واخلاق کی روایت اور وضاحت کا سلسلہ بھی جاری ہے، اردو میں بھی اس سلسلے کی بہت معیاری خدمات انجام پا چکی ہیں۔

اِسی زریں سلسلے کی ایک کڑی وہ کتاب ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، محترم مولانا محمد شفیق صدیقی بڑودوی صاحب چند سالوں سے خود اپنے دروسِ حدیث کو اصلاحی مقصد سے ترتیب دے کر شائع کرا رہے ہیں، تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ چوتھی جلد ہے جو آپ کے زیر مطالعہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبولیت ونافعیت کے لحاظ سے ممتاز مقام عطا فرمائے، اور تادمِ آخر ہم سب کو اپنے دین کی مخلصانہ خدمت میں لگائے رکھے۔ آمین۔

خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نقشبندی
مدیر: ''الفرقان''، لکھنؤ

(۱)

دل کب بنتا اور بگڑتا ہے؟

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ النُّعۡمَانِ بۡنِ بَشِيۡرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: " اَلۡحَلَالُ بَيِّنٌ، وَ الۡحَرَامُ بَيِّنٌ، وَ بَيۡنَهُمَا مُشۡتَبِهَاتٌ، لَا يَعۡلَمُهُنَّ كَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسۡتَبۡرَأَ لِدِيۡنِهٖ وَ عِرۡضِهٖ، وَ مَنۡ وَّقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ، وَقَعَ فِي الۡحَرَامِ، كَالرَّاعِيۡ يَرۡعٰى حَوۡلَ الۡحِمٰى، يُوۡشِكُ أَنۡ يَرۡتَعَ فِيۡهِ، أَلَا ! وَ إِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا ! وَ إِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ، أَلَا ! وَ إِنَّ فِي الۡجَسَدِ مُضۡغَةً، إِذَا صَلُحَتۡ صَلُحَ الۡجَسَدُ كُلُّهٗ، وَ إِذَا فَسَدَتۡ فَسَدَ الۡجَسَدُ كُلُّهٗ، أَلَا ! وَ هِيَ الۡقَلۡبُ."

(متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۲۴۱/ کتاب البیوع/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رحمتِ عالم ﷺ نے اِرشاد فرمایا کہ ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی (یعنی شرعاً جن چیزوں کا حلال ہونا نص سے معلوم ہو چکا، مثلاً کھانے، کمانے وغیرہ کی مشہور ومعروف چیزیں اور شکلیں، اِسی طرح جن چیزوں کا حرام ہونا بھی نص سے ثابت ہو چکا، مثلاً سود وشراب وغیرہ مشہور ومعروف چیزیں، تو اُن کا معاملہ بالکل ہی واضح اور روشن ہے) لیکن اُن کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، جنہیں

(ائمۂ مجتہدین اور علماءِ راسخین فی العلم کے علاوہ) اکثر لوگ نہیں جانتے، (مثلاً ایک شخص نے حرام وحلال دونوں ذرائع سے مال جمع کیا، تو ظاہر ہے کہ وہ مال مشتبہ ہے۔ اِسی طرح مثلاً ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا، اتفاق سے اُن دونوں میاں بیوی کے متعلق کسی دوسری عورت نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے تم دونوں کو تمہارے بچپن میں دودھ پلایا ہے، تو اب یہ میاں بیوی کا رشتہ بھی مشتبہ ہوگیا۔ اِس طرح کی صورتوں میں) اب جو شخص بھی مشتبہ چیزوں سے (ازراہِ احتیاط) اپنے آپ کو بچالے گا، وہ اپنے دین وایمان اور عزت کو بچالے گا اور جو مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو جائے گا، تو وہ حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔ اُس کی مثال اُس چرواہے کی طرح ہے جو اپنے جانور (ایسی) چراگاہ کے اِردگرد چراتا ہے (جو سرکاری محفوظ و ممنوع جگہ ہے) اِس صورت میں اِس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ جانور اُس (سرکاری محفوظ وممنوع جگہ اور) چراگاہ میں داخل ہوکر گھاس چرنے لگیں۔ (جس طرح چرواہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو محفوظ وممنوع علاقہ و چراگاہ سے دور رکھے، اِسی طرح ایک مومن کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ممنوع اُمور کے علاوہ مشتبہ باتوں سے بھی محفوظ رکھے، تقویٰ اِسی کا تقاضا کرتا ہے) یاد رکھو! ہر بادشاہ اور حاکم کا ایک حِمیٰ (محفوظ وممنوع الدخول علاقہ) ہوتا ہے، اِسی طرح اللہ کا وہ حِمیٰ (محفوظ وممنوع الدخول حدود) اُس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ (لہٰذا اگر کسی نے اُن منہیات ومحرّمات پر عمل کیا، تو وہ ایسا ہی ہے گویا اللہ کی ممنوعہ حدود میں داخل ہونے والا، ظاہر ہے ایسا شخص سزا کا مستحق ہے) اچھی طرح جان لو کہ جسمِ انسانی میں بھی (سینہ کے بائیں جانب صنوبری شکل کا ایک خاص عضو مضغۂ لحم یعنی) گوشت کا ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ اگر درست رہے تو سارا جسم درست رہتا ہے، اور اگر وہی بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، خوب اچھی طرح سن لو! وہ (گوشت کا ٹکڑا اور لوتھڑا) دل ہے۔"

دل کی مرکزیت:

اللہ رب العزت نے اعضاءِ انسانی میں دل کو مرکزیت عطا فرما کر گویا اُسے سلطان

اور اعضاء کو لشکر بنادیا، ظاہر ہے کہ لشکر بادشاہ کے حکم کے تابع ہوتا ہے، تو اعضاء بھی دل کے تابع ہیں، یوں تو یہ ایک مختصر سا گوشت کا ٹکڑا ہے؛ لیکن ظاہری، جسمانی، مادی نیز باطنی، روحانی وایمانی ہر اعتبار سے انسان کے بننے اور بگڑنے کا انحصار اور دارومدار اِسی دِل کے بننے اور بگڑنے پر ہے۔ جیسا کہ حدیثِ مذکور کے آخری حصہ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ظاہری اور باطنی اعتبار سے اگر دِل درست ہوتا ہے، یعنی اُس میں اللہ کا ڈر رہتا ہے، تو اِنسانی سوچ وفکر درست، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر غرض تمام اعضاءِ جسمانی کا استعمال بھی درست ہوتا ہے۔

جیسے گاڑی کا انجن جدھر ہوتا ہے سارے ڈبے اُسی طرف جاتے ہیں، اِسی طرح دِل کا انجن بھی اگر نیکی کی طرف جاتا ہے تو اعضاءِ انسانی کے سارے ڈبے اُسی طرف جاتے ہیں، ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ﴾ (الأنفال: ٢٤)

اور جان لو! اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جاتا ہے۔ یعنی جب دل میں حق وہدایت اور نیکی کی سچی طلب ہوتی ہے تو اس وقت اگر گناہ کا خیال آ بھی جائے، تو اس کے اور گناہ کے درمیان اللہ تعالیٰ فاصلہ فرمادیتے ہیں، معلوم ہوا کہ دِل اگر ایمان اور تقویٰ کے نور سے منوّر ہو جائے تو نیکی کرنا اور گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، بلکہ ولی اللہ بننا بھی آسان ہو جائے، کیوں کہ ولایت کا تعلق ایمان وتقویٰ سے ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ (يونس: ٦٣)

لیکن اِن دونوں کا تعلق دِل سے ہے، اس لیے دِل کے نیک بن جانے سے انسان نیک اور اللہ تعالیٰ کا ولی بن جاتا ہے۔

لیکن اگر دِل ہی بگڑ جائے، تو پھر اِنسانی سوچ وفکر اور اِسی طرح تمام اعضاء پر اُس کے بگاڑ کا اثر ہوتا ہے، دِل کے بننے سے انسان میں انسانیت پیدا ہوتی ہے اور بگڑنے سے حیوانیت وشیطنت آتی ہے۔

دِل کی کیفیت وحالت:

پھر جسمانی اعضاء میں دِل کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی حالت وکیفیت یکساں نہیں رہتی؛ بلکہ بدلتی رہتی ہے، اُس کی حکمت تو حکیمِ مطلق ہی جانتا ہے؛ لیکن اُس کی ایک وجہ غالبًا یہ بھی ہے کہ دل کو عربی زبان میں ''قلب'' کہتے ہیں، اور قلب کے معنیٰ ہیں: اُلٹنا پلٹنا، تو دِل کو قلب اِسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے، اُس کی حالت وکیفیت بدلتی رہتی ہے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے:

وَ مَا سُمِّيَ الإِنْسَانُ إِلَّا لِأُنْسِهٖ ☆ وَ مَا الْقَلْبُ إِلَّا أَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

ترجمہ: انسان کو اُس کی اُنسیت کی وجہ سے انسان کہتے ہیں اور قلب کو اُس کے اُلٹ پُلٹ ہونے کی وجہ سے قلب کہتے ہیں۔

دِل کا حال یہ ہے کہ نیک ماحول میں نیکی کی طرف مائل ہوجاتا ہے، تو بُرے ماحول میں بدی کی طرف۔ جیسا کہ حضرت حنظلہؓ کا واقعہ مشہور ہے، یہ اگر ذکرِ الٰہی ونیکی کے نور سے منوّر ہوجاتا ہے، تو کبھی وساوسِ شیطانیہ وبدی کی تاریکی سے متاثر بھی ہوجاتا ہے، کبھی حق اور ہدایت وسعادت کی طرف جھک جاتا ہے، تو کبھی ضلالت وشقاوت کی طرف پلٹ جاتا ہے، کبھی موم کی طرح نرم بن جاتا ہے، تو کبھی لوہے کی طرح سخت، اُس پر کبھی حیات کی کیفیت طاری ہوتی ہے، تو کبھی موت کی، کبھی یہ تندرست ہوتا ہے، تو کبھی بیمار، اور کبھی غافل ہوتا ہے، تو کبھی بیدار۔ غرض انسانی دِل کے یہ مختلف احوال وکیفیات ہیں، جو بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ابوبکر وراقؒ فرماتے ہیں کہ قلبِ انسانی پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں: (۱) حیات، (۲) موت، (۳) صحت، (۴) بیماری، (۵) بیداری، (۶) غفلت۔

(معالم العرفان فی دروس القرآن/ص:۹۶، مستفاد از ''حکایتوں کا گلدستہ''/ص:۸۵)

جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

دِل کی حیات اور موت کی علامت:

دِل کی حیات قبولِ ہدایت ہے، اور موت ضلالت ہے، ''حَيَاتُهُ الْهِدَايَةُ وَ مَوْتُهُ الضَّلَالَةُ''، جس خوش نصیب انسان کو قبولِ دینِ حق وہدایت کی توفیق نصیب ہوجائے تو یہ اُس کے زندہ دل ہونے کی علامت ہے، اِس اعتبار سے ہر مومنِ کامل کا دِل بحمداللہ زندہ ہوتا ہے، اور جو بدنصیب دینِ حق وہدایت کے نور سے محروم رہ جائے تو یہ اُس کے مردہ دِل ہونے کی علامت ہے، اِس اعتبار سے ہر بے ایمان کا دِل مردہ ہوتا ہے، اور دِل کی حیات اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اِس لیے کہ جب دِل ہدایت سے زندہ وپرنور ہوتا ہے تو انسان کو نیکی کی رغبت، پھر نیکی کے بعد فرحت، گناہ سے نفرت، پھر گناہ کے بعد ندامت نصیب ہوتی ہے، اُس کے برخلاف جب دِل نورِ ہدایت سے بے نور اور مردہ وگمراہ ہوجاتا ہے تو انسان کو عموماً نیکی سے وحشت اور گناہ کی رغبت اور بعد میں فخر ومسرت ہوتی ہے، دِل کی ہدایت سے انسان ہدایت اور خیر کی طرف مائل ہوتا ہے، جب کہ دِل کی ضلالت سے انسان گمراہی و برائی کی طرف راغب ہوکر عذابِ الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے، اِس لیے دِل کی گمراہی بہت بڑی بربادی ہے، قرآنِ پاک میں جہنمیوں کی پہچان یہی بیان کی گئی، چنانچہ فرمایا گیا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ؕ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝﴾ (الأعراف/۱۷۹)

آج بھی اُن کے سینوں میں دل تو ہیں، مگر نورِ ہدایت سے محروم ونابینا، اُنہیں سب کچھ سمجھ میں آتا ہے، مگر حق سمجھ میں نہیں آتا، اُن کی آنکھیں اگرچہ بینا ہیں، مگر دِل نابینا ہیں، ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (الحج:۴۶)

ترجمہ: صرف آنکھیں ہی اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینوں میں موجود دِل بھی اندھے ہوتے ہیں۔

اور یاد رکھو! آنکھوں کا اندھا پن دینی واُخروی اعتبار سے اِتنا نقصان دہ نہیں ہوتا جتنا دِل کا اندھا پن نقصان دہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ دِل کے اندھوں کے لیے جہنم کی وعید ہے، جب کہ آنکھوں کے اندھوں کے لیے جنت کی بشارت ہے، (بشرطیکہ وہ آنکھوں کی بصارت کے ساتھ دِل کی بصیرت سے محروم نہ ہوں) حدیثِ پاک میں اِرشادِ نبوی ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ : سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ : " قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالىٰ : "إِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِيْ بِحَبِيْبَتَيْهِ، ثُمَّ صَبَرَ، عَوَّضْتُهٗ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ." يُرِيْدُ : عَيْنَيْهِ. (رواه البخاری، مشکوٰۃ المصابیح : ١٣٥) (حدیث قدسی نمبر : ١)

اِس حدیثِ پاک میں آنکھوں کی بینائی سے محرومی پر صبر کرنے والے بندۂ مومن کے لیے وعدۂ جنت ہے۔ الغرض! دِل کا بے نور اور گمراہ ہونا بڑی بربادی ہے، اُسے بینا وزندہ کرنے کے لیے دینِ حق اور اُس کی ہدایت کو قبول کرنا ضروری ہے۔ ؎

دِل مردہ دل نہیں، اُسے زندہ کر دوبارہ ☆ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

ہمارے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ یوں تو ہر گناہ بہت برا ہے، لیکن چار باتیں گناہ سے بھی زیادہ بری ہیں: (۱) گناہ کو حقیر سمجھنا۔ (۲) گناہ کر کے خوش ہونا۔ (۳) گناہ پر اِصرار کرنا۔ (۴) گناہ پر فخر کرنا۔ یہ باتیں دِل کے گمراہ ہونے سے پیش آتی ہیں۔

دِل کی صحت و بیماری کے علامت:

قلبِ سلیم وہ ہے جو عقائدِ صحیحہ، اخلاصِ کامل اور اخلاقِ حسنہ سے متصف ہو، اب جس خوش نصیب کو حیاتِ قلب کی عظیم سعادت و دولت مل جائے، تو اُس کے لیے اُس کی حفاظت کرنا بھی بہت ضروری ہے، ورنہ جس طرح ایک زندہ انسان اگر اپنی صحت کی حفاظت نہ کرے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے، بالکل اِسی طرح ایک زندہ دِل انسان بھی اگر اپنی حیاتِ قلب کی حفاظت نہ کرے، تو اُس کا صحیح، سالم اور تندرست دِل بھی بیمار ہو جاتا ہے، اور دِل کی درستی امراضِ روحانی سے اُس کا صحت یاب ہونا ہے، جب کہ اُن میں مبتلا ہونا بیماری ہے، واقعہ یہ

ہے کہ بیماری جس طرح جسمانی ہوتی ہے اِسی طرح روحانی وقلبی بھی ہوتی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم نے کافرین ومنافقین کے متعلق فرمایا کہ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ (البقرۃ: ١٠) اُن کے دِلوں میں روگ ہے، وہ دل کے مریض ہیں، اور جو اُس سے محفوظ ہو وہ صحیح، سالم اور تندرست ہے، فرمانِ خداوندی کے مطابق قیامت میں کامیابی اُسی کو ملے گی جس کا دِل صحیح، سالم وتندرست ہوگا، ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الشعراء: ٨٨-٨٩)

قیامت میں مال واولاد والا نہیں، قلبِ سلیم والا کامیاب ہوگا۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ ''اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں قلبِ سلیم سے مراد دِل کا شک وشرک سے پاک ہونا ہے۔'' (گلدستۂ تفاسیر ۵/۲۴۰)

معلوم ہوا کہ کفر وشرک اور نفاق دِل کے اصل مرض؛ بلکہ امراض کا مجموعہ ہیں، اُن ہی کے نتیجہ میں دِل کی مختلف اور مہلک بیماریاں مثلاً اتباعِ شہوت، حرص وحسد، بغض وعداوت، کینہ وغصہ اور بخل وکبر وغیرہ وجود میں آتی ہیں، یہ تمام گناہ دراصل دِل کی روحانی بیماریاں ہیں، اُن کے اصل مریض تو کافرین اور منافقین ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا استحضار نہ ہونے سے زندہ دِل ایمان والوں کو بھی یہ مہلک وروحانی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔

جس طرح جسم کے ظاہری امراض کا علاج ضروری ہے اِسی طرح دِل کے روحانی امراض کا علاج بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ مرض کا آخری نتیجہ موت ہے، اگر جسم کے ظاہری امراض کا صحیح علاج نہ ہو تو انسان مر کر قبر کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے، تو دِل کے روحانی امراض کا صحیح علاج نہ ہونے سے انسان کی انسانیت مر جاتی ہے، اور وہ جہنم کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے، اُس سے قبل آج موقع ہے دِل کی روحانی بیماریوں کے کامیاب علاج کا، عاجز کے خیالِ ناقص میں اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کا دھیان واستحضار اور کثرتِ استغفار ضروری ہے؛ کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ کا استحضار ہوگا تو انسان شیطانی حملوں اور گناہوں سے محفوظ رہے گا،

چنانچہ حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "اَلشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ، فَإِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ، وَ إِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ." (رواہ البخاری تعلیقاً، مشکوٰۃ / ص:۱۹۹)

ترجمہ: شیطان انسان کے دِل پر چپکا رہتا ہے، جس وقت انسان اللہ کی یاد اور اُس کے استحضار و دھیان میں ہوتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور جیسے ہی وہ اللہ سے غافل ہوتا ہے بس اُسی وقت شیطان انسان کو وسوسوں اور گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے، اُس کے بعد یہ انسان توبہ واستغفار کا اہتمام کرتا ہے تو اُس کا دِل گناہوں کی گندگی و بیماری سے پاک وشفایاب ہوجاتا ہے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں مروی ہے:

عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ کَانَتْ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فِيْ قَلْبِہٖ، فَإِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ، وَ إِنْ زَادَ زَادَتْ، حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ، فَذٰلِکُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی: کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ." (رواہ أحمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ/ ص:۲۰۴، باب الاستغفار)

ترجمہ: جب مومن گناہ کرتا ہے تو اُس کے دِل میں ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اب اگر وہ توبہ واستغفار کرلیتا ہے تو دِل اُس سیاہ داغ سے صاف ہوجاتا ہے، ورنہ کثرتِ معاصی سے قلبِ انسانی بالکل سیاہ اور سخت ہوجاتا ہے، اور یہی دِل کا وہ زنگ ہے جس کا ذکر ارشادِ ربانی ﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ میں ہے۔

اور دِل کا زنگ و مرض اللہ تعالیٰ کے دھیان واستحضار اور کثرتِ استغفار سے دور ہوگا، طہارتِ قلب اور دوائے دِل کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔

دِل کی غفلت و بیداری کی علامت:

لیکن دِل کے زندہ وصحت مند ہونے کے باوجود کبھی اُس پر غفلت کا پردہ پڑ جاتا ہے، پھر یہی غفلت گناہ کا سبب بن کر دِل کو میلا وگندہ کر دیتی ہے؛ کیوں کہ گناہوں کی اصل و

جڑ غفلت ہی ہے، جس انسان کا دِل اپنے اللہ اور انجام و عاقبت سے غافل ہوتا ہے وہ گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، اِس لیے دِل کی غفلت اپنے اللہ اور انجام کو بھول جانا ہے، تو بیداری اُس کا استحضار اور ذکر وفکر کرنا ہے، اللہ کے ذکر اور آخرت کے فکر سے دِل کی غفلت دور ہوکر وہ مزکّٰی ومصفّٰی اور نور سے پرنور ہوجائے گا، حدیثِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ دِل کا زنگ ومیل ذکر اللہ سے دور ہوگا، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْھُمَا عَنِ النَّبِیِّ ﷺ أَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ: "لِکُلِّ شَيْءٍ صَقَالَۃٌ، وَ صَقَالَۃُ الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ، وَ مَا مِنْ شَيْءٍ أَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ، قَالُوْا: وَ لَا الْجِھَادُ فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ: وَ لَا أَنْ یَضْرِبَ بِسَیْفِہٖ حَتّٰی یَنْقَطِعَ." (مشکوٰۃ/ص:۱۹۹)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا کہ ہر چیز کی صفائی کے لیے کوئی نہ کوئی مشین وآلہ ہوتا ہے، اور دِل کی صفائی کا آلہ ذکر اللہ ہے، اور عذابِ الٰہی سے بچنے کے لیے ذکرِ الٰہی سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں، صحابہؓ نے عرض کیا: کیا جہاد بھی نہیں؟ فرمایا: نہیں، اگرچہ وہ مجاہد اپنی تلوار سے اتنی بار اور اتنی شدت سے مارے کہ وہ ٹوٹ جائے۔" (تب بھی وہ ذکر اللہ سے افضل نہیں) اِس حدیث میں ذکرِ الٰہی کا ایک بڑا فائدہ دِل کی بیداری وصفائی کو بتایا گیا۔

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ بندہ جتنا زیادہ ذکر اللہ کا اہتمام کرے گا اُتنا ہی زیادہ اُس کا دِل پاک وصاف ہوگا، اور اُسے سکونِ قلب کی دولت نصیب ہوگی، جیسا کہ ارشادِ باری سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿أَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد/۲۸)

خلاصہ یہ ہے کہ بگڑے ہوئے دِل کو سنوارنے کے لیے اللہ کا دھیان واستحضار اور ذکر اللہ واستغفار کی کثرت نیز صالحین کی صحبت ضروری ہے، ان شاء اللہ اس کی برکت سے دِل زندہ، صحت مند، بیدار اور چمکدار بن جائے گا، پھر دِل کے سنورنے سے انسان کی دنیا و

آخرت بھی سنور جائے گی۔

لب پے ذکر اللہ کی تکرار ہو ☆ دِل میں ہر دم حق کا استحضار ہو
اِس پر تو اگر کرلے حاصل دوام ☆ پھر تو بس کچھ دِن میں بیڑا پار ہو

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ''ناپاک زمین کے پاک ہونے کی دو صورتیں ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ اِتنی بارش برسے کہ گندگی کو بہا لے جائے۔ (۲) دوسرے اِتنا سورج چمکے کہ نجاست کو جلا کر مٹا دے۔ اِسی طرح (جب) قلب کی زمین (ناپاک ہو جائے تو اُس کی پاکی) کے لیے بھی دو چیزیں ہیں: (۱) ذکرِ الٰہی، جس کی مثال بارش کی سی ہے۔ (۲) دوسرا شیخِ کامل (کی صحبت) جس کی مثال سورج کی سی ہے، ذکر سے دِل صاف ہوتا ہے، جب کہ شیخِ کامل کی صحبت اُس کو مزید چمکاتی ہے۔ (مستفاد از: تصوف و سلوک/ص:۴۷)

حق تعالیٰ ہمیں ذکر اللہ کی کثرت، اہل اللہ کی صحبت اور اجتناب عن المعاصی کی توفیق عطا فرما کر ہمارے دِل کو اپنا مسکن بنادے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۳/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۵ھ/ بروز: اتوار
مطابق: ۲۲/ جون/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۲)

بیعتِ طریقت کی حقیقت اور اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ – وحوله عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهٖ –: ''بَايِعُوْنِيْ عَلٰى أَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَ لَا تَسْرِقُوْا، وَ لَا تَزْنُوْا، وَ لَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ، وَ لَا تَأْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْكُمْ وَ أَرْجُلِكُمْ، وَ لَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ، فَمَنْ وَّفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ، وَ مَنْ أَصَابَ مِنْ ذَالِكَ شَيْئًا، فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا، فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ، وَ مَنْ أَصَابَ مِنْ ذَالِكَ شَيْئًا، ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ، وَ إِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ.'' فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذَالِكَ.
(متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:۱۳/ کتاب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ (جو مشہور انصاری صحابہ میں سے ہیں، اور بیعتِ اولیٰ وثانیہ میں شریک، نیز اصحابِ صفہ کے معلم ہیں، وہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ نے (مومنینِ کاملین) حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اُس جماعت کو جو آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی (مخاطب کرکے) ارشاد فرمایا: تم مجھ سے بیعت کرو اِس بات پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، اور چوری نہیں کروگے، اور زنا نہیں کروگے، (اور فقر وغربت اور بے جا غیرت کے خوف سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے، اور کوئی بہتان

نہ لاؤ گے جسے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان تراش لو، (یعنی کسی پر الزام تراشی اور بہتان بازی نہیں کروگے، اور شریعت کے مطابق جو احکام میں تمہیں دوں اُن کی) نافرمانی نہیں کروگے، اب تم میں سے جو شخص بھی (اِس بیعت کے ذریعہ کیے جانے والے) عہدو قرار کو پورا کرے گا، تو اُس کا اجروثواب اللہ کے ذمہ ہے، اور جو شخص (سوائے شرک کے) اِن میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے، اور پھر دنیا میں ہی (قصاص وحدود وغیرہ جاری کر کے) اُس کو گناہ کی سزا بھی مل جائے، تو یہ سزا اُس کے لیے (دنیوی اور اُخروی اعتبار سے اُن گناہوں کا) کفارہ ہو جائے گی، (جیسا کہ ائمۂ ثلاثہ کا قول ہے، البتہ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمانؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ سچی توبہ کرلے تو اُخروی اعتبار سے بھی اُن گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم، از مظاہر حق جدید/ص:۱۳۱) اور اگر اللہ نے اِن گناہوں کے مرتکب کی اپنے لطف وکرم سے پردہ پوشی فرما دی، جس کی وجہ سے اُسے دنیا میں بھی کوئی سزا نہ ملی، تو یہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے کہ چاہے تو اپنے فضل وکرم سے آخرت میں بھی دنیا کی طرح پردہ پوشی اور معافی کا معاملہ فرمائے، اور اگر چاہے تو گناہ کے بقدر سزا دے۔ (راویٔ حدیث فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ وعظ سننے کے بعد) ہم نے اِن سب اُمور پر بیعت کرلی۔

انسان کی فضیلت کا مدار تقویٰ، توبہ اور اصلاح پر ہے:

خالقِ کائنات نے بے شمار مخلوقات پیدا فرمائیں، لیکن بنیادی طور پر اُن کی تین قسمیں ہیں: (۱) نوری، (۲) ناری، (۳) خاکی۔

نوری وہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا فرمایا، جیسے ملائکہ، حدیث میں ہے: "خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ" (مسلم، مشکوٰۃ/ ص:۵۰۶) فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا۔

چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں برائی اور نافرمانی کی طاقت رکھی ہی نہیں، اِس لیے قرآن کہتا ہے:

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (التحریم:٦)

"اللہ کے کسی حکم میں نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا اُنہیں حکم دیا جاتا ہے۔"

ناری وہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ناریعنی آگ سے پیدا فرمایا، جیسے جنات و شیاطین، اُن میں برائی اور نافرمانی کا مادہ غالب ہے، اِس لیے اکثر وبیشتر وہ برائی اور نافرمانی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اِن دونوں کے بالمقابل خاکی وہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خاک یعنی مٹی سے پیدا فرمایا، جیسے تمام بنی نوعِ انسان، ارشادِ باری ہے:

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَ خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (الرحمٰن:١٤-١٥)

"اُسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا، اور جنات کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔" پھر اُن میں اللہ تعالیٰ نے برائی و بھلائی اور بدکاری و پرہیزگاری دونوں طرح کی صلاحیتیں رکھی ہیں، قرآن کہتا ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا﴾ (الشمس:٨) اور اِتنا ہی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ نے کتاب اللہ اور رجال اللہ کے ذریعہ نیکی وبدی کے راستے بھی دِکھا دیے، فرمایا: ﴿وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد:١٠) ہم نے اُسے دونوں راستے بتا دیے، تاکہ یہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرسکے، اب جو خوش نصیب وسعید برائی وبدکاری والا راستہ چھوڑ کر بھلائی وپرہیزگاری والا طریقہ اختیار کرے گا، یا گمراہ اور گناہ ہوجانے کے بعد توبہ واصلاح کرلے گا، تو یقیناً وہ افضل الخلائق اور ﴿كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ﴾ (بنی اسرائیل:٧٠) کا مستحق بن جائے گا، اس کے بغیر کوئی بھی انسان فضیلت اور کرامت کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوا کہ انسان کی فضیلت کا اصل مدار تقویٰ، یا توبہ اور اصلاح پر ہے۔ بقولِ شاعر:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

بیعتِ طریقت کی حقیقت، اِفادیت اور حکم:

توبہ، اپنی اصلاح اور حصولِ تقویٰ کا اِس دور میں بہت ہی آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی کسی کامل شیخِ طریقت سے بیعت ہو جائے؛ کیوں کہ بیعتِ طریقت میں ایک طرح کا معاہدہ اور وعدہ کیا جاتا ہے، جب کوئی شخص کسی کامل شیخِ طریقت سے بیعت ہوتا ہے، تو سب سے پہلے اُسے گناہوں سے توبہ کرائی جاتی ہے، پھر اُس سے ایمان واعمال پر استقامت اور اپنی اصلاح کی کوشش کا وعدہ لیا جاتا ہے، یہی بیعتِ طریقت کی حقیقت ہے ۔

اُس کی اِفادیت یہ ہے کہ جو شخص بھی اِس معاہدہ اور وعدہ کو نبھاتا ہے اُسے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ بیعت کے وقت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گناہوں سے جو سچی توبہ کی ہے اُس کی برکت سے ان شاء اللہ پچھلی زندگی کے تمام (وہ گناہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور صرف توبہ کر لینا ہی کافی ہے، وہ سب) گناہ معاف ہو جائیں گے، حدیثِ پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ." (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص:۲۰۶)

گناہوں سے سچی توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں، اِس لیے کہ توبہ کرنے والے کے لیے اللہ پاک نے معافی اور مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے، اِرشاد ہے:
﴿وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ﴾

ویسے گناہوں سے سچی توبہ تو ایک شخص اپنے طور پر تنہائی میں بھی کر سکتا ہے، لیکن بیعت کے وقت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر توبہ کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح توبہ کرنا سنت ہے، جیسا کہ حدیثِ مذکور سے اِشارہ ملتا ہے۔ (۲) پھر اِس طرح بیعت کرنے والا اپنے شیخ کو اپنی توبہ کا گواہ بناتا ہے، اور اُن سے دعا وتوجہ کا طالب ہوتا ہے، اِس لیے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے تھے کہ "مرید توبہ کرتا ہے اور مراد (شیخ) کو اُس

پر گواہ بناتا ہے۔" (سلوک واحسان/ص:۲۴۹) جس کی برکت سے طالب کے لیے عموماً اپنی اصلاح کرنا آسان ہو جاتا ہے، بلکہ مزید اُس پر استقامت نصیب ہوتی ہے، اور بیعتِ طریقت کا اصل مقصد اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح، پھر اُس پر استقامت ہی تو ہے، اِسی لیے ہمارے علماء اور مشائخ اُس کی ترغیب دیتے ہیں۔

صاحبو! انسان کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ اپنی اصلاح کی کوشش کرے، اپنی اصلاح کرنا ہر ایک کے ذمہ فرض ہے، رہی بات بیعت کی، تو وہ اگرچہ فرض نہیں، سنت ہے، لیکن یہ ایسی مبارک سنت ہے کہ اُس سے فرائض زندہ ہوتے ہیں، نیز توفیق اصلاح و استقامت نصیب ہوتی ہے۔

بیعت کی قسمیں:

پھر یہ کوئی نیا طریقہ بھی نہیں، بلکہ رحمتِ عالم ﷺ کے زمانہ میں جن مختلف قسم کی بیعت کا تذکرہ ملتا ہے اُن میں یہ بیعت بھی پائی جاتی ہے، علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ دورِ نبوی میں بنیادی طور پر چار قسم کی بیعت ہوا کرتی تھی، جن کی مختصر تشریح حسبِ ذیل ہے:

(۱)......بیعت علی الاسلام: جب کوئی شخص مسلمان ہونا چاہتا تو حضور ﷺ اُس سے بیعت لیتے تھے۔ حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے اپنی کتاب "حیاۃ الصحابہ" میں متعدد رِوایات اِس مضمون کی جمع فرمائی ہیں، مثلاً ایک روایت میں حضرت اسودؓ فرماتے ہیں کہ "فتح مکہ کے دِن ہم نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ قرنِ مصقلہ مقام کے پاس بیٹھ کر لوگوں کو اسلام اور (کلمۂ) شہادت پر بیعت کر رہے ہیں۔" اور بیہقی میں ہے کہ چھوٹے، بڑے، مرد وعورت تمام لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے، اور آپ ﷺ نے اُن کو اسلام اور شہادت پر بیعت فرمایا۔ (حیاۃ الصحابہ :۱/۳۱۱) یہ بیعت علی الاسلام کہلاتی ہے، جو گویا آپ ﷺ کے منصبِ نبوت کا مظہر تھی۔

(۲)......بیعت علی الھجرۃ: جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابتداءِ اسلام میں جب

مسلمانوں کے لیے حالات بہت تنگ ہوگئے تب اللہ کے حکم سے حضور ﷺ اور صحابہؓ نے مکہ مکرّمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اُس وقت مکہ مکرّمہ کے تمام مسلمانوں پر ہجرت فرضِ عین تھی، (الاّ یہ کہ کوئی واقعی مجبور ہو تو وہ مستثنیٰ تھا) یہ حکم فتحِ مکہ تک باقی رہا، بعد میں ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی، اِس سے قبل آپ ﷺ حضراتِ صحابہؓ سے ہجرت پر بھی بیعت لیتے تھے، جیسا کہ مختلف احادیث میں اُس کا تذکرہ ملتا ہے، منجملہ اُن میں سے ایک حدیث یہ ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: أَقْبَلَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: أُبَايِعُكَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ، أَبْتَغِي الْأَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالىٰ، قَالَ: فَهَلْ لَكَ مِنْ وَالِدَيْكَ أَحَدٌ حَيٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ؛ بَلْ كِلَاهُمَا، قَالَ: فَتَبْتَغِي الْأَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالىٰ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَارْجِعْ إِلىٰ وَالِدَيْكَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا. (مسلم: ۳۱۳/۲، کتاب السیر)

ترجمہ: ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر اجرِ آخرت کے لیے بیعت کرنا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ جی ہاں، دونوں زندہ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر تو بس، اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

اِس موقع پر ہمارے حضراتِ علماءِ محدثین فرماتے ہیں کہ اِس صحابیؓ کا واقعہ اُس وقت کا ہے جب مکہ فتح ہوکر ہجرت کا حکم ختم ہو چکا تھا، یا یہ صحابیؓ مکہ مکرّمہ کے علاوہ کسی اور علاقہ کے تھے، نیز یہ صحابیؓ جس وقت حضور ﷺ سے ہجرت کے ساتھ جہاد کی بیعت کرنا چاہتے تھے اُس وقت جہاد فرضِ عین نہ تھا، بلکہ فرضِ کفایہ تھا۔

دو صورتوں میں جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے: (۱) ایک یہ کہ دشمن نے کسی مسلمان بستی پر حملہ کردیا تو تمام مسلمانوں پر اُس کا مقابلہ کرنا فرضِ عین ہے، حتیٰ کہ اگر مرد کافی نہ ہوں تو عورتیں بھی شریکِ جہاد ہوں، ایسی صورت میں وہ اپنے شوہروں سے اِجازت کی بھی پابند

نہیں، اور اگر اُس بستی کے مرد وعورت کافی نہ ہوں تو قریب ترین بستی کے لوگوں پر بھی جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے۔ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی موقع پر مسلمانوں کا امیر یا حاکم جہاد کا اعلان کردے تو اُس وقت بھی لوگوں پر جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے، جیسے غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور ﷺ نے کیا۔ الغرض جس وقت وہ صحابیؓ جہاد کی اجازت چاہ رہے تھے اُس وقت جہاد فرضِ عین نہ تھا، اِسی لیے حضور ﷺ نے اُنہیں والدین کی خدمت وحسنِ سلوک کا حکم دیا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ جب جہاد فرضِ عین نہ ہو تو والدین کی خدمت جہاد وہجرت سے افضل ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضور ﷺ حضرات صحابہؓ سے ہجرت اور جہاد پر بھی بیعت فرماتے تھے۔

(۳)......بیعت علی الجہاد: یہ تیسری قسم کی بیعت تھی، جو بعض خصوصی حالات میں حضور ﷺ صحابہؓ سے لیا کرتے تھے، منجملہ اُن میں سے ایک ۶ھ کا صلح حدیبیہ کا موقع ہے، جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال آپ ﷺ نے یہ خواب دیکھا کہ آپ ﷺ مع اصحاب مسجدِ حرام میں داخل ہورہے ہیں، تو وہاں کی یادیں اور باتیں تازہ ہو گئیں، آپ ﷺ نے عمرہ کا اِرادہ فرمالیا، پھر چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لیے مکہ مکرّمہ روانہ ہوئے، جب آپ ﷺ مکہ کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دینے کا اِرادہ کرکے ایک بڑا لشکر تیار کرلیا ہے، اُس وقت آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا، (یہ جگہ آج کل شمیسی کہلاتی ہے) وہاں سے آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ایلچی بنا کر مذاکرہ کے لیے مکہ کے سرداروں کے پاس بھیجا، تاکہ وہ اُنہیں بتائیں کہ ہم جنگ کے لیے نہیں، بلکہ محض عمرہ کے لیے آئے ہیں، حضرت عثمانؓ مکہ گئے تو وہاں کے سرداروں نے اُنہیں روک لیا، جس کی وجہ سے یہ افواہ پھیل گئی کہ آپؓ شہید کردیے گئے، اب بظاہر جنگ کی فضا بن گئی تھی، اس لیے حضور ﷺ نے ببول کے ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے یہ بیعت لی کہ اگر کفار حملہ آور ہوئے تو ہم بھاگیں گے نہیں، بلکہ جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے، حتیٰ کہ اپنی جانوں کی قربانی بھی پیش کر

دیں گے، حضراتِ صحابہؓ نے پورے عزم واخلاص کے ساتھ بیعت کی، حضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بھی غائبانہ طور پر اُس میں شامل فرمایا، (اِسی سے ہمارے مشائخ نے غائبانہ بیعت کے ثبوت پر استدلال فرمایا ہے، اور جب غائبانہ طور پر بیعت جائز ہے تو خط وکتابت اور فون وغیرہ کے ذریعہ بیعت کرنا تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہے) بعد میں معلوم ہوا کہ شہادتِ عثمانؓ والی خبر غلط تھی، اور پھر صلح کا معاملہ پیش آیا، لیکن اِس بیعت کو اللہ تعالیٰ نے اِتنا پسند فرمایا کہ ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (الفتح / ۱۰)

پیارے! جو تمہارے دُلارے تم سے بیعت کر رہے ہیں، درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے، اِسی کے ساتھ اُن کو رضا کا پروانہ بھی عطا فرمایا:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (الفتح : ۱۸)

یقیناً اللہ اُن مومنین سے بڑا خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اور اُن کے دِلوں میں جو کچھ (عزم واخلاص) تھا وہ بھی اللہ کو معلوم تھا۔ یہ بیعت علی الجہاد کہلاتی ہے، جس کا اظہار غزوۂ خندق کے موقع پر حضراتِ صحابہؓ نے اِن الفاظ میں کیا:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا ☆ عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

ترجمہ: ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور ﷺ سے اِس بات پر بیعت کی کہ جب تک ہم زندہ رہیں گے جہاد کرتے رہیں گے۔

(۴)...... بیعت علی الاعمال: اِس کے علاوہ آپ ﷺ نے اُمت کی تعلیم وتربیت کے لیے اُمت کے سب سے بہترین طبقہ یعنی حضراتِ صحابہؓ وصحابیاتؓ سے مخصوص اعمال کی پابندی اور اجتناب عن المعاصی کی بیعت لی ہے، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں اِس کا

تذکرہ ہے، علاوہ ازیں جب صحابیاتؓ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں بغرضِ بیعت حاضر ہوئیں تو اِرشاد ہوا:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الممتحنة / ۱۲)

ترجمہ: محبوبم! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں اِس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں کریں گی، اور چوری نہیں کریں گی، اور زنا نہیں کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور نہ کوئی ایسا بہتان باندھیں گی جو اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیا ہو، اور نہ کسی بھلے کام میں تمہاری نافرمانی کریں گی، تو تم اُن کو بیعت کرلیا کرو، اور اُن کے حق میں اللہ سے مغفرت کی دعا کیا کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

بیعتِ طریقت کے بغیر شیخ طریقت بننا آسان نہیں:

یہ وہی بیعت ہے جسے آج بیعتِ طریقت کہا جاتا ہے، اِس لیے کہ اپنے مرشد کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے اُس میں توبہ کے بعد اِسی بات کا گویا عہد ومعاہدہ ہوتا ہے کہ ہم شریعت کے فرائض واحکام بجالائیں گے، اور گناہوں سے اجتناب کی کوشش کریں گے، اور پوری زندگی آپ کی تعلیم فرمودہ شرعی ہدایات کے مطابق گذاریں گے، تو اِس طرح بیعت کرنے سے توبہ، اصلاح اور حصولِ تقویٰ میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے، بشرطیکہ مرید اپنے شیخ کی ہدایاتِ شرعیہ پر گامزن ہو، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ فرماتے تھے کہ ''شیخ کو سراپا زبان اور مرید کو سراپا کان ہوجانا چاہیے۔'' (شیخ کا کام ہدایات دینا تو مرید کا کام اُن کو سن کر عمل کرنا) (سلوک واحسان/ص:۲۶۴)

پھر چوں کہ یہ مرد و زن سب کی ضرورت ہے اِس لیے حضور ﷺ نے جہاں حضراتِ صحابہؓ سے مخصوص اعمالِ اسلام کی پابندی اور معاصی سے اجتناب پر بیعت لی وہیں حضراتِ صحابیاتؓ سے بھی آپ ﷺ نے بیعت فرمائی، البتہ رحمتِ عالم ﷺ کی عادتِ شریفہ اِس سلسلہ میں سیدہ عائشہؓ کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ آپ ﷺ عورتوں کو پردے میں بغیر ہاتھ مس کیے بیعت فرماتے تھے، حدیثِ پاک میں مروی ہے:

”وَاللّٰهِ، مَا مَسَّتْ یَدُهٗ یَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ فِی الْمُبَایَعَةِ.“ (متفق علیه، مشکوٰة/۳۵۴، باب الصلح)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بیعتِ طریقت کا مقصد صرف اور صرف توبہ اور اصلاح ہے، اور یہ سب کی ضرورت ہے، اِس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بیعتِ طریقت کے بغیر کسی شخص کے لیے بھی شیخ طریقت بننا آسان نہیں، بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ: ”ولی تو ہر شخص بن سکتا ہے کہ اُس کا معاملہ اپنی ذات کی اصلاح تک ہوتا ہے، لیکن شیخ ہر کوئی نہیں بن سکتا کہ اُس کا معاملہ اپنی ذات کے علاوہ مریدوں کے ساتھ بھی متعلق ہوتا ہے۔“ (سلوک و احسان/ ۲۹۷)

اِس لیے شیخ طریقت بننے سے پہلے بیعتِ طریقت ضروری ہے۔ اور اِس دورِ فتن میں جو بھی کسی کامل شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرلے گا عجب نہیں کہ وہ ”مَنْ دَخَلَهٗ کَانَ آمِنًا“ کا مصداق بن جائے۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں، تو خزاں کے دِن بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آگیا، تو چراغ راہ کے جل گئے

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ”جس کا کوئی رہبر نہ ہو تو اُس کا رہبر شیطان بن جاتا ہے۔“ (سلوک و احسان/ص: ۳۳۹)

بیعت کس سے ہونا چاہیے؟

لہٰذا شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ رہنے کے لیے کسی رہبرِ کامل سے بیعت ہو جانا ہی عافیت کا راستہ ہے، قرآنِ کریم میں جو حکم ہے: ﴿وَابْتَغُوْا إِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ﴾ (المائدة: ۳۵)

تو اُس کے متعلق جلالین میں ہے کہ: ”مَا یُقَرِّبُکُمْ إِلَیْهِ مِنْ طَاعَتِهٖ“ (جلالین/ص: ۹۹) ہر وہ طاعت جو تمہیں اللہ کا مقرب بنادے۔ اب غور کیجئے کہ مرشد بھی اپنے مرید کے لیے اصلاح اور قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے، اِس لیے بعض علماء نے فرمایا کہ ”الْوَسِیْلَةَ“ سے مرشد مراد ہے۔ مرشدِ عالم حضرت خواجہ غلام حبیب صاحبؒ فرماتے تھے کہ ”آسمان سے بارش کون برساتا ہے؟ اللہ، مگر بادل وسیلہ بن جاتا ہے، اولاد کون دیتا ہے؟ اللہ، مگر والدین وسیلہ بن جاتے ہیں، اِسی طرح (توبہ و اصلاح کا اِرادہ اور) دِل میں انوارات کون ڈالتا ہے؟ اللہ، مگر پیر و مرشد اُس کا وسیلہ بن جاتا ہے۔“ (تصوّف و سلوک/ص: ۳۶)

لہٰذا کسی شیخ طریقت سے بیعتِ اصلاح کا تعلق قائم کرنا چاہیے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ ”جس میں پانچ باتیں پائی جائیں اس سے بیعت ہونا درست ہے: (۱) کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا علم رکھتا ہو، خواہ کسی شیخ کامل یا عالم کی صحبت میں رہ کر اس سے سن کر یاد کرلیا ہو۔ (۲) عدالت اور تقویٰ سے متصف ہو، اور کم از کم کبائر و صغائر پر اصرار سے باز رہتا ہو۔ (۳) دنیا سے بے رغبت رہ کر آخرت کی رغبت رکھتا ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ طاعتِ مؤکدہ اور صحیح احادیث میں وارد اذکار کا پابند ہو۔ (۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اپنی بساط کے مطابق اہتمام کرتا ہو۔ (۵) مشائخ کی خدمت میں رہ کر اور راہِ سلوک سیکھ کر اجازت بھی حاصل کرلی ہو۔

(فتاویٰ عزیزیہ: ۲/۱۰۲، از: محمود الفتاویٰ: ۴/۱۷۳)

حق تعالیٰ ہمیں شیخِ کامل کی صحبت و تعلق نصیب فرما کر ہمیں اپنا تعلق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

یکم رمضان المبارک/ ۱۴۳۵ھ/ بروز: دوشنبہ
مطابق: ۳۰/ جون/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَهُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۳)

اتباعِ سنت کی فضیلت اورترکِ سنت کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ سَعِیۡدِ الۡخُدۡرِيِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنۡ أَکَلَ طَیِّبًا وَ عَمِلَ فِیۡ سُنَّۃٍ، وَ أَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَہٗ، دَخَلَ الۡجَنَّۃَ، فَقَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ! إِنَّ ھٰذَا الۡیَوۡمَ لَکَثِیۡرٌ فِیۡ النَّاسِ، قَالَ: وَ سَیَکُوۡنُ فِیۡ قُرُوۡنٍ بَعۡدِیۡ." (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۳۰/کتاب الایمان/باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں: رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال رزق کمایا، اور سنت کے مطابق (زندگی کے ہر معاملہ میں) عمل کیا، اور اُس کی زیادتیوں سے بھی لوگ محفوظ و مامون رہے تو وہ شخص جنت میں داخل ہوگا، ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے لوگ تو آج کل بہت ہیں، (تو کیا ہمارے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ (خواہ اُن کی

تعداد میں کمی آجائے، مگر ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوں گے، کلی طور پر معدوم نہیں ہو جائیں گے)۔

سنت کی تعریف مع اقسام:

اللہ رب العزت کی جانب سے عطا کردہ زندگی کا عطیہ نہایت ہی قیمتی ہے، اُس کی قدر یہی ہے کہ ہم اِس زندگی کو صحیح طریقہ کے مطابق گذاریں، اور زندگی گذارنے کا وہ طریقہ جو حضور ﷺ کا ہے اُس سے زیادہ صحیح، نفع بخش، پیارا اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور طریقہ نہ کوئی ہے اور نہ ہوسکتا ہے، اور حضور ﷺ کے طریقے کو سنت کہتے ہیں، اِسی لیے شریعت میں سنت کی بہت ہی زیادہ اہمیت آئی ہے؛ کیوں کہ سنت کے لغوی معنیٰ ہیں: ’’طریقہ‘‘، اور جب سنت کی نسبت احکامِ شریعت کی طرف ہو تو اُس کے معنیٰ ہوں گے واجب سے کم درجہ کے اعمال واحکام، لیکن جب اُس کی نسبت صاحبِ شریعت (ﷺ) کی طرف کی جائے تو اُس کا عام مطلب ہوتا ہے رحمتِ عالم ﷺ کا طریقہ، یعنی سرکارِ دو عالم ﷺ کے وہ مختلف اعمال واقوال اور اخلاق واحوال جو (قابلِ عمل) احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، خواہ اُن کا تعلق طبعی وبشری اُمور سے ہو یا شرعی ودینی اُمور سے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ نبوی طریقہ جو آپ ﷺ نے بطورِ عادت اختیار فرمایا ہو یا بطورِ عبادت، پھر عادت وعبادت میں بھی اُس نبوی طریقہ کا درجہ فرض کا ہو یا واجب کا، سنتِ مؤکدہ کا ہو یا غیر مؤکدہ کا، سب کے سب سنت کے اصطلاحی مفہوم میں داخل ہیں، مثلاً ایمان لانا تو فرض ہے، جس کے بغیر کوئی عمل اللہ کے یہاں قبول نہیں، لیکن ایمان لانا اِس اعتبار سے سنت بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ کا طریقہ ہے، اِسی طرح ہر مسلمان مرد وزن پر روزانہ دِن رات میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنا تو فرض ہے، لیکن یہ اِس اعتبار سے سنت بھی ہے کہ حضور ﷺ کا طریقہ ہے، اِسی طرح رمضان کے روزے، صاحبِ نصاب پر سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ، اور صاحبِ استطاعت پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا وغیرہ اگرچہ فرائض ہیں، لیکن اِس اعتبار سے کہ اِن تمام اُمور واحکام پر

حضور ﷺ نے عمل کیا، لہٰذا سنت بھی ہیں، اِسی طرح ایک مشت داڑھی رکھنا یوں تو واجب ہے، لیکن حضور ﷺ کا دائمی طریقہ ہونے کے سبب سنت بھی ہے، نیز نماز، تراویح، فجر وظہر سے قبل اور ظہر، مغرب اور عشاء کے بعد کی سنتیں یوں تو مؤکدہ ہیں، لیکن حضور ﷺ کا طریقہ ہونے کے سبب سنت بھی ہیں، اِسی طرح عصر وعشاء سے قبل کی سنتیں غیر مؤکدہ ہیں، لیکن یہ سب حضور ﷺ کا طریقۂ عبادت ہونے کے سبب سنت ہیں، اس کے علاوہ حضور ﷺ کا وہ طریقہ جو آپ ﷺ نے بطورِ عادت اختیار کیا مثلاً کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے، سونے اور جاگنے وغیرہ میں آپ ﷺ کا جو طریقہ ہے اُس پر عمل کرنا اگرچہ فرض وواجب تو نہیں، بلکہ مستحب ہے، لیکن یہ سب بھی آپ ﷺ کی مقدس عادات ہونے کے سبب سنت اور اُس پر عمل کرنا علامتِ محبت ہے، اور سنت کی یہ قسم سنن زوائد کہلاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سنت حضور ﷺ کے طریقۂ زندگی کو کہتے ہیں۔

سنت کی حفاظت کا من جانب اللہ انتظام کیا گیا:

یوں تو اللہ رب العزت نے از حضرت آدمؑ تا رحمتِ عالم ﷺ تمام انبیاء ورُسل کو اِسی لیے مبعوث فرمایا تاکہ لوگ اُن کے طریقہ وطرزِ عمل اور نقشِ قدم کے مطابق زندگی گذاریں، فرمایا:

﴿وَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء/٦٤)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول اِس کے سوا کسی اور مقصد کے لیے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اِطاعت کی جائے۔

اِس اعتبار سے حضور ﷺ کی بعثت ورسالت بھی اِطاعت (اور اتباعِ سنت) ہی کے لیے ہے، اور چوں کہ آپ ﷺ کا طریقۂ زندگی اللہ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے اِسی لیے من جانب اللہ یہ انتظام کیا گیا کہ آپ ﷺ کے اقوال وافعال، اخلاق واحوال، لیل ونہار، رفتار وگفتار، طریقۂ بندگی وطرزِ زندگی، طریقِ معاشرت ومعیشت، بلکہ ہر ہر ادا و

کیفیت کو بعینہٖ اُسی طرح محفوظ کیا گیا جس طرح آپ ﷺ سے سرزد ہوئے، حتیٰ کہ احادیثِ مبارکہ میں یہ بھی محفوظ ہے کہ کس اِرشاد کے وقت آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر کیا تاثرات تھے، جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنِّيْ لَأَعْلَمُ آخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوْجًا مِنْهَا، وَ آخِرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلًا، رَجُلٌ يَّخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبْوًا، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ: اِذْهَبْ، فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَيَأْتِيْهَا، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا مَلْأَىٰ، فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ! وَجَدْتُهَا مَلْأَىٰ، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ: اِذْهَبْ، فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَ عَشَرَةَ أَمْثَالِهَا، فَيَقُوْلُ: أَ تَسْخَرُ مِنِّيْ وَ أَنْتَ الْمَلِكُ"، فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَحِكَ، حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ. (وَ كَانَ يُقَالُ: ذٰلِكَ أَدْنٰى أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً)

ترجمہ: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اُس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے اخیر میں دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل ہوگا، یہ ایک ایسا شخص ہوگا جو گھٹنوں کے بل چل کر دوزخ سے باہر آئے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس سے فرمائیں گے کہ "جاؤ، جنت میں داخل ہوجاؤ" وہ شخص وہاں پہنچ کر خیال کرے گا کہ جنت تو بھر چکی ہے، لہٰذا وہ عرض کرے گا کہ "اے میرے رب! میں نے تو جنت کو بھرا ہوا پایا" اللہ پاک فرمائیں گے کہ "جاؤ، جنت میں داخل ہوجاؤ! تمہارے لیے دنیا اور اُس سے دس گنی بڑی جنت ہے" وہ کہے گا: "اے میرے رب! آپ مجھ سے مذاق اور ہنسی کر رہے ہیں، حالاں کہ آپ تو شہنشاہ (بادشاہوں کے بادشاہ) ہیں" راویٔ حدیث حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "اُس موقع پر میں نے حضور ﷺ کو اِس قدر ہنستے ہوئے دیکھا کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔" (کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جنت والوں میں سب سے کم درجہ کا ہوگا۔) (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:۴۹۲/ باب الحوض والساعۃ) (حدیثِ قدسی نمبر:۲)

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی ایک ایک سنت بلکہ ایک ایک ادا وکیفیت کی حفاظت کا من جانب اللہ انتظام کیا گیا، تاکہ ساری انسانیت اُس پر عمل کرکے راہ یاب وکامیاب ہوجائے۔

اتباعِ سنت کے اُخروی ثمرات:

کسی بھی انسان کے لیے اِس سے بڑی اور کیا سعادت ہوگی کہ اُسے اتباعِ سنت (نبوی طریقہ کی پیروی) کی توفیق مل جائے؛ کیوں کہ اتباعِ سنت کے نتیجہ میں انسان کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے یہاں محبوبیت کا مقام ملتا ہے، متبع سنت اتباعِ سنت کے نتیجہ میں اللہ کی محبت اور رحمت و مغفرت کا مستحق بن جاتا ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (آل عمران/۳۱)

ترجمہ: (محبوبم!) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے رب سے محبت کرنا چاہتا ہے تو یہ اُس کی سعادت ہے، اور ہر محبت کرنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ خود بھی مجھ سے محبت کرے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندو! اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو اور میری محبت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے آخری رسول ﷺ کی پیروی کرلو، چوں کہ محبت تو ایک مخفی چیز ہے، کس کو کس سے محبت ہے؟ اور کم ہے یا زیادہ؟ اُس کا اندازہ تو علامات اور حالات و معاملات ہی سے لگایا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر کسی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہے تو اُس کی علامت یہی ہے کہ اُس کی زندگی کے تمام حالات و معاملات میں اتباعِ سنت کی جھلک نظر آئے، اور جب واقعہ یہی ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اِس اتباعِ سنت کے نتیجہ میں تمہیں میری محبت بھی حاصل ہوگی، اور تم میری مغفرت بلکہ جنت کے مستحق بن جاؤ گے۔

چناں چہ حدیثِ پاک میں ہے کہ حضرت ثوبانؓ جو حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اُنہیں حضور ﷺ سے اِس قدر محبت تھی کہ آپ ﷺ کی زیارت کے بغیر صبر نہیں کر سکتے

تھے، ایک دِن حاضرِ خدمت ہوئے تو چہرہ پر رنج و غم کا اثر تھا، حضور ﷺ کے دریافت کرنے پر عرض کیا: یا رسول اللہ! نہ مجھے کوئی مرض ہے نہ تکلیف، صرف اِتنی بات ہے کہ مجھے آپ کی زیارت اور ملاقات کے بغیر چین نہیں آتا، آج ایک خیال دِل میں آیا جس نے مجھے بہت ہی زیادہ بے چین کر دیا، وہ یہ کہ دنیا میں جب آپ کی زیارت اور ملاقات کرنی ہوتی ہے تو ہم الحمدللہ بآسانی کر لیتے ہیں، لیکن جنت میں آپ کے درجات بہت ہی اعلیٰ ہوں گے، اگر میں اللہ کے فضل سے جنت میں داخل ہو بھی گیا تو آپ کے درجہ سے بہت نیچے ہوں گا، اور جس جنت میں آپ کی زیارت نہ ہو وہ جنت بھی کس کام کی! اُس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ وَ مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِينَ وَ حَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴾ (النساء: ۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی اِطاعت کریں گے، تو وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام نازل فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔ (معالم التنزیل: ۱/ ۴۵۰، از تفسیر انوار البیان: ۱/ ۶۴۷)

معلوم ہوا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اِطاعت، اتباع اور فرماں برداری کا انعام جنت اور اُس میں نبیوں اور نیک لوگوں کی معیت ہے، اور حضور ﷺ کی اِطاعت و اتباع کا یہی سب سے بڑا فائدہ ہے، اِسی کو مذکورہ حدیث میں فرمایا کہ جس نے تین اُمور کا اہتمام کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگیا: (۱) اکل حلال (۲) اتباعِ سنت (۳) اجتنابِ اذیّت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتباعِ سنت کے بغیر نہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل ہو سکتی ہے، نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و جنت کا استحقاق حاصل ہوسکتا ہے، اِسی لیے کسی اللہ والے نے کہا ہے:

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے ☆ اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے
سنتِ نبوی سے لو جو لگائے گا ☆ ایمان کی حلاوت وہ دِل میں پائے گا

نیز کسی نے کہا ہے:

مسلکِ سنت پہ اے سالک! چلا جا بے دھڑک — جنت الفردوس کو سیدھی گئی ہے یہ سڑک

اتباعِ سنت کے دنیوی ثمرات:

پھر یہ تو اتباعِ سنت کے اُخروی ثمرات ہیں، لیکن اُس کے دنیوی ثمرات بھی بے شمار ہیں، حتیٰ کہ علماء نے اِس پر کتابیں لکھی ہیں کہ فلاں سنت پر عمل کرنے کا یہ نقد دنیوی نتیجہ اور ثمرہ ہے، مثلاً مسواک حضور ﷺ کی ایک سنت ہے، لیکن اُس کے متعدد فوائد وثمرات ہیں، منجملہ اُن میں سے ایک یہ کہ اس سے دانت، مسوڑھے اور مُنہ کی مختلف بیماریوں سے حفاظت ہوتی ہے، گرونانک کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ مسواک کا استعمال کیا کرتے اور فرماتے تھے کہ ’’یا یہ لکڑی لے لو، یا بیماری لے لو۔‘‘ (سنتِ نبوی اور جدید سائنس:۱/۱۴)

کھانا جسم کی ضرورت ہے، سبھی کھاتے ہیں، لیکن یہی کھانا اگر سنت طریقے کے مطابق کھایا جائے تو صحت کے لیے بھی بہت مفید ہے؛ کیوں کہ ماہرینِ طب اِس بات پر متفق ہیں کہ اَسّی فی صد امراض صرف اور صرف کھانے کی وجہ سے ہوتے ہیں، اُن سے حفاظت کا طریقہ یہی ہے کہ کھانے سے متعلق حضور ﷺ کا اُسوہ اور طریقہ اختیار کیا جائے، یقیناً اِس سے ساری انسانیت کو نفع ہوگا، ورنہ اگر کسی ایک سنت کو بھی چھوڑ دیا گیا تو ضرور نقصان ہوگا، چنانچہ کھانے کی سنتوں میں سے یہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لیے جائیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ کھانے سے قبل و بعد میں ہاتھ دھونا (سنت ہونے کے سبب) وسعتِ رزق کا باعث ہے، کہ اُس میں شیطان کی مخالفت ہے۔ (کنز العمال:۱۹/۱۸۶، از شمائلِ کبریٰ:۱/۶۶)

اب بظاہر تو یہ عمل معمولی معلوم ہوتا ہے، لیکن اُسے بھی نظر انداز کرنا بعض اوقات بڑے بھاری نقصان کا سبب بن جاتا ہے، جیسے ایک ٹرک ڈرائیور نے کھانے کے لیے ایک ہوٹل کے قریب اپنا ٹرک کھڑا کیا، کھانے سے قبل اُس نے ٹرک کے ٹائر کی جانچ کی اور پھر کھانا کھایا، اتفاق سے کھانا کھاتے ہی وہ مرگیا، حالاں کہ اُسی ہوٹل سے اور لوگوں نے بھی

کھایا اور اُنہیں کچھ نہ ہوا، بہت تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مرحوم نے کھانے سے قبل ٹائر کی جانچ کرنے کے لیے اُن پر ہاتھ پھیرا تھا، وہاں ایک زہریلا سانپ کچلا ہوا تھا، جس کا تازہ زہر ٹائر پر لگا ہوا تھا، اور وہی زہر ہاتھوں پر لگ گیا، اور ہاتھ نہ دھونے کے نتیجہ میں زہر کھانے میں شامل ہوکر اُس کی موت کا سبب بن گیا۔ (سنتِ نبوی اور جدید سائنس:۱/۸۹)

صاحبو! آج میڈیکل سائنس تو اِتنی گہری ریسرچ اور تحقیق کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ واقعی اتباعِ سنت ایک نہایت نفع بخش چیز ہے، لیکن ہمیں تو یہ بات بہت پہلے قرآن و حدیث میں بتا دی گئی کہ تمہاری سعادت اور دارین کی ترقی و کامیابی کا سبب اتباعِ سنت ہی ہے، اِرشادِ ربانی ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (الأحزاب/۷۱)

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی اِطاعت کرے اُس نے زبردست کامیابی حاصل کی۔

معلوم ہوا کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اِطاعت واتباع فوز وفلاح کا ذریعہ ہے، اُس کے بغیر حقیقی ودائمی کامیابی ممکن نہیں ہے۔

صحابۂ کرامؓ میں اتباعِ سنت کا اہتمام:

اور حضراتِ صحابہؓ وصلحاء کی ترقی وکامیابی کا یہی تو راز ہے کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو سنت کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھال لیا تھا، اُنہوں نے صرف عبادات ہی میں اتباعِ سنت کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ عبادات کے علاوہ معاملات، اخلاقیات حتیٰ کہ ہر ہر معاملہ اور موقع میں وہ یہ دیکھتے تھے کہ اس میں حضور ﷺ کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر اُسی کے مطابق وہ عمل کرتے تھے، ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، مثلاً حضرت زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا کہ آپؓ کھلے بٹن نماز پڑھ رہے تھے، تو میں نے اس کا سبب پوچھا، آپؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو اِسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ (الترغیب

:۱/۱۸۲)

اِسی طرح حضرت عُروہؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے مجھ سے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ کے کُرتے کا بٹن کھلا تھا، اِس پر حضرت عروہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو گرمی وسردی ہر موسم میں کھلے بٹن دیکھا۔ (الترغیب:۱/۸۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق منقول ہے کہ آپؓ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقامِ شجرہ میں قیلولہ کرتے اور فرماتے کہ ''حضور ﷺ نے یہاں قیلولہ فرمایا ہے۔'' (اس لیے میں بھی یہاں آ کر قیلولہ کرتا ہوں) (مستفاد از شمائل کبریٰ:۱/۶۰)

اب دیکھئے! کس موقع پر کس وجہ سے حضور ﷺ نے یہ اعمال کیے، اگرچہ اُس کا علم نہیں، لیکن صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ اتباعِ سنت دیکھئے کہ حضور ﷺ نے ایک عمل کیا (جو آپ ﷺ کی خصوصیت نہیں) پھر آپ ﷺ نے اُس عمل کے کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، مگر صحابہؓ ایسے عمل بھی صرف اتباعِ سنت کے جذبہ سے کرتے تھے۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے خود کو اتباعِ سنت کے رنگ میں اِس قدر رنگ دیا تھا کہ آپ ﷺ کو اُنہوں نے جس حال میں دیکھا اُسی حال میں اپنے آپ کو بھی رکھنا پسند کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ باہر سے آنے والے اجنبی کو یہ پوچھنا پڑتا تھا کہ ''مَنْ مِنْکُمْ مُحَمَّدٌ؟'' (تم میں محمد کون ہیں؟) کیوں کہ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، اٹھنے، بیٹھنے، ملنے، جلنے، چلنے، پھرنے غرض ہر چیز میں اتباعِ سنت کی وجہ سے اِس قدر مشابہت ہوا کرتی کہ پہچان مشکل ہو جاتی، اِسی لیے صحابۂ کرامؓ حبِ نبی ﷺ اور عشقِ نبی ﷺ کا اصل معیار ہیں۔ ؎

وہی سمجھا جائے گا شیدائے جمالِ مصطفیٰ ☆ جس کا حال حالِ مصطفیٰ ہو، قال قالِ مصطفیٰ

سنت میں سُستی کی سزا:

اتباعِ سنت کے اِس قدر دینی، دنیوی اور اُخروی فضائل وثمرات کے باوجود اگر کوئی شخص اُس کا اہتمام نہ کرے تو یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے محبت میں کمی اور سعادت سے محرومی کی بات ہے، ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اللہ پاک توفیقِ عبادت ہی سے محروم نہ فرمادیں، اِس لیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ آیتِ کریمہ ﴿ذَالِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ (البقرة:٦١) کے تحت فرماتے ہیں:

''مَنْ تَهَاوَنَ بِالْآدَابِ عُوْقِبَ بِحِرْمَانِ السُّنَّةِ، وَ مَنْ تَهَاوَنَ بِالسُّنَّةِ عُوْقِبَ بِحِرْمَانِ الْفَرَائِضِ، وَ مَنْ تَهَاوَنَ بِالْفَرَائِضِ عُوْقِبَ بِحِرْمَانِ الْمَعْرِفَةِ.'' (تفسير عزيزى:١/٤٧٩)

جو شخص آداب ومستحبات کو معمولی سمجھ کر ترک کر دے گا اُسے بطورِ سزا سنت سے محروم کر دیا جائے گا، اور جو سنت کو معمولی سمجھ کر چھوڑ دے گا اُسے فرائض سے محرومی کی سزا دی جائے گی، اور جو شخص فرائض سے بھی محروم رہا تو وہ معرفتِ الٰہی سے بھی محروم رہے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اس سے معلوم ہوا کہ سنت پر عمل کرنے میں سستی کرنا محرومی اور ایسا مرض ہے جو متعدی ہو کر فرائض تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سنتِ مؤکدہ کا ترک کرنا اگرچہ صغیرہ گناہ ہے، لیکن انجام کار پھر وہ کبیرہ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور کبیرہ گناہ بن جاتا ہے۔

ایک واقعہ:

اِس لیے تارکِ سنت کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سنت سے مُنہ موڑنے والے سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ ناراض ہو کر مُنہ موڑ لیں۔ اِس سلسلہ میں ''اھوال القیامۃ''

میں علامہ زین الدین ابن رجبؒ نے ایک عبرت ناک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ اُن کے پاس ایک ایسا شخص آیا جو کفن چور تھا، مگر اب وہ اُس قبیح حرکت سے باز آچکا تھا اور توبہ کر کے زندگی گذار رہا تھا، علامہ زین الدینؒ نے اُس سے پوچھا کہ ’’تم مسلمانوں کے کفن چراتے رہے ہو اور تم نے مرنے کے بعد اُن کی حالت دیکھی ہے، یہ بتاؤ کہ جب تم نے اُن کے چہرے کھولے تو اُن کا رُخ کس طرف تھا؟‘‘ اُس نے جواب دیا کہ ’’اکثر چہرے قبلہ کے رُخ سے پھرے ہوئے تھے‘‘ حضرت زین الدینؒ کو بڑا تعجب ہوا؛ کیوں کہ دفن کرتے ہوئے تو مسلمان کا چہرہ قبلہ رُخ کیا جاتا ہے، اس لیے آپؒ نے اِس بارے میں اِمام اوزاعیؒ سے دریافت کیا، تو اُنھوں نے پہلے تو تین مرتبہ ’’إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ‘‘ پڑھا، پھر فرمایا کہ ’’یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی میں سنتوں سے مُنہ موڑنے والے تھے۔‘‘

(از حکایتوں کا گلدستہ/ص:۱۹۲، مولانا اسلم شیخوپوریؒ)

﴿لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَعْلَمُوْنَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ﴾

یاد رکھیے! حضور ﷺ کو اللہ کا سچا اور آخری رسول ماننے اور موقع بموقع جوش و عقیدت سے اُس کا اظہار کرنے کے باوجود آپ ﷺ کے طریقوں اور سنتوں سے عملاً مُنہ موڑنا اور غفلت برتنا یہ ایسا رویہ ہے جو یہودِ بے بہبود نے اختیار کیا تھا، اللہ پاک نے اُن کے اِس بُرے طریقے کو بیان کر کے اُس کے نتیجہ میں جو سخت ترین سزا اُن کو دی اُس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَ إِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَعْلَمُوْنَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ﴾ (الصف/۵)

ترجمہ: (اور عبرت پکڑو اُس واقعہ سے) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ’’اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے تکلیف کیوں پہنچاتے ہو؟ جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

قرآن کے اِس بیان کے آخری دو فقروں میں بار بار غور کرنا چاہیے، یہود بے بہبود

نہ صرف یہ کہ اپنے نبی حضرت موسیٰؑ کو نبیٔ برحق جانتے تھے، بلکہ اُن سے تعلق پر فخر بھی کیا کرتے تھے، اِسی بنیاد پر وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَ أَحِبَّاءُهٗ﴾ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہم انتہائی گنہگار بھی ٹھہرے تو بھی چند روز ہی ہم عذاب میں رہیں گے، پھر ہمارے لیے جنت ہی ہے، مگر اِس کے باوجود حضرت موسیٰؑ نے اُن سے فرمایا: ﴿لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ﴾ تم کیوں مجھے ستاتے ہو؟ اِس میں ایک دُکھ بھری داستان پوشیدہ ہے، حضرت موسیٰؑ کا یہ دُکھ بھرا فقرہ اور رقت انگیز شکوہ ایسا نہیں کہ ہم سرسری انداز میں سن کر اور سر جھٹک کر آگے بڑھ جائیں، بلکہ نہایت سنجیدگی سے اُسے سنیں، سمجھیں اور غور کریں کہ کیا آج سنتوں سے اعراض کرنے والوں کی حضور ﷺ کے ساتھ یہی روش تو نہیں ہے؟ حضور ﷺ کو اللہ کا رسولِ برحق جاننے کے باوجود اور اُن کے مبارک طریقوں میں سو فی صد کامیابی کے یقین کے باوجود اُن کی سنتوں سے اعراض اور انحراف کرنے والے کہیں ایسا تو نہیں کہ حضور ﷺ کی روحِ مقدس کو اسی طرح ایذاء پہنچا رہے ہوں جس طرح یہود نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی تھی، بہت ڈرنے کی ضرورت ہے اس بات سے کہ کہیں روحِ محمد ﷺ تڑپ کر سنتوں کو جان جان کر چھوڑنے اور اُس سے مُنہ موڑنے والوں سے یہ نہ کہہ رہی ہو کہ ﴿لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَعْلَمُوْنَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ﴾ تم مجھے کیوں ستاتے ہو؟ جب کہ تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تمہیں سب کا طریقہ اچھا لگا، میرا ہی طریقہ اچھا نہ لگا، ہائے! تم کیسے ہو، میرے طریقے کو اللہ نے پسند فرمایا مگر تم نے پسند نہ کیا؟ اگر تمہیں میرا طریقہ پسند ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم اُسے اپناتے نہیں؟ میری سنتوں کو ترک کیوں کرتے ہو؟ اگر ایسا ہوا تو سوائے شرمندگی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا، اُس وقت کے آنے سے قبل ابھی وقت ہے حضور ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کی قدردانی اور اُن پر عمل کرنے کا، تاکہ ہم راہ یاب و کامیاب ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں متبعِ سنت اور مطیعِ شریعت بنا کر دارین کی سعادت سے نوازیں، آمین۔

۱۹/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۵ھ/ بروز: جمعہ مطابق: ۱۸/ جولائی/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۴)

داڑھی کی اہمیت اور منڈوانے کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "خَالِفُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ، وَفِّرُوا اللِّحٰى، وَاحۡفُوا الشَّوَارِبَ." وَ فِيۡ رِوَايَةٍ: "اَنۡهِكُوا الشَّوَارِبَ وَ اَعۡفُوا اللِّحٰى." (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۳۸۰/باب الترجل/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مشرکین کی مخالفت کرو (اِس طرح کہ وہ لوگ داڑھیاں کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں، تو) تم داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ۔

ایک روایت میں ہے کہ "تم مونچھیں خوب ہلکی کرو اور داڑھیوں کو چھوڑ دو۔"

داڑھی مردانگی کی علامت اور سامانِ زینت:

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت سے دنیا کے تمام ہی مرد وعورت کے درمیان امتیاز اور فرق پیدا کرنے کے لیے ظاہری اور باطنی اعتبار سے کچھ خصوصیات وعلامات ایسی پیدا فرما دیں کہ اُن کے ذریعہ مسٹر اور میڈم میں پہچان قائم ہو جاتی ہے، منجملہ اُن میں سے مردوں کی ایک ظاہری خصوصیت وعلامت داڑھی ہے، (مراد وہ بال ہیں جو داڑھ کے حصے میں ہوتے ہیں، جسے ہم اُردو زبان میں داڑھی سے تعبیر کرتے ہیں) تو عورتوں کی ایک ظاہری خصوصیت وعلامت چوٹی ہے، داڑھی مردوں کے لیے رجولیت اور مردانگی کی علامت ہے، تو چوٹی عورتوں کے لیے نسوانیت کی علامت ہے، داڑھی سے مرد کی شکل مردانہ نظر آتی ہے، تو چوٹی سے عورت کی شکل زنانہ نظر آتی ہے، اگر مرد وعورت اپنی اِس ظاہری خصوصیت و علامت کو ختم کر دیں تو بظاہر یہ پہچان مشکل ہو جاتی ہے کہ مسٹر ہے یا میڈم؟

ایک لطیفہ:

ایک لطیفہ ہے کہ حضرت شاہ عطاء اللہ بخاریؒ ایک شخص کے مہمان ہوئے، اپنے میزبان کے بچے کو پیار کے لیے پکڑا تو وہ چلانے لگا، میزبان نے مزاحاً کہا کہ "شاہ صاحب! کیا بات ہے؟ بچے داڑھی والوں سے بہت ڈرتے ہیں!" آپؒ نے فرمایا کہ "بچہ ماں سے زیادہ مانوس ہوتا ہے، اِس لیے اُسے داڑھی مونڈوں میں ماں کی شباہت نظر آتی ہے اس لیے وہ خوش ہو جاتا ہے، اور داڑھی والوں میں مردانگی کو نمایاں دیکھ کر متوحش ہو جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔" (حکایتوں کا گلدستہ/ص: ۲۶۸)

اِسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مردوں کی داڑھی اور عورتوں کی چوٹی اُن کی رجولیت اور نسوانیت کی ظاہری علامت ہونے کے علاوہ یہی چیز اُن دونوں کے لیے من جانب اللہ سامانِ زینت بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی خوبصورتی میں اِضافہ کرنے کے

لیے اُنہیں لمبی لمبی اور کالی کالی زلفوں اور چوٹیوں سے نوازا، تو مردوں کی خوبصورتی میں اِضافہ کرنے کے لیے اُنہیں داڑھیوں سے نوازا۔

صاحبو! یہ دونوں چیزیں بھی قدرت کا عطیہ ہیں، یہی تو وجہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے نہ عورت کی چوٹی مٹ سکتی ہے نہ مرد کی داڑھی، عورت چوٹی کے بغیر بدصورت ہے، تو مرد داڑھی کے بغیر بدصورت ہے، حدیثِ پاک میں ہے کہ آسمانوں پر موجود فرشتوں کی ایک جماعت اللہ کی حمد وثنا میں اِن الفاظ کے ساتھ مشغول ہے:

"سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللِّحٰی، وَ النِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ" (تکملة البحر الرائق:۸/۳۳۱، تفسیر روح البیان/ص:۲۲۲/تحت الآیة : وَ إِذِ ابْتَلٰی إِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ......الخ)

جس کا مطلب یہ ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں کے ذریعہ اورعورتوں کو چوٹیوں کے ذریعہ زینت بخشی۔

واقعہ یہ ہے کہ جس کی فطرت فاسد نہیں اور طبیعت میں ٹیڑھا پن نہیں ایسا شخص دِل میں اِس حقیقت کو ضرور تسلیم کرتا ہے، خواہ قول وعمل سے انکار کرتا ہو۔

داڑھی انسانی فطرت:

غالبًا یہی وجہ ہے کہ حدیثِ پاک میں داڑھی کا شمار بھی انسانی فطرت میں کیا گیا ہے:

عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ : قَصُّ الشَّارِبِ، وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ، وَ السِّوَاكُ، وَ اسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ، وَ قَصُّ الْأَظْفَارِ، وَ غَسْلُ الْبَرَاجِمِ، وَ نَتْفُ الْإِبِطِ، وَ حَلْقُ الْعَانَةِ، وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ" ـ يَعْنِيْ الْإِسْتِنْجَاءَ ـ . وَ قَالَ الرَّاوِيْ: "وَ نَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ، إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةَ."

(مسلم:۱/۱۲۹، مشکوٰۃ/ص:۴۴/ باب السواک)

فرمایا: ''دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: (۱) مونچھوں کا کٹوانا۔ (۲) داڑھی کا

بڑھانا۔ (۳) مسواک کرنا۔ (۴) ناک میں پانی ڈال کر اُسے صاف کرنا۔ (۵) ناخون تراشنا۔ (۶) بدن (یا انگلیوں) کے جوڑوں کی لکیروں (یا ہر اُس جگہ کو جہاں میل جمع ہوتا ہے اُسے) اچھی طرح دھونا۔ (۷) بغلوں کے بال صاف کرنا۔ (۸) زیرناف کے بال صاف کرنا۔ (۹) پانی سے اچھی طرح استنجاء کرنا۔''

دسویں چیز کے متعلق راویٔ حدیث حضرت مصعبؒ یا حضرت زکریاؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھے یاد نہیں رہی، ممکن ہے کلی کرنا ہو۔''

مذکورہ تمام چیزیں انسانی فطرت میں سے ہیں، اور فطرت حق اور حقیقت کو قبول کرنے کی قدرتی صلاحیت کو کہتے ہیں، اب جس خوش نصیب میں اللہ نے یہ صلاحیت رکھی ہے ایسا ہر صحیح العقل اور سلیم الفطرت انسان اِن فطری اُمور کو طبعی طور پر پسند کرتا ہے اور حدیثِ بالا کے مطابق داڑھی بھی انسانی فطرت میں سے ہے، لہٰذا انسانی فطرت کا حامل تو اُسے پسند کرتا ہے، البتہ حیوانی فطرت کا حامل اُسے خلافِ فطرت سمجھتا ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ حضرت سید شاہ اسماعیل شہیدؒ کے سامنے ایک شخص نے دورانِ بحث یہ کہا کہ داڑھی رکھنا خلافِ فطرت ہے، سید صاحبؒ نے پوچھا: وہ کیوں؟ کہنے لگا: اِس لیے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں ہوتی، لہٰذا داڑھی منڈوانی چاہیے، آپؒ نے فرمایا: اگر یہی دلیل ہے تو پھر آپ کو دانت بھی نکلوانے چاہیے، اِس لیے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے مُنہ میں بھی دانت نہیں ہوتے، لہٰذا یہ بھی خلافِ فطرت ہیں، وہ شخص اِس دنداں شکن جواب سے لاجواب ہوگیا۔
(مستفاد از حکایتوں کا گلدستہ/ص:۲۶۳، مؤلفہ: مولانا اسلم شیخوپوریؒ)

داڑھی پیاروں کا چہرہ اور طریقہ:

لیکن یاد رکھو! داڑھی کی اہمیت صرف اِس لیے نہیں ہے کہ یہ مردانگی کی علامت، سامانِ زینت اور خصالِ فطرت میں سے ہے، بلکہ اُس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ متعدد

احادیث میں مردوں کے لیے داڑھی رکھنے کی تاکید آئی ہے، جس کی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا کہ داڑھی رکھنا واجب اور اُس کا منڈوانا یا کٹوا کر ایک مشت سے کم کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، اور جن روایات سے داڑھی کا وجوب اور منڈوانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے اُن میں سے حدیثِ مذکور بھی ہے جس میں رحمتِ عالم ﷺ نے اِرشاد فرمایا:

" خَالِفُوْا الْمُشْرِكِيْنَ، وَفِّرُوْا اللِّحٰى، وَأَحْفُوْا الشَّوَارِبَ."

مشرکین کی مخالفت کرو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ تم لوگ داڑھیاں بڑھاؤ، اور مونچھیں کٹواؤ؛ کیوں کہ یہ بات اُن کے طور وطریق اور تہذیب وتمدن کے خلاف ہے، اُن کے یہاں داڑھی منڈوانا اور مونچھیں بڑھانا مذہب اور تہذیب کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ مصنفِ ابن ابی شیبہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے:

عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ ؓ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْمَجُوْسِ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، قَدْ حَلَقَ لِحْيَتَهٗ وَ أَطَالَ شَارِبَهٗ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ : "مَا هٰذَا ؟" قَالَ: "هٰذَا فِيْ دِيْنِنَا" قَالَ: "فِيْ دِيْنِنَا أَنْ نَجُزَّ الشَّارِبَ وَ أَنْ نُعْفِيَ اللِّحْيَةَ." (مصنف ابن أبی شیبة : ۶/۲۲۱)

ایک مجوسی دربارِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلاۃ والتسلیم) میں اِس حالت میں حاضر ہوا کہ اُس کی داڑھی منڈی ہوئی اور مونچھیں خوب بڑھی ہوئی تھیں، حضور ﷺ نے یہ دیکھ کر اِظہارِ ناراضگی کے ساتھ فرمایا کہ ''یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ''ہماری تہذیب و مذہب کا ایک حصہ ہے''، حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے دین میں (حکم یہ) ہے کہ ہم مونچھوں کو خوب چھوٹی کریں اور داڑھی کو اُس کی حالت پر چھوڑ دیں۔''

غور کیجیے کہ جب غیر کا داڑھی منڈا چہرہ دیکھ کر ہمارے آقا ﷺ ناراض ہو گئے تو کلمہ پڑھنے والے اُمتی کا داڑھی منڈا چہرہ دیکھ کر آپ ﷺ کس قدر ناراض ہوں گے۔

اِسی قسم کا ایک واقعہ اور بھی دوسری حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسریٰ کے دو قاصد حاضرِ خدمت ہوئے، آپ ﷺ نے جب دیکھا کہ اُن کی داڑھیاں منڈی ہوئی اور

مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں تو کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا: ''تم کو ایسی صورت بنانے کا کس نے حکم دیا؟'' کہنے لگے: ''ہمارے ربِ (مجازی) کسریٰ نے''، اُس موقع پر آپ ﷺ نے اِرشاد فرمایا: '' لٰكِنْ أَمَرَنِيْ رَبِّيْ أَنْ أُحْفِيَ شَارِبِيْ وَ أُعْفِيَ لِحْيَتِيْ.'' (البداية والنهاية: ۴/۶۶۳، ط: بيروت، حياة الصحابةؓ : ۱/۱۳۹)

یعنی میرے ربِ حقیقی نے مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹانے کا حکم دیا ہے،

اِس طرح کی اور بھی کئی احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی منڈوانا اور مونچھیں بڑھانا یہ مشرکوں، مجوسیوں، اللہ کے باغیوں، غیروں اور نافرمانوں کا چہرہ اور طریقہ ہونے کی وجہ سے حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ جب کہ داڑھی بڑھانا اور مونچھیں کٹوانا یہ نبیوں، رسولوں، اللہ کے پیاروں اور فرماں برداروں کا چہرہ اور طریقہ ہونے کی وجہ سے پسندیدہ اور واجب العمل ہے؛ کیوں کہ پیاروں کا چہرہ اور طریقہ بھی پیارا ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص پیاروں کا چہرہ اور طریقہ اپناتا ہے اللہ کو اُس پر بھی پیار آجاتا ہے، اِسی مضمون کو اثر جونپوری نے بہت خوبصورت انداز میں فرمایا:

داڑھی کے متعلق اشعار:

جو محبوبِ خدا کی دوستو! صورت بناتا ہے ☆ خدا کو بھی پھر اُس کی اِس ادا پر پیار آتا ہے
جو رُخ پر سنتِ سرکار کا سبزہ اُگاتا ہے ☆ تو اُس کے صحنِ دِل میں باغِ ایماں لہلہاتا ہے
میرے سرکار کو ہوگی اذیت ترکِ سنت سے ☆ بھلا! عاشق کبھی محبوب کا دِل دُکھاتا ہے
عمل جب پیش ہوگا تو کیا کہیں گے محبوبِ دو عالم ﷺ ☆ میرا اُمتی ہو کر بھی تو داڑھی منڈاتا ہے
اُس کی روح روشن ہے، منوّر ہے اُس کا دِل ☆ کہ جو رُخسار کو انوارِ سنت سے سجاتا ہے
گرونانک کے پیرو سے سبق لے استقامت کا ☆ ہمیں ایک مذہبِ باطل بھی آئینہ دِکھاتا ہے
جو عہدِ پرفتن میں زندہ کر دے ایک سنت کو ☆ ثواب اُس پر یقیناً سو شہیدوں کا وہ پاتا ہے
زمانہ بھر کے عاقل اُس کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ☆ اثرؔ! جو خود کو شاہِ نبی کا دیوانہ بناتا ہے

داڑھی منڈانے کی مذمت:

عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ اِن حقائق کے بعد اب جسے جن کا چہرہ اور طریقہ پسند ہو اپنے لیے اختیار کرلے، اگر اللہ کے پیاروں کا چہرہ اور طریقہ کسی کو پسند ہو تو وہ اپنے چہرے کو نورِ سنت (داڑھی) سے سجالے، اور اللہ کی رضا و رحمت کا حقدار بن جائے، اور اگر غیروں کا طریقہ و چہرہ پسند ہو تو اپنے چہرے سے اُس نورِ سنت کو مٹا اور منڈا دے، اور اللہ کے غضب و عذاب کے لیے تیار ہو جائے؛ کیوں کہ ایسے شخص کے لیے بڑی شدید وعید اور سخت مذمت وارد ہوئی ہے، اِس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ داڑھی منڈانا مشرکوں، اللہ کے باغیوں اور غیروں کی مشابہت اختیار کرنا ہے، جیسا کہ احادیثِ مبارکہ سے واضح ہو گیا، اور جب یہ غیروں کی مشابہت ہے تو حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ". (أبوداؤد، مشکوٰۃ /ص:۳۷۵)

اِس حدیث کے مطابق جو شخص دنیا میں جس قوم کی (تہذیب وتمدن اور طور وطریق میں) مشابہت اختیار کرے گا، قیامت میں اُس کا شمار اُسی قوم میں ہوگا۔ اب جو لوگ داڑھی منڈوا کر نبیوں اور اللہ کے پیاروں کے چہرے اور طریقے کی مخالفت اور غیروں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اُن کے لیے بہت ڈرنے کی بات ہے، کہیں اُن کا شمار قیامت میں اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں میں نہ ہو جائے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

دوسری بات یہ ہے کہ داڑھی مرد اور عورت کے درمیان امتیاز اور فرق کرنے والی ہے، من جانب اللہ مردوں کی داڑھی ہوتی ہے، جب کہ عورتوں کی نہیں ہوتی، لہٰذا جو لوگ داڑھی منڈواتے ہیں وہ اِس اعتبار سے عورتوں کے ساتھ بھی مشابہت اختیار کرتے ہیں، اور حدیثِ پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ

بِالنِّسَاءِ، وَ الْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ". (بخاری، مشکوٰۃ/ص:۳۸۰)

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن مردوں پر لعنت کرے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، اِسی طرح اُن عورتوں پر بھی لعنت کرے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی ہوں، لہٰذا داڑھی منڈا کر عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو داڑھی والی صورت عطا فرمائی، اب اگر کوئی شخص داڑھی کو منڈاتا ہے تو گویا وہ اللہ کی عطا کردہ صورت میں تبدیلی لانا چاہتا ہے، قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ جب شیطان نے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا، جس کی وجہ سے اُسے راندۂ دربار کیا گیا، اُس وقت اُس نے جو چیلنج کیے تھے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ "وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ" (النساء: ۱۱۹) میں ابن آدم کو یعنی دنیا کے تمام انسانوں کو حکم دوں گا، یہ بات سکھاؤں گا، تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورتیں بدل دیں گے۔ حضراتِ مفسرین نے اس کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ایک صورت داڑھی منڈانا بھی ہے، لہٰذا جو لوگ داڑھی منڈا کر اپنی فطری صورت بدلتے بلکہ بگاڑتے ہیں وہ شیطان کے چیلنج کو قبول کرتے ہیں، اور رحمٰن کے بجائے شیطان کی اِطاعت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا﴾ (النساء: ۱۱۹)

کہ وہ لوگ انجام کے اعتبار سے صریح خسران ونقصان میں ہوں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

علاوہ ازیں علماءِ محققین کے اقوال کے مطابق قومِ لوط جن دس برائیوں کے سبب سخت عذاب سے ہلاک کی گئی اُن میں ایک برائی داڑھی منڈانا بھی تھی (جیسا کہ تفسیر درِ منثور :۵/۶۴۴، سورۂ انبیاء، تحت الآیۃ: "إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سُوْءٍ فَأَغْرَقْنٰهُمْ أَجْمَعِيْنَ" آیت: ۷۷ کے تحت تفصیل موجود ہے)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فکر انگیز ارشاد:

خلاصہ یہ ہے کہ داڑھی منڈانا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے، اِس لیے جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں اُنہیں فکر کرنی چاہیے کہ مرنے کے بعد اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کے ساتھ وہ کس طرح ملاقات کریں گے؟ اِس سلسلہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کا ایک فکر انگیز ارشاد بھی قابلِ عبرت ہے، حضرتؒ اپنے رِسالہ ''داڑھی کا وجوب'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''مجھے ایسے لوگوں کو (جو داڑھی منڈاتے ہیں) دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ موت کا مقرر وقت کسی کو معلوم نہیں، اور اِس حالت میں (جب کہ داڑھی منڈی ہوئی ہو) اگر موت واقع ہوگئی تو قبر میں سب سے پہلے سید الرسل ﷺ کے چہرۂ انور کی زیارت ہوگی، تو کس منہ سے چہرۂ انور کا سامنا کریں گے؟ (پھر حشر میں اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر حاضر ہوں گے؟) اسی کے ساتھ بار بار خیال آتا ہے کہ گناہِ کبیرہ زنا، لواطت، شراب نوشی، سودخوری وغیرہ تو بہت ہیں، مگر وہ سب وقتی ہیں (دائمی نہیں) لیکن داڑھی منڈانا ایسا گناہ ہے جس کا اثر اور ظہور ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے، داڑھی منڈا نماز پڑھتا ہے تو بھی یہ گناہ ساتھ ہے، روزہ کی حالت میں، تسبیح کی حالت میں، غرض ہر عبادت (وحالت) کے وقت یہ گناہ اُس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ (داڑھی کا وجوب/ص:۶)

سمجھداری اِسی میں ہے کہ اِس دائمی گناہ سے دائمی طور پر توبہ کرلی جائے، اور اپنے چہرے کو نورِ سنت سے منور کرلیا جائے، حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے چہروں، دلوں بلکہ زندگیوں کو روشن اور منور فرمائیں، آمین۔

۱۱/شوال المکرّم/۱۴۳۵ھ/قبل الجمعہ
مطابق: ۸/اگست/۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی)

(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ)

(۵)

گناہ کیا ہے؟
اور اُس سے کیسے بچا جائے؟

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَؓ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الْبِرِّ وَ الْإِثْمِ، فَقَالَ: "الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَ الْإِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ، وَ كَرِهْتَ أَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ". (مسلم، مشکوٰۃ، ص:۴۳۱، باب الرفق والحیاء)

ترجمہ: حضرت نواس بن سمعانؓ فرماتے ہیں: رحمتِ عالم ﷺ سے میں نے نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''نیکی خوش اخلاقی کو کہتے ہیں۔ (یعنی نیکی کی عمدہ صورت یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ) اور گناہ وہ (کام ہے) جس کے کرنے سے تمہارے دِل میں تردّد اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جائے (تو سمجھ لو کہ یہ کام گناہ ہے، لیکن واضح رہے کہ اس کا اصلی تعلق اس شخص سے ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ ایمان سے مالا مال کیا ہو، علاوہ ازیں اس کام سے مراد وہ اعمال

وافعال ہیں جن کا کوئی واضح حکم اور ہدایت صاحبِ شریعت کی جانب سے منقول نہ ہو۔اور گناہ کی دوسری علامت یہ ہے کہ) تم اِس بات کو پسند نہ کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے واقف ہوجائیں۔

نیکی اور گناہ کی حقیقت:

اللہ رب العزت ہمارا خالق، مالک، مربی اور محسن ہے، اس کی محبت وعظمت اور احسان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر وقت اُس کی رضا ومنشا کو ملحوظ رکھیں، اور ہر اُس کام وکلام سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں جو اُس کی ناراضگی ونافرمانی کا ذریعہ ہو، نیکی اور گناہ کی حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر وہ کام وکلام جو اُس کی فرماں برداری اور رضامندی کا ذریعہ ہو اُسے نیکی اور جو کام وکلام اُس کی نافرمانی وناراضگی کا ذریعہ ہو اُسے گناہ کہتے ہیں، اور جب اللہ کی نافرمانی و ناراضگی والے کام کو گناہ کہتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اِس حیثیت سے ہر گناہ بڑا اور برا ہے، خواہ وہ خفیہ طور پر کیا جائے یا علانیہ طور پر، پرائیویٹ میں کیا جائے یا پبلک میں، رات میں کیا جائے یا دِن میں، اُس کا تعلق جسم کے ظاہر سے ہو یا باطن سے، اور بظاہر وہ چھوٹا سمجھا جائے یا بڑا، ہر گناہ بڑا اور برا ہے، اِسی لیے بعض علماءِ عارفین کے یہاں تو گناہ میں کوئی تقسیم ہے ہی نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کونسا گناہ صغیرہ ہے اور کون سا کبیرہ؟ بلکہ یہ سوچو کہ گناہ سے اللہ کی ناراضگی ونافرمانی ہوتی ہے، اور بڑوں کی چھوٹی نافرمانی وناراضگی بھی بہت بڑی اور بری ہوا کرتی ہے، لہٰذا گناہ کے چھوٹا بڑا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

گناہ کے تین درجات:

مگر جمہور علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ اللہ کی نافرمانی کے تین مختلف درجات ہیں، اِس اعتبار سے گناہ کے بھی تین درجات ہیں: (۱) ذنب: پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو پورا کرنے میں کوئی کوتاہی اور لغزش ہوجائے، یا کوئی بات (خلافِ اولیٰ) ہوجائے، تو اِس طرح

کی نافرمانی اور گناہ کو ''ذنب'' کہتے ہیں۔ (۲) سَیِّـئَـہ: دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کوتاہی یا غلطی اور نافرمانی ہوجائے، لیکن وہ اِتنی شدید نہ ہو کہ اُس پر کوئی سخت وعید کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہو، تو اِس قسم کی نافرمانی اور گناہ کو "سیئہ" کہتے ہیں۔

(۳) معصیت: تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان پہلے دونوں درجوں کی نافرمانی اور گناہ سے آگے بڑھ کر کوئی ایسا کام وکلام کرلے جس سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے قرآن وحدیث میں تاکید اور اہتمام سے منع فرمایا تھا، اور اُس پر اپنی ناراضگی کا اِظہار اور سخت وعید بیان فرمائی تھی، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے تو اس درجہ کی نافرمانی وگناہ کو ''اثم'' اور ''معصیت'' کہتے ہیں، ان میں پہلے دو درجوں کی نافرمانی کا شمار گناہِ صغیرہ اور تیسرے درجہ کی نافرمانی کا شمار گناہِ کبیرہ میں ہوتا ہے۔ (مستفاد از: قاموس الفقہ: ۴/ ۵۴۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ "لَا کَبِیْرَۃَ مَعَ الِاسْتِغْفَارِ، وَ لَا صَغِیْرَۃَ مَعَ الإِصْرَارِ" استغفار سے کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا، اور اصرار سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ''جو گناہ بندے کی نگاہ میں چھوٹا ہو وہ کبیرہ ہے، اور جو گناہ اُسے بڑا محسوس ہو، اور اُس کے بعد اُسے اپنی غلطی ونافرمانی کا احساس ہو وہ عنداللہ صغیرہ ہے۔

گناہ کے تین مُضِر اثرات:

اگر - العیاذ باللہ العظیم - گناہ کے صادر ہونے کے بعد توبہ، تلافی اور معافی کا اہتمام نہ کیا تو پھر گناہ کے مضر اثرات ضرور ظاہر ہوکر رہیں گے، اور بنیادی طور پر کتاب وسنت کی روشنی میں گناہوں کے تین مُضِر اور بُرے اثرات ثابت ہیں: (۱) اللہ کی ناراضگی (۲) دِل کی بے چینی (۳) دِل کی سیاہی وسختی۔ کسی بھی گناہ کا پہلا مُضِر اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس سے اللہ ناراض ہو جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ عذابِ الٰہی کا اصل سبب یہی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم نے مختلف قوموں پر نازل ہونے والے عذابِ الٰہی کا اصل سبب یہی بیان کیا کہ اُنہوں نے گناہوں کے ذریعہ اللہ کو ناراض کیا، تو عذابِ الٰہی نے اُنہیں ایک

مدت کے بعد پکڑلیا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ﴾ (عنکبوت/ ۴۰) "ہم نے اُن سب کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔" غالبًا اِسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے ذریعہ اُمت کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ ہر طرح کے چھوٹے (بڑے) گناہوں سے بچو! کیوں کہ معمولی گناہ پر بھی مطالبہ اور مؤاخذہ ممکن ہے۔ "يَا عَائِشَةُ! إِيَّاكِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ، فَإِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ طَالِبًا" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۴۵۸، عن عائشۃؓ......)

صاحبو! اگر اللہ تعالیٰ کی رضامندی بہت بڑی چیز ہے ﴿وَ رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبۃ/ ۷۲) تو ناراضگی بہت بُری چیز ہے، اور گناہ کا پہلا مُضِر اثر اللہ کی ناراضگی ہے۔ دوسرا مُضِر اثر یہ ہوتا ہے کہ گناہ سے دِل کا سکون ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں گناہ کی پہچان بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ" "جس کام سے تمہارے دِل میں بے چینی و بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو وہی گناہ ہے؛ کیوں کہ گناہ کا اثر یہی ہوتا ہے کہ اُس سے دِل کا سکون ختم ہو جاتا ہے، ارشادِ ربانی ﴿مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (طٰہٰ/ ۱۲۴) سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہماری نصیحت (و ہدایت) سے منہ موڑے گا، (ہماری نافرمانی کرے گا، جو کہ گناہ کی حقیقت ہے) تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، سکونِ قلبی پھر سکونِ زندگی سے وہ محروم ہو جائے گا، یہ گناہ کا دوسرا مُضِر اثر ہوتا ہے۔

اور تیسرا مُضِر اثر گناہ کا یہ ہوتا ہے کہ گنہگار کا دِل روحانی اعتبار سے سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ (بندۂ مومن کا دِل نورِ ایمانی کی وجہ سے یوں تو منوّر اور صاف ہو جاتا ہے، لیکن جب) وہ گناہ کرتا ہے تو اُس کے دِل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اُس کا دِل صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ توبہ نہیں کرتا بلکہ گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو پھر کثرتِ معاصی کے سبب اُس کا دِل بالکل سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے، دِل کی اسی سیاہی و سختی کا تذکرہ قرآن نے اِس طرح کیا:

﴿كَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (المطففین/ ۱۴)

ترجمہ: ہرگز نہیں، بلکہ جو (گناہ کا) عمل یہ کرتے ہیں اُس نے اُن کے دِلوں پر زنگ چڑھا دیا۔

اِس سے ثابت ہوا کہ گناہ کا مُضِر اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس سے دِل بگڑ جاتا ہے، سخت اور سیاہ ہو جاتا ہے، اور دِل کے بگڑنے سے انسان بھی بگڑ جاتا ہے۔

گناہ کی تین سزائیں:

تو یہ بھی درحقیقت بہت بڑا نقصان ہے؛ کیوں کہ -العیاذ باللہ- جب گناہوں کی وجہ سے قلبِ انسانی میں سختی و سیاہی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر انسان میں نیکی اور گناہ کی تمیز ختم ہو جاتی ہے، اور وہ گناہ میں ترقی کرتا جاتا ہے، اور یہ گناہ کی ایک دنیوی اور نقد سزا ہوتی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جب انسان گناہ کرتا ہے تو اُس کی سزا کی تین صورتیں ہوتی ہیں: (۱) نکیر (۲) تدبیر (۳) تاخیر۔ (مستفاد از "گناہ سے کیسے بچیں" ص: ۲۷۸، فلاح دارین: ۲/۱۹۳) یا تو اُس گناہ کے سبب گنہگار کو جانی، مالی یا جسمانی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، قرآنِ پاک میں اُسے یوں بیان کیا گیا:

﴿وَ مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (شوریٰ/ ۳۰)

ترجمہ: اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں (اور گناہوں) کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو تو یوں ہی معاف کر دیتا ہے۔

حدیث میں بھی ہے:

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰىؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "لَا يُصِيْبُ عَبْدًا نَكْبَةٌ فَمَا فَوْقَهَا أَوْ دُوْنَهَا إِلَّا بِذَنْبٍ، وَ مَا يَعْفُوْ اللّٰهُ عَنْهُ أَكْثَرُ، وَ قَرَأَ: وَ مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا

كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ". (ترمذی، مشکوٰۃ/۱۳۶)

ترجمہ: بندے کو جو تھوڑی بہت تکلیف پہنچتی ہے (عموماً) یہ اُس کے گناہوں کی وجہ سے ہے، اور وہ گناہ جنہیں اللہ تعالیٰ (بغیر سزا دیے) دنیا و آخرت میں معاف کر دیتا ہے اُن گناہوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں جن پر وہ سزا دیتا ہے، اُس کے بعد حضور ﷺ نے مذکورہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی۔

معلوم ہوا کہ عموماً دنیا میں مصیبت کسی نہ کسی معصیت کے سبب آتی ہے، اب اگر کوئی شخص اس گناہ کے سبب آنے والی مصیبت میں سنبھل کر گناہ چھوڑ دے اور اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ علامت اس بات کی ہے کہ آنے والی مصیبت اُس کے حق میں آزمائش تھی، لیکن اگر وہ گناہ نہیں چھوڑتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرتا ہے تو یہ مصیبت گناہ کی سزا ہے، اِس سزا کو ''نکیر'' کہتے ہیں۔

اور دوسری سزا وہ ہے جسے ''تدبیر'' کہتے ہیں، یعنی کبھی گنہگار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر ہوتی ہے، اور وہ اِس طرح کہ جیسا گناہ اور عمل گنہگار کرتا ہے اسی طرح کا گناہ اور عمل اُس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے، مثلاً وہ اگر کسی کو دھوکہ دیتا ہے تو اُسے بھی دھوکہ دیا جاتا ہے، وہ کسی کو ذلیل کرتا ہے تو اُسے بھی ذلیل کیا جاتا ہے، وہ اگر کسی کا حق ضائع کرتا ہے تو اُس کے حقوق بھی ضائع کیے جاتے ہیں، وہ اگر کسی پر ظلم کرتا ہے تو اُس پر بھی ظلم کیا جاتا ہے، اِس جیسے گناہوں کی مذکور سزا کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ ''تدبیر'' کہلاتا ہے، اور قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ (الأعراف:۱۸۳) **یقین جانو کہ میری خفیہ تدبیر بڑی مضبوط ہے۔**

ایک عبرتناک واقعہ:

اِس سلسلہ میں ایک نہایت ہی عبرتناک واقعہ منقول ہے کہ (بادشاہِ مصر) احمد بن طولون کو اپنے حوض کے پاس سے ایک بچہ پڑا ہوا ملا، اُس نے اُس کو اُٹھا لیا اور اپنی پرورش میں لے لیا، بعد میں وہ ''احمد یتیم'' کے نام سے مشہور ہوا، اللہ نے اُس کو ذہانت و فطانت اور

ظاہری و باطنی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، احمد بن طولون کا جب آخری وقت آیا تو اُس نے ''احمد یتیم'' کو اپنے بیٹے ''ابوالجیش'' کے سپرد کر دیا، کچھ وقت کے بعد ابوالجیش نے احمد یتیم کو بلا کر کہا کہ ''میں تمہیں اپنے یہاں ایک منصب پر فائز کرنا چاہتا ہوں، لیکن میری عادت ہے کہ میں کسی شخص کو جب کوئی ذمہ داری سپرد کرتا ہوں تو اُس سے پہلے یہ عہد و پیمان لیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہ کرے گا'' احمد یتیم نے وعدہ کر لیا تو ابوالجیش نے اُسے اپنے مال و اسباب کا نگران اور تمام حشم و خدم کا امیر مقرر کر دیا، تو احمد نے بھی اپنی ایمانداری، صاف گوئی، خدمت اور دیگر اعلیٰ صلاحیتوں کے ذریعہ ابوالجیش کے دِل میں گھر کر لیا، یہاں تک کہ وہ گھریلو اُمور میں بھی اُس پر اعتماد کرتا تھا۔

ایک دِن بادشاہ نے احمد سے کہا کہ ''میری فلاں باندی کے کمرے میں جاؤ، جس جگہ میں بیٹھا کرتا ہوں وہاں ایک موتی رکھا ہوگا اُسے لے کر آؤ'' احمد یتیم جب اُس کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے امیر ابوالجیش کی چہیتی اور خاص باندی کو ایک خادم کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پایا، خادم تو فوراً بھاگ نکلا، مگر باندی احمد یتیم کے پاس آکر اُسے بھی پیش کش کرنے لگی، احمد یتیم نے کہا: ''اللہ کی پناہ! میں اپنے امیر اور محسن کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتا'' یہ کہہ کر اس نے موتی لے کر امیر کی خدمت میں پیش کر دیا، لونڈی احمد یتیم سے خوف زدہ ہوگئی کہ کہیں وہ امیر کو خبر نہ کر دے، لہٰذا قبل از وقت وہ خود امیر ابوالجیش کی خدمت میں روتی ہوئی حاضر ہو کر کہنے لگی: ''احمد یتیم نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے'' یہ بات سن کر امیر غیظ و غضب سے کانپنے لگا۔

پھر کچھ سوچ کر اپنے ایک اور قابل اعتماد خادم کو بلا کر کہا کہ ''میں ایک شخص کو سونے کا طشت دے کر تمہارے پاس بھیجوں گا، وہ جب تم سے آکر کہے کہ اِس طشت کو مشک سے بھر دو، تو تم اُس کو قتل کر کے اُس کا سر طشت میں ڈھانپ کر میرے پاس بھیج دینا'' اُس کے بعد احمد یتیم سے کہا کہ ''یہ طشت فلاں خادم کے پاس لے جاؤ، اور اُس سے کہو کہ امیر نے اُس

میں مشک بھرنے کا حکم دیا ہے'' احمد سارے معاملہ سے بے خبر طشت لے کر چل پڑا، راستے میں اُس کنیز سے ملاقات ہوگئی، کنیز یہ چاہتی تھی کہ بادشاہ احمد یتیم کو مجھ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ لے، تاکہ اُسے میری شکایت کا مزید یقین ہوجائے، اِس لیے اُس نے احمد کو باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کی، اور کہا کہ ''آپ بادشاہ کا جو خط لے کر جارہے ہیں وہ میں دوسرے سے بھجوادیتی ہوں'' چنانچہ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُس کی نظر اُسی خادم پر پڑی جس کو اُس نے باندی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا تھا، احمد نے اُسے طشت تھماتے ہوئے کہا کہ ''فلاں خادم کے پاس جاکر اُسے کہو کہ امیر نے اِس کو مشک سے بھرنے کا حکم دیا ہے'' خادم نے جاکر اِسی طرح کہا تو پروگرام کے مطابق خادمِ خاص نے اُس کا سر کاٹا اور طشت میں ڈھانپ کر چل پڑا، راستے میں احمد یتیم نے اُس سے طشت لے لیا اور بے پرواہو کر- کہ اُس میں کیا ہے- امیر کی خدمت میں جاپہنچا۔

امیر نے جب اُسے طشت لیے زندہ سلامت دیکھا تو حیرت سے کبھی وہ احمد یتیم کو تو کبھی طشت کو دیکھتا، احمد یتیم نے جب طشت امیر کے سامنے رکھ کر کپڑا ہٹایا تو اُس کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں، اب وہ بھی گم صم تھا، کبھی طشت کو تو کبھی امیر کو دیکھتا، جب اُسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے اختیار پکار اُٹھا: ''یہ کیا ہے؟'' تو خود امیر بھی اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا، بالآخر اُس نے امیر کے پاس سے طشت لے کر جانے سے واپس آنے تک کی ساری کارگذاری سنائی اور اُس کے علاوہ کسی بات سے لاعلمی کا اظہار کیا، امیر نے احمد یتیم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا: ''تم اِس مقتول کے متعلق ایسی کوئی بات جانتے ہو جس کی وجہ سے یہ اِس انجام تک پہنچا ہے؟'' تب احمد یتیم نے اُس خیانت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ''میں نے تو آپ کو اطلاع نہ دے کر اُس کی پردہ پوشی کا ارادہ کیا تھا۔'' سن کر بادشاہ نے اُس لونڈی کو طلب کیا اور اُس سے تفتیش کی، تو اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے احمد یتیم کی پاکدامنی کی تصدیق کی، پھر کیا تھا، اُسی وقت لونڈی کو بھی قتل کردیا گیا، اِس واقعہ کے بعد امیر ابوالجیش کی نگاہ میں احمد یتیم کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی، اُس نے تمام اُمور کی زمامِ

تصرف اُس کے حوالہ کردی۔ غور کیجیے گا! دیانت دار کو اُس کی دیانت کا صلہ اور خیانت والے کو اُس کی خیانت کا بدلہ کس طرح ملا۔ (المستطرف/۲۱۵، مستفاد از: ''کتابوں کی درسگاہ میں''/۱۱۲ تا ۱۱۵)

جیسی کرنی ویسی بھرنی:

صحیح کہا جس نے کہا کہ:

عدل وانصاف فقط حشر پر موقوف نہیں ☆ زندگی بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

اِسی لیے کہتے ہیں کہ:

تیری کرنی کے تجھ کو ملیں گے پھل آج جو بوئے گا وہ کاٹے گا کل

جیسی کرنی ویسی بھرنی، نہ مانے تو کر کے دیکھ جنت بھی ہے، جہنم بھی، نہ مانے تو مر کے دیکھ

حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ صِرْمَةَ رض أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ''مَنْ ضَارَّ ضَارَّ اللّٰهُ بِهٖ، وَ مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ''. (رواہ ابن ماجہ والترمذی، مشکوٰۃ / ٤٢٨)

ترجمہ: جو کسی شخص کو (بلا وجہ شرعی) نقصان پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی نقصان پہنچائے گا، یعنی اُس کو اُس بُرے عمل اور گناہ کی اِسی طرح سے سزا دے گا، اور جو شخص کسی کو مشقت میں ڈالے گا اللہ تعالیٰ اُس کو بھی مشقت میں مبتلا کرے گا۔

اِسی کو ایک حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''(یَا مُوْسیٰ) کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ''. (أخرجه الديلمی، كذا فی كنوز الحقائق لعبدالرؤوف المناویؒ، از ''الأحاديث القدسية''/۲۱۰، مؤلفہ مفتی ثمین اشرف قاسمی، نیز روضۃ الأدب/۴۹) (حدیثِ قدسی نمبر:۳)

گناہ کی سب سے خطرناک سزا:

یہ گناہوں کی سزا کی وہ صورت ہے جسے ''تدبیر'' کہتے ہیں، لیکن گناہ کی سزا کی

تیسری شکل بڑی عجیب ہے، اور وہ یہ ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اس گناہ کے عوض مصیبت میں مبتلا کرنے کے بجائے اُسے مہلت دیتے ہیں، یعنی سزا کو مؤخر کر دیتے ہیں، جس کے سبب گنہگار غفلت میں مبتلا ہو کر گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے، پھر اچانک اُس کو پکڑ لیا جاتا ہے، دراصل یہ گناہ کی سب سے خطرناک سزا ہے، جسے ''تاخیر'' کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الأعراف/۱۸۲)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا (جو بہت ہی خطرناک گناہ ہے) ہم اُنہیں اِس طرح دھیرے دھیرے پکڑ میں لیں گے کہ اُنہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ اُن لوگوں کے لیے خطرے کے گھنٹی ہے جو مسلسل نافرمانی (اور گناہ) کیے جا رہے ہیں، اور پھر دنیا میں بھی عیش وعشرت سے (سزا میں تاخیر ہونے کے سبب) لطف اندوز ہو رہے ہیں، گناہ کے باوجود عیش وعشرت کا غفلت کے ساتھ میسر آنا اُن کے لیے انعام نہیں، بلکہ یہ تو استدراج یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے، اُن کی سزا کو یا تو ایک زمانہ تک یا پھر موت تک مؤخر کر دیا جاتا ہے، اگر یہاں اُنہیں نافرمانی اور عیش پرستی کی سزا نہ ملی تو آخرت میں ضرور ملے گی۔ حدیثِ پاک میں اُسی کو فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَةٍ، فَإِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا هُوَ لَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهٖ، إِنَّ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلًا لَا يَمُوْتُ" -يَعْنِيْ- النَّارَ. (رواه في شرح السنة، مشكوٰة/۴۴۷)

ترجمہ: کسی فاجر (علانیہ طور پر مختلف قسم کے گناہ کرنے والے) کو دنیوی نعمتوں اور عیاشیوں میں آسودہ دیکھ کر اُس پر رشک نہ کرو؛ کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد (قبر یا حشر میں) اُس کو کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا، اور یاد رکھو! فاجر و گنہگار کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایسا قاتل ہے جو کبھی مرنے والا نہیں، (راویٔ حدیث فرماتے ہیں) اور اُس قاتل سے حضور ﷺ کی مراد آگ ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی سزا کی ایک صورت تاخیر والی ہے، جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

گناہ چھوڑنے کی فضیلت:

گناہوں کے مُضِر اثرات، نقصانات اور سزاؤں سے حفاظت کی شکل صرف اور صرف یہی ہے کہ گنہگار آج تک ہونے والے تمام گناہوں سے سچی پکی توبہ، تلافی اور معافی کا اہتمام کرے، اور فی الحال جن گناہوں میں مبتلا ہے اُنہیں فوراً چھوڑ دے، اور آئندہ گناہوں سے محفوظ رہنے کے عزم و اِرادہ کے ساتھ تدابیر اختیار کرے، یہی قرآن کا حکم ہے: ﴿وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ﴾ (الأنعام/۱۲۰) ہر قسم کے ظاہری و باطنی (اور صغیرہ و کبیرہ) گناہ ترک کرو۔ اِس سے ثابت ہوا کہ ترکِ معاصی فرضِ عین ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی تکمیل کے بعد سب سے اہم چیز ترکِ معاصی ہے، اور عاجز کے خیالِ ناقص میں یہی ولایت کی روح ہے، چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ "اِتَّقِ الْمَحَارِمَ، تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ". (أحمد و ترمذی، مشکوٰۃ/۴۴۰) محرمات اور معاصی سے بچو، تو تم لوگوں میں بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔ نفلی عبادت اور نیکی سے جو اجر ملنے والا ہے وہ تمہیں ترکِ معاصی سے مل جائے گا، اِس لیے ترکِ معاصی کا خوب اہتمام کرو، جہاں تک نیکی کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ نیکی کا کرنا تو ہر کسی کے لیے نہایت آسان ہے، لیکن اصل کمالِ ایمانی یہ ہے کہ انسان گناہ سے بچ جائے، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن بھی اُن ہی لوگوں کو متقی اور پرہیزگار کہتا ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں، فرمایا: ﴿إِنْ أَوْلِيَاءُهٗ إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الأنفال: ۳۴)

اور تقویٰ کی حقیقت کچھ کرنا نہیں، بلکہ بچنا ہے، تو کس سے بچنا؟ ہر اُس کام و کلام سے بچنا جو اللہ کی نافرمانی و ناراضگی کا ذریعہ ہو، یعنی گناہوں سے بچنا ہی تقویٰ ہے، لہٰذا جو شخص بھی گناہ چھوڑ دے گا اور آئندہ بھی اُس سے بچے گا تو وہ عبادت گزار اور متقی و پرہیزگار

کے اجر کا حقدار بن جائے گا۔

گناہ سے بچنے کی تین تدابیر:

اب سوال یہ ہے کہ گناہ سے کیسے بچا جائے؟ تو اُس کے لیے سب سے پہلے آدمی گناہوں سے بچنے کی سچی پکی نیت کرے، پھر ہمت کر کے گناہوں سے بچنے کی جو تدابیر ہیں اُنہیں اختیار کرے، علماء نے فرمایا ہے کہ گناہ سے بچنے کی تین بنیادی تدابیر ہیں:

(۱) گناہوں سے بچنے کے لیے دعا کا اہتمام کرنا، یہ ضروری ہے؛ کیوں کہ خود سید المعصومین، رحمۃ للعالمین ﷺ معصوم اور بے گناہ ہونے کے باوجود اللہ سے یہ دعا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِتَرْكِ الْمَعَاصِیْ أَبَدًا مَّا أَبْقَيْتَنِیْ" (سنن الترمذی/فی دعاء الحفظ، والمستدرك على الصحيحين/حديث عبدالله بن فروخ، والمعجم الكبير للطبرانی فی الباب الثالث، رقم الحديث :۱۱۸۶۸) (الٰہ العالمین! مجھ پر رحم فرما کہ میں گناہ سے مرتے دم تک بچتا رہوں)۔ لہٰذا ہم بھی سچے دِل سے اللہ تعالیٰ کے حضور ترکِ معاصی اور اجتناب عن المعاصی کے لیے درخواست پیش کریں:

غمِ حیات کے سایے محیط نہ کرنا ☆ کسی غریب کو دِل کا غریب نہ کرنا
میں امتحان کے قابل نہیں، میرے مولیٰ! ☆ مجھے گناہ کا موقع نصیب نہ کرنا

(۲) گناہ سے بچنے کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دینی، دنیوی اور جسمانی وروحانی مُضر اثرات ونقصانات کا یقین کرے، انسانی فطرت ہے کہ جب اُسے کسی چیز سے نقصان پہنچنے کا یقین ہوتا ہے تو اُس کے لیے اُس کو چھوڑنا اور اُس سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، مثلاً بجلی کے تار کو نقصان کے یقین کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، اِسی طرح سانپ بظاہر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، لیکن یقین ہے کہ اس سے نقصان ہوتا ہے، اِس لیے ہر کوئی اُس سے بچتا ہے، تو جس طرح دنیا کی مادی چیزوں میں ہونے والے نقصانات کا یقین انسان کو اُن چیزوں سے بچا لیتا ہے اِسی طرح معاصی سے ہونے

والے مُضر اثرات ونقصانات کا اگر یقین ہو جائے تو انسان کے لیے اُن سے بچنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

(۳) گناہ سے بچنے کی تیسری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا استحضار رکھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ گناہ سے پہلے اتنا سوچ لے کہ میں گناہ کرتے وقت سب کی نگاہ سے بچ سکتا ہوں، مگر رب کی نگاہ سے ہرگز نہیں بچ سکتا، گناہ کرتے وقت اُن تمام دروازوں کو بند کر سکتا ہوں جن سے مخلوق دیکھ سکتی ہے، لیکن اُس دروازے کو بند نہیں کر سکتا جس سے میرا خالق ومالک اور محسن ومربی دیکھتا ہے، اِس تصور اور اللہ تعالیٰ کی معیت کے اِس استحضار کے بعد بندہ کے لیے گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ گناہ غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے، جو بندہ اپنے اللہ اور انجام سے غافل ہو جاتا ہے، وہی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ بندہ نماز، دعا اور مناجات کے وقت تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قریب ہے، لیکن گناہ کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ دور ہے اور میرے ساتھ نہیں، بلکہ میری نقل وحرکت سے بے خبر ہے۔ نعوذ باللہ۔

قیامت میں انسان کے اعمال کے آٹھ گواہ:

حالاں کہ قرآن وحدیث میں اس حقیقت کو بارہا بیان کیا گیا ہے کہ انسان جب بھی کوئی نقل وحرکت اور عمل کرتا ہے تو اُسے اللہ پاک کے غیبی مگر یقینی نظام کے تحت نوٹ اور محفوظ کیا جاتا ہے، پھر قیامت کے دِن ان تمام اعمال کو اس کے سامنے من وعن پیش کیا جائے گا، اور کوئی انسان انکار نہیں کر سکے گا، چنانچہ قیامت کے دن ہر انسان کے اعمال پر آٹھ گواہ پیش ہوں گے۔

(۱) پہلا گواہ: "اَلْمَكَانُ" ...... جس جگہ بندے نے اچھا یا برا عمل کیا ہے وہ جگہ اور زمین کا ٹکڑا قیامت کے دن گواہی دے گا، قرآن کہتا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ (الزلزال/۴-۵)

ترجمہ: اُس دِن زمین اپنی ساری خبریں بتادے گی، کیوں کہ تمہارے رب نے اُسے یہی حکم دیا ہوگا۔

بس اللہ کا آرڈر ہوتے ہی زمین خبریں نشر کرنا شروع کردے گی اور بندہ کی عبادت ومعصیت کو بیان کردے گی۔

(۲) دوسرا گواہ: "الزَّمَانُ"...... جس دِن بندے نے اچھا یا برا عمل کیا ہوگا وہ دِن بھی قیامت کے دِن اللہ کے حضور عمل کرنے والے کے لیے گواہی دے گا، قرآنِ کریم نے ''شاہد'' اور ''مشہود'' کی قسم کھائی ہے: ﴿وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ﴾ (البروج/۳) اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور اس کی جس کے پاس لوگ حاضر ہوں گے، ''شاہد'' اور ''مشہود'' کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ ''شاہد'' سے مراد دِن اور رات ہیں، اور ''مشہود'' سے مراد انسانوں کے اعمال ہیں، حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ:

"مَا مِنْ يَومٍ إِلَّا يُنَادِيْ: إِنِّيْ يَوْمٌ جَدِيْدٌ، وَ إِنِّيْ عَلَى مَا يُعْمَلُ فِيَّ شَهِيْدٌ".
(تفسیر عزیزی جدید/۲۹۸/ پارۂ عم)

ترجمہ: ہر دِن یہ اعلان کرتا ہے کہ میں نیا دِن ہوں، اور مجھ میں (اِس دِن میں) جو عمل کیا جائے گا میں اس کی گواہی دوں گا۔

معلوم ہوا کہ جس دِن انسان نے کوئی عمل کیا ہوگا قیامت میں وہ دن بھی انسان کے اچھے برے عمل کی گواہی دے گا۔

(۳) تیسرا گواہ: "اللِّسَانُ"...... جس طرح دنیا میں زبان سے گواہی دی جاتی ہے اِسی طرح قیامت کے دِن بھی ابتداءً زبان سے گواہی دی جائے گی، قرآن کہتا ہے: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ﴾ (النور/۲۴) جس دِن خود اُن کی زبانیں (ان کے اچھے برے عمل کی) گواہی دیں گی، لیکن بعض انسان زبان سے مکرنا چاہیں گے، تو پھر اللہ پاک ان اعضاء کو قوتِ گویائی عطا فرمائیں گے جن سے اعمال صادر ہوئے تھے، اِس لیے

(۴) چوتھا گواہ: "الْأَرْكَانُ"...... انسان کے اعضاءِ جسمانی خود اُس کے اعمال کی گواہی دیں گے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى أَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَا أَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (یٰس/۶۵)

ترجمہ: آج ہم اُن کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور اُن کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے تھے۔

جب انسان اپنے جرائم کا زبان سے اقرار کرنے کے بجائے انکار کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی زبان ہی کو بند کردیں گے اور جس طرح خدا نے زبان کو قوتِ گویائی دی تھی وہ باقی اعضاءِ جسمانی کو قوتِ گویائی عطا کردے گا، جس سے وہ اُس کے اعمال کی گواہی دیں گے کہ اُنہوں نے فلاں فلاں جرائم کیے تھے، تب انسان حیران ہوکر کہے گا: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا﴾ ؟ (تم نے میرے خلاف کیوں گواہی دی؟) ﴿قَالُوْا أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ/۲۱) تو اعضاءِ جسمانی کہیں گے کہ ہمیں اُس ذات نے بولنے کی طاقت دی ہے جس نے ہر چیز کو قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے۔

اِن حقائق سے واضح ہوا کہ انسان کے اعضاءِ جسمانی کل قیامت کے دن گواہِ سلطانی بن جائیں گے اور اعمالِ انسانی کی رپورٹ پیش کریں گے۔

(۵) پانچواں گواہ: "اَلْمَلَكَانِ"...... ہر انسان کے ساتھ اللہ پاک نے بطورِ نگراں فرشتے مقرر فرمائے ہیں، جو انسان کے اچھے برے اعمال کو نوٹ اور محفوظ کرتے ہیں اور اُسی سے انسان کا اعمال نامہ تیار ہوتا ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ o كِرَامًا كَاتِبِيْنَ o يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ o﴾
(الانفطار: ۱۰-۱۱-۱۲)

ترجمہ: حالاں کہ تم پر کچھ نگران (فرشتے) مقرر ہیں، وہ معزز لکھنے والے ہیں، جو تمہارے سارے کاموں کو جانتے ہیں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ انسان دنیا میں جو کچھ اچھا برا عمل کرتا ہے اس کی باقاعدہ شیٹ رول (Sheet Roll) (نامۂ اعمال) تیار ہوتی ہے، اور پھر قیامت میں اُسی کو گواہی میں پیش کیا جائے گا، اِسی لیے

(٦) چھٹا گواہ: "الدِّيْوَانُ"...... وہ اعمال نامہ ہوگا جس کو فرشتوں نے بحکمِ الٰہی تیار کیا ہوگا، قیامت میں جب یہ اعمال نامہ انسان دیکھے گا تو پریشان ہو کر عرض کرے گا:

﴿ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ج وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ (الكهف/٤٩)

ترجمہ: ہائے ہماری بربادی! یہ کیسی کتاب ہے جس نے ہمارا کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں چھوڑا جس کا پورا احاطہ نہ کیا ہو، اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ (ہر ایک کے ساتھ نیک و بد اعمال کے ثبوت کے بعد جزا و سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔)

(٧) ساتواں گواہ: "نَبِيُّ الْإِنْسِ وَ الْجَانِّ"...... یہ بات کہتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ انسان کے اچھے برے اعمال کی گواہی خود رحمتِ عالم ﷺ قیامت کے دِن بارگاہِ رب العالمین میں پیش فرمائیں گے، قرآنِ پاک نے اُسے یوں بیان فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ (النساء/٢١)

ترجمہ: پھر (یہ لوگ سوچ رکھیں کہ) اُس وقت (اُن کا) کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے اور (اے پیغمبر!) ہم تم کو اِن لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں گے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اس آیتِ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں کہ "تمام انبیاءِ کرام قیامت کے روز اپنی اپنی اُمتوں کے اچھے برے اعمال پر

گواہی دیں گے، اور آں حضرت ﷺ کو اپنی امت کے لوگوں پر گواہ بنا کر پیش کیا جائے گا۔" (آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۲٦٦)

اب جس کے ایمان و اعمالِ صالحہ کی گواہی خود حضور ﷺ پیش فرمائیں گے اُس کے مقدر کا تو کیا ہی پوچھنا، لیکن - العیاذ باللہ العظیم - جس کے گناہ کی گواہی خود حضور ﷺ پیش فرمائیں گے پھر اُس کی ہلاکت میں بھی کیا تردد؟

(٨) آٹھواں گواہ: "الرَّحْمٰنُ"...... انسان کی ہر نقل و حرکت و عمل اللہ کے علم میں ہے، اِس لیے خود حق تعالیٰ اعمالِ انسانی کے گواہ ہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ط وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ وَ لَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (یونس/٦١)

اور (اے لوگو!) تم جو کام بھی کرتے ہو تو جس وقت تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو، ہم تمہیں دیکھتے رہتے ہیں، اور تمہارے رب سے کوئی ذرہ برابر چیز پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی، نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ کے علم و مشاہدہ سے کوئی چیز اور کسی بھی انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر یہ یقین اور تصور ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو پھر کسی بھی موقع پر گناہ سے بچنا یا گناہ کے بعد توبہ کرنا ان شاء اللہ آسان ہو جائے گا۔

گناہ کے گواہ ختم کرنے کا نسخہ سچی توبہ ہے۔

گناہ کے بعد اگر سچی توبہ کی توفیق میسر ہوگئی تو ان شاء اللہ اس کی برکت سے حق تعالیٰ گناہ کے سارے گواہ ختم فرما دیں گے، بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ نے گناہ کو ختم کرنے کے لیے ہمیں دعا کی شکل میں توبہ کا طریقہ بتلایا ہے:

﴿ وَ اعْفُ عَنَّا وقفه وَ اغْفِرْ لَنَا وقفه وَ ارْحَمْنَا وقفه اَنْتَ مَوْلٰنَا ﴾

علامہ آلوسی بغدادیؒ (روح المعانی جلد:۱/صفحہ:۷۱ پر) رقم طراز ہیں کہ ﴿ وَاعْفُ عَنَّا﴾ کا مطلب ہے: ”اُمْحُ آثَارَ ذُنُوْبِنَا“ یعنی اے اللہ! ہمارے گناہوں کے آثار ونشان مٹا دیجیے۔ اور ﴿ وَاغْفِرْ لَنَا﴾ کا مطلب ہے: ”بِسَتْرِ الْقَبِيْحِ وَ إِظْهَارِ الْجَمِيْلِ“ ہماری برائیوں پر اپنی ستاری کا پردہ ڈال دیجیے اور نیکیوں کو مخلوق پر ظاہر فرما دیجیے۔ اور ﴿وَارْحَمْنَا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب معافی اور مغفرت مل گئی تو اب رحمت بھی نازل فرما دیجیے، (یعنی توفیق طاعت، رزق میں وسعت، بے حساب مغفرت اور دخولِ جنت) ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا﴾ آپ ہمارے آقا، مالک اور کاموں کے متولی ہیں۔

اس دعا کے ذریعہ معافی مانگی جائے اور سچی توبہ کی جائے تو ان شاء اللہ گناہوں کے گواہ باقی نہیں رہیں گے۔

حدیث پاک میں بھی وارد ہے:

” إِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنْسَى اللّٰهُ الْحَفَظَةَ ذُنُوْبَهُ، وَ أَنْسٰى ذٰلِكَ جَوَارِحَهُ وَ مَعَالِمَهُ مِنَ الْأَرْضِ، حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَ لَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِّنَ اللّٰهِ بِذَنْبٍ“. (الجامع الصغیر للسیوطی: ۱/۲۱)

جب بندہ سچی توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ ملائکہ کو بھی بھلا دیتے ہیں اور جن اعضاء سے گناہ ہوتے ہیں ان کو بھی بھلا دیتے ہیں اور زمین پر جہاں جہاں گناہ ہوئے تھے ان کے نشانات بھی مٹا دیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے گناہوں پر کوئی گواہی دینے والا نہ ہوگا۔

حق تعالیٰ ہمارے اور ہماری قیامت تک کی نسلوں کے گناہوں کو معاف فرمائیں اور ہمیں گناہوں سے محفوظ فرما کر مقبول بنائیں۔ آمین۔

۱۲/ رمضان المبارک/ بروز: جمعہ/ ۱۴۳۵ھ
مطابق: ۱۱/ جولائی/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۶)

قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلمان کی پہچان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ” اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَ يَدِهِ، وَ الْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَ أَمْوَالِهِمْ“. (ترمذی، مشکوٰۃ/۱۵)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”(سچے، پکے اور کامل) مسلمان (کی پہچان یہ ہے کہ) اس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے دوسرے مسلمان (بلکہ تمام ہی انسان وحیوان) محفوظ رہیں، اور (سچے، پکے اور کامل) مومن (کی پہچان یہ ہے کہ) لوگ اس سے اپنی جان ومال کے متعلق مطمئن رہیں۔“

مسلمان سب سے اچھا انسان ہے:

اللہ رب العزت کی جانب سے جو کچھ احکامات وہدایات لے کر ساری انسانیت کی

ہدایت کے لیے رحمتِ عالم ﷺ تشریف لائے ان کو صرف دل سے سچا جاننا ہی نہیں، بلکہ مان کر قبول کرنا ایمان، اور پھر اُن کے مطابق عمل کرنے کا نام اسلام ہے، ایمان کا تعلق تصدیقِ قلبی اور احوالِ باطنی سے ہے، تو اسلام کا تعلق اعمالِ ظاہری سے ہے، اس اعتبار سے جو شخص بھی اللہ رب العزت کو، اس کے فرشتوں، نبیوں، غیب کی باتوں اور ایمانی لوازمات و احکامات کو دِل سے سچا مان کر قبول کر لے وہ ہے مومن، اور پھر جو ان ہی احکامات و ہدایات کے مطابق ساری زندگی اور اس کے ہر شعبے میں عمل کرتا ہو وہ ہے مسلمان، مفہوم و مصداق تو دونوں کا ایک ہی ہے، اسی لیے یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے لیے استعمال بھی ہوتے ہیں، کیوں کہ ایمان و اسلام کی مسافت و منزل ایک ہے، فرق ابتدا و انتہا میں ہے، ایمان قلب سے شروع ہو کر عمل پر مکمل ہوتا ہے، تو اسلام عمل سے شروع ہو کر قلب پر مکمل ہوتا ہے، قرآن ایسے مومن اور مسلمان کو جو اسلام کے مطابق زندگی گذارتا ہے، دنیا کا سب سے اچھا انسان کہتا ہے، فرمایا: ﴿ وَ مَنْ أَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ (النساء/۱۲۵) اور اُس سے بہتر انسان اور کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو (اسلام قبول کر کے) اللہ کے (احکامات کے) مکمل سپرد کر دیا، (اور وہ اس طرح مسلم بندہ ہو گیا)۔

قرآن کا یہ دعویٰ بے جا نہیں، بلکہ حقیقت پر مبنی ہے، واقعہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص قرآنی و اسلامی ہدایات کے مطابق ﴿ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ/۲۰۸) پر عمل کرتے ہوئے کامل اور مکمل طور پر مسلمان بن جائے، یعنی عبادت ہو یا سیاست، معاشرت ہو یا تجارت، خلوت ہو یا جلوت، خوشی ہو یا غمی، تندرستی ہو یا بیماری، مالداری ہو یا غریبی، غرض زندگی کے ہر شعبے میں احکامِ اسلام کا مطیع اور مکمل پابند بن جائے تو پھر دنیا کا سب سے اچھا انسان یہ مسلمان ہی ہے، کیوں کہ اسلامی تعلیمات و ہدایات صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ ساری انسانیت کے لیے نفع بخش ہیں، جیسے اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں ہے، ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران/۱۹) اسی طرح اسلامی ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنے والے سچے مومن اور مسلمان سے بہتر کوئی انسان بھی نہیں ہے۔

مسلمان کون ہے؟

اور ایک سچا، پکا اور کامل و مکمل مومن اور مسلمان وہی ہے جو اللہ کی فرماں برداری اور بندگی کے ساتھ اس کی مخلوق کی خیر خواہی اور نفع رسانی کے لیے بھی برابر فکر مند رہے، اِس لیے کہ قرآن نے مسلمان کو ایک بہترین انسان فرمایا تو دوسری جگہ اس کے بہترین ہونے کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران/۱۱۰) (مسلمانو!) تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی نفع رسانی کے لیے پیدا کی گئی ہو۔ دیکھیے! اس جگہ مسلمان کے بہترین انسان اور امت ہونے کی بنیادی وجہ اس کا ساری انسانیت کے لیے نفع بخش ہونا بیان فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں کامل مسلمان وہی ہے جو اپنی ذات و زبان اور قول و عمل کے ذریعہ بقدرِ طاقت انسانوں کو دینی و دنیوی اعتبار سے نفع پہنچائے، اور نفع پہنچانے کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ جان بوجھ کر بلا کسی معقول وجہ کے کسی کو کسی بھی طرح سے کوئی دینی یا دنیوی نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن اس جگہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ تعزیرات (مجرموں کو بشرطِ قدرت سزا دینا) اور تادیبات (بچوں وغیرہ کو تنبیہ کرنے) کا حکم اس سے مستثنیٰ اور علیحدہ ہے، کہ وہ ایذا نہیں، بلکہ اصلاح ہے۔ عام احوال میں عمومی حکم یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ذات و زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

حدیث میں "المسلمون" کے تحت "المسلمات" بھی داخل ہیں:

اس حقیقت کو حدیثِ مذکور میں اس طرح بیان فرمایا گیا: " اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ، وَ الْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَ أَمْوَالِهِمْ".

"ایمان" میں امن ہے، اور "اسلام" میں سلامتی ہے، اس لیے ایک مومن و مسلم بھی وہی ہے جو امن و سلامتی کا سبب ہو، جس کی ذات سے کسی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، سچے مسلمان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی حقیقی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ نفع بخش ہو، نقصان دہ نہ ہو،

کیوں کہ حدیثِ پاک میں اگر چہ "المسلمون" کا لفظ مذکور ہے، مگر "المسلمات" بھی اس میں داخل ہیں، جس طرح شریعت کے دیگر احکامات و ہدایات میں مسلمان عورتوں کو مردوں کے ماتحت اور تابع بنا کر حکم دیا گیا، یہاں بھی اسی طرح ہے، اس لیے اب مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی کامل اور سچے، پکے مسلمان مرد وزن کی امتیازی و بنیادی پہچان یہ ہے کہ وہ امن وسلامتی کا ذریعہ ہو، لوگ اس کی مضرت، ایذا وتکلیف سے مامون ومحفوظ رہیں، کیا اپنے اور کیا پرائے، کیا دوست اور کیا دشمن، کیا مرد اور کیا زن، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق اس سے مامون و محفوظ رہے۔

حدیثِ پاک میں "المسلمون" کی تخصیص کیوں؟

لیکن سوال یہ ہے کہ حدیثِ مذکور میں تو غیر مسلموں اور دیگر مخلوق کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا، بلکہ "المسلمون" کی تخصیص ہے، کیوں؟ جواب یہ ہے کہ یہاں مسلمان کے علاوہ غیر مسلم اور دیگر مخلوق سب ہی کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ کسی کو کوئی مضرت اور نقصان بلا کسی معقول وجہ کے نہ پہنچائے، جہاں تک مسلمان کی تخصیص کی بات ہے، تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کا واسطہ اور رابطہ اکثر و بیشتر حالات و معاملات میں کسی مسلمان ہی سے ہوتا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ مسلمان کا ذکر کیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مسلمان جن سے ہر وقت سابقہ اور رابطہ رہتا ہے وہ اگر اس کی مضرت وتکلیف سے محفوظ رہیں گے تو ظاہر ہے کہ غیر مسلم اور دیگر مخلوق جن سے ایک مسلمان کا واسطہ اور رابطہ کبھی کبھی اور بہت کم پڑتا ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ اس کے شر سے محفوظ و مامون رہیں گے۔

بعض علماء نے اس تخصیص کی دوسری وجہ اور بھی بیان فرمائی، اور وہ یہ کہ یہ ابتدائی دور کا ایک خصوصی حکم تھا، بعد میں عمومی حکم نازل ہوا، جس میں "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ" کے بجائے "مَنْ سَلِمَ النَّاسُ" کا ذکر ہے۔ (رواہ ابن حبان، مرقاۃ: ۱/۷۲) اس کا مطلب بیان کیا جا چکا۔

48

صاحبو! اب ہر مسلمان مرد وزن سے اسی کا مطالبہ ہے کہ وہ تمام ہی بنی نوعِ انسان کے لیے پر امن و بے آزار و بے ضرر بن جائے، تمام تصوف کا نچوڑ اور حاصل بھی یہی ہے۔

حدیثِ مذکور میں زبان اور ہاتھ کی تخصیص کیوں؟

یہاں ایک اور اشکال اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیثِ بالا میں تو صرف زبان اور ہاتھ کا ذکر ہے کہ زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ دے، تو کیا دیگر اعضاء سے تکلیف پہنچانے کی اجازت ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ مطلقاً ایذا اور مضرت کی ممانعت ہے، زبان اور ہاتھ کی تخصیص تو اس لیے ہے کہ دیگر اعضاء کے مقابلہ میں اکثر و بیشتر ان ہی دونوں اعضاء کے ذریعہ تکلیف پہنچائی جاتی ہے، مثلاً دیکھئے! گالی گلوچ، لعن طعن، چغلی، تلخ کلامی، غیبت و بہتان اسی طرح اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر کا ناجائز یا ضرورت سے زائد استعمال کرنا وغیرہ چیزیں ایسی ہیں جن میں زبان کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے، اسی طرح مار پیٹ، قتل ناحق، ظالمانہ فیصلہ لکھنا نیز ناجائز چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھانا وغیرہ چیزیں ایسی ہیں جن میں ہاتھ کے ذریعہ دوسروں کو اذیت ومضرت پہنچائی جاتی ہے، تو چوں کہ اکثر و بیشتر تکلیف دینے میں زبان اور ہاتھ ہی کو دخل ہوتا ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان دونوں اعضاء کا ذکر کیا، ورنہ حکم سب کا ایک ہی ہے۔

حدیثِ مذکور میں زبان کو ہاتھ پر مقدم کرنے کی وجہ:

پھر ایک اور عجیب نکتہ یہ بھی ہے کہ اس حدیث شریف میں زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا گیا، تو اس میں بھی کئی حکمتیں ہیں، منجملہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زبان کی تکلیف کا دائرہ نہایت وسیع اور غیر محدود ہے، زمین سے لے کر آسمان تک، شمال سے لے کر جنوب تک، مشرق سے لے کر مغرب تک، حاضرین سے لے کر غائبین تک، زندوں سے لے کر مردوں تک، بلکہ قیامِ دنیا سے لے کر فناءِ دنیا تک کی تمام مخلوق اس کے احاطہ ودائرہ میں آسکتی ہے،

ایک معمولی انسان بھی اپنی زبان سے برا بھلا کہہ کر ان ساری مخلوق کو تکلیف دے سکتا ہے، جب کہ ہاتھ کا معاملہ ایسا نہیں، اس کی تکلیف کا دائرہ محدود ہے، پھر ہاتھ سے ہر کسی کو تکلیف نہیں دی جاسکتی، جب کہ زبان سے ہر کسی کو تکلیف دی جاسکتی ہے، علاوہ ازیں یہ کہ ہاتھ کی تکلیف سے زیادہ سے زیادہ جسم زخمی ہوتا ہے، لیکن زبان کی لعنت وملامت اور الزام وغیرہ سے جو تکلیف ہوتی ہے اس سے دل زخمی ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات تو صرف زبان کے ایک ہی جملے سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے، بقولِ شاعر:

جِرَاحَاتُ اللِّسَانِ لَهَا الالْتِيَامُ ☆ وَ لَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

(مرقاۃ:۱/۷۲)

کسی نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے کہ:

چھری کا، تیر کا، تلوار کا تو گھاؤ بھرا ☆ لگا جو زخم زبان کا، رہا ہمیشہ ہرا

ان حقائق سے واضح ہوا کہ زبان کی تکلیف کا دائرہ ہاتھ کے مقابلہ میں نہایت وسیع اور خطرناک بھی ہے، اس لیے حدیث شریف میں زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

معاشرتِ اسلامیہ کا بنیادی اصول:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایک مومن اور مسلمان کا کام صرف اتنا نہیں کہ محض کلمہ پڑھ لے، اور زیادہ سے زیادہ چند مخصوص اور متعین ارکان واعمال کی ادائیگی پر اکتفا کر لے اور بس، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین اسلام بھی چند عقائد اور مخصوص عبادتوں کا نام ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات وہدایات کا صرف ایک چوتھائی حصہ عقائد وعبادات پر مشتمل ہے، اور بقیہ تین چوتھائی تعلیمات معاملات، اخلاق اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

اسلام نے معاشرت سے متعلق جتنے بھی احکام دیے ہیں ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی بھی انسان کو کسی معقول وجہ کے بغیر کسی بھی قسم کی تکلیف نہ دی جائے، یہ

معاشرتِ اسلامیہ کا بنیادی اصول اور نشان ہے، جس سے ایک مسلمان پہچانا جاتا ہے، اس کے برخلاف اگر کوئی مومن کسی معقول وجہ کے بغیر اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف دے وہ قانونی اور ظاہری اعتبار سے خواہ مسلمان ہی کہلائے، لیکن حقیقی اعتبار سے کامل اور مکمل مسلمان بن نہیں سکتا، قرآن وسنت کی تعلیمات وہدایات ایک مومن ومسلمان سے اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ایک طرف تو وہ عقائد واعمال کے لحاظ سے اللہ کا سچا بندہ کہلانے کا مستحق ہو، اور دوسری طرف وہ اخلاق کے لحاظ سے اللہ کی مخلوق کے لیے پوری طرح امن وسلامتی، خیر خواہی اور نفع رسانی کا ذریعہ ہو، اس کی عملی اور معاشرتی زندگی ایسی ہو کہ ہر کوئی اس سے دور ہونے کے بجائے قریب ہو، نفرت کرنے کے بجائے محبت کرے، خوف زدہ ہونے کے بجائے اس کو اپنا ہمدرد، خیر خواہ اور نفع رساں سمجھے، اور کیا مال وجان، کیا عزت وآبرو، ہر معاملہ میں اس پر پورا اعتماد واطمینان رکھے، اسی کو حدیث کے اخیر میں "وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَ أَمْوَالِهِمْ" کے ذریعہ بیان فرمایا ہے۔

کیوں کہ بقولِ شاعر:

تو نہیں ہے اس جہاں میں منہ چھپانے کے لیے
تو نمونہ بن کے آیا ہے زمانے کے لیے

دین اسلام کی ساری معاشرتی تعلیمات وہدایات اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں کہ ہر مسلمان اپنے ہر ہر قول وعمل میں اس قدر احتیاط کرے کہ اس کی کسی نقل وحرکت اور انداز وادا سے کسی دوسرے کو کسی بھی قسم کی جسمانی، قلبی، ذہنی، نفسیاتی، یا مالی تکلیف نہ پہنچے۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گذرے ☆ کہ یہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

ہمارے آقا ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ اور صلحاء کی زندگی ایسی ہی تھی، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ہمیں اس حدیث کے ذریعہ گویا ایک آئینہ دے دیا گیا، اس آئینہ میں ہم خود کو دیکھیں کہ ہم کیسے ہیں؟

افسوس، صد افسوس! آج صورتِ حال عموماً یہ ہو چکی ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے ان ہدایات وتعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، اور اپنی شان و پہچان کو مٹا دیا، بلکہ اپنی بدعملی و بداخلاقی سے دین اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا ذریعہ بن گئے، بقولِ شاعر:

نہ محبت، نہ مودّت، نہ شرافت، نہ خلوص ☆ ہم بھی شرمندہ ہیں اس زمانہ میں مسلماں ہو کر

اور بقولِ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر ☆ اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اس لیے ضرورت ہے بھولے ہوئے سبق کو پھر دہرانے اور یاد کرنے کی، تاکہ کھوئی ہوئی شان اور پہچان بحال ہو جائے، اور ہمیں خاتمہ بالایمان نصیب ہو۔

اللہ پاک ہمیں اور ہماری قیامت تک کی نسلوں کو سچا، پکا اور کامل ومکمل مسلمان بنا کر ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

۲۶/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۵ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۲۵/ جولائی/ ۲۰۱۴ء
مسجدِ شیخ زکریا، خانقاہِ (قدسیہ) فیضانِ قمر جامعہ سراج العلوم، اُجین

(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۷)

صحبتِ صالحین کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَ السُّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْکِ وَ نَافِخِ الْکِیْرِ، فَحَامِلُ الْمِسْکِ إِمَّا أَنْ یُحْذِیَکَ، وَ إِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْہُ، وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا طَیِّبَةً، وَ نَافِخُ الْکِیْرِ إِمَّا أَنْ یُحْرِقَ ثِیَابَکَ، وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا خَبِیْثَةً." (متفق علیہ، مشکوٰۃ/۴۲۶)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ''اچھے اور برے ہم نشین (ساتھی) کی مثال ایسی ہے جیسے مشک رکھنے والا اور بھٹی جلانے والا، مشک رکھنے والا (اگر تمہارا ساتھی ہوگا تو) یا تو تمہیں مشک دے گا، یا تم اس سے مشک خرید لوگے، یا کم از کم اس کی خوشبو سے تمہارا دل ودماغ معطر ہو جائے گا، (بہر صورت اس کی خوشبو سے تمہیں ضرور نفع حاصل ہوگا، بالکل اسی طرح نیک ساتھی کا حال بھی ہے کہ اس کی ہم نشینی اور صحبت سے تمہیں دینی اور اُخروی اعتبار سے بہر صورت نفع ہوگا، اس کے برخلاف) بھٹی جلانے والا (اگر تمہارا ساتھی ہوگا) تو وہ تمہارا کپڑا جلا دے گا، یا کم از کم اس کی دِل آزار بدبو سے تمہیں ضرور ہی واسطہ پڑے گا۔'' (یہی مثال برے ساتھی کی ہے کہ اس کی صحبت سے

تمہیں دینی، دنیوی اور اُخروی اعتبار سے ضرور نقصان ہوگا، ورنہ کم از کم جتنی دیر اس کی صحبت میں رہوگے اتنا وقت ضائع ہوگا)۔

منزلِ سعادت تک رسائی کا ذریعہ صالحین کی صحبت ہے:

اللہ رب العزت کی رضا ورحمت ہماری منزلِ سعادت ہے، اس منزلِ سعادت تک رسائی کا آسان طریقہ وذریعہ صالحین کی صحبت ہے، جس کی سب سے بہترین مثال حضراتِ صحابہؓ ہیں، وہ منزلِ سعادت کے جن اعلیٰ مقامات ودرجات تک پہنچے وہ سید المرسلین ﷺ کی صحبت ہی کی برکت تھی، اور اسی صحبت کے نتیجہ میں وہ ''صحابہ'' کہلائے، ''صحابی'' کہتے ہیں صحبت یافتہ کو، حضراتِ صحابۂ کرامؓ کو سید الانبیاء ﷺ کی صحبت حاصل ہوئی، جس کے نتیجہ میں اُنہیں علمِ نبوت اور ولایت کے تمام مراتب حاصل ہوئے، حضور ﷺ کی چند لمحوں کی صحبت سے اُن میں سے ادنیٰ درجہ کے صحابی کو بھی وہ مقام حاصل ہے جو حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے لاکھوں اولیاء اللہ کو ساری زندگی کی عبادتوں وریاضتوں کے بعد بھی نہ مل سکا، اس لیے ان کا سب سے بڑا رتبہ ومقام نہ غوث وقطب ہونا تھا، نہ مفتی وعالم ہونا تھا، بلکہ اُن کا اصل رتبہ وشرف صحابیٔ رسول ﷺ ہونا تھا، چوں کہ اللہ کے اِن برگزیدہ بندوں کو سید الانبیاء ﷺ کی صحبت حاصل تھی، اس لیے عاجز کے خیالِ ناقص میں فارسی کے مشہور شعر میں ذراسی ترمیم کے ساتھ اُن کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہنا صحیح ہے کہ:

یک زمانہ صحبت با انبیا ☆ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیوں کہ جب ''یک زمانہ صحبت با اولیاء'' کو ''بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا'' کہا گیا ہے تو ''صحبت با انبیاء'' تو اُس سے کئی درجہ افضل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس صحبت کے نتیجہ میں صحابۂ کرامؓ بآسانی منزلِ سعادت تک پہنچ گئے، قرآنِ پاک کا حکم ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا﴾ (فرقان/۵۹) (رحمٰن (کی رضا ورحمت) کا راستہ کسی باخبر سے پوچھو!) علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں ''خَبِيْرًا'' سے مراد ''الْعَارِفُوْنَ'' ہیں، یعنی جن باخبر لوگوں

سے اللہ کی رضا ورحمت کا راستہ معلوم کرنے کا حکم ہے ان سے مراد وہ ہیں جو اللہ کی معرفت رکھتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی صحبت سے اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے، اس لیے اس کا حکم دیا گیا۔ (مستفاد از خزائن القرآن/۲۴۸)

واقعہ یہی ہے کہ آج بھی اگر خوش نصیب انسان کو صالحین کی صحبت مل جائے تو یقیناً اس کے لیے منزلِ سعادت تک رسائی آسان ہو جائے۔

صحبت کا اثر مسلّم ہے:

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ صحبت کا اثر مسلّم ہے، چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''، اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوہا جب آگ کی بھٹی میں رکھا جاتا ہے، تو چند منٹ میں وہ آگ کا اثر قبول کر کے آگ ہی کی طرح سرخ، گرم اور روشن ہو جاتا ہے، اسی طرح غور کیجیے کہ ایک بے جان وبے حس انڈے کو مرغی کی چند روزہ رفاقت، صحبت اور معیت میسر آتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ایک حساس وجاندار چوزہ کے روپ میں خالق کائنات کی بے مثال قدرت وصناعی (کاریگری) کا ایک شاہ کار اور نمونہ وجود میں آجاتا ہے، اور دنیا دیکھتی ہے کہ ایک بے عقل وفہم جاندار کی صحبت سے بے جان وبے شعور انڈے میں صرف جان ہی نہیں پڑتی، بلکہ وہ شعور وآگہی کی اس منزل کو پہنچ جاتا ہے کہ اپنی ننھی وناتواں چونچ کی ضربوں سے انڈے کی ''چھوٹی دنیا'' یا ''بچہ جیل'' کا حصار اور بقولِ خطیب الامت حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دھولیوی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ''وہائٹ ہاؤس'' (White house) توڑنے کی صلاحیت وقوت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے عقل کہلاتی ہیں جب ان کا ''ساتھ'' رنگ واثر دکھاتا ہے اور ان کی رفاقت وصحبت سے ایسے ایسے انقلاب برپا ہوتے ہیں، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ صحبتِ صالحین اپنے مصاحبین پر اثر انداز نہ ہو؟ اور کیسے ممکن ہے کہ صالحین کی روحانی قوت اور ربانی معرفت مردہ دلوں میں ایمانی فراست وبصیرت کی تخم ریزی نہ کرے؟ کیوں کہ

صالحین کو تقویٰ اور تعلق مع اللہ نصیب ہوتا ہے، اس لیے ان کی صحبت سے عموماً تقویٰ اور تعلق مع اللہ بآسانی نصیب ہو جاتا ہے۔

صحبت کی مثال:

اس حقیقت کو حضور ﷺ نے حدیثِ مذکور میں ایک عام فہم مثال سے سمجھا دیا کہ "مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَ السُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِخِ الْكِيْرِ" اچھے اور برے ساتھی اور ان کی صحبت کی مثال عطر فروش اور بھٹی دہکانے والے کی سی ہے، اگر کسی کو عطر فروش کا ساتھ، اس کی صحبت اور رفاقت نصیب ہو جائے تو "فَحَامِلُ الْمِسْكِ إِمَّا أَنْ يُحْذِيَكَ، وَ إِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبَةً" تین باتوں میں سے کوئی بات ضرور ہوگی: (۱) یا تو وہ تمہیں اس صحبت و رفاقت کی وجہ سے خوشبو پیش کرے گا، یا تو پوری بوتل ہی دے گا، یا پھر کم از کم اُس میں سے کچھ استعمال کے لیے دے گا۔ (۲) یا پھر تم خود اس سے عطر خرید کر اسے استعمال کرو گے۔ (۳) اور اگر تمہارے عطر فروش ساتھی نے تمہیں نہ عطر دیا، نہ تم نے اس سے لیا، پھر بھی کم از کم اس کی قربت وصحبت سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ عطر کی خوشبو سے تمہارا دل و دماغ معطر ہو جائے گا، بلکہ اس کی خوشبو کا ایک جھونکا بھی تمہیں ضرور راحت و فرحت بخشے گا، بہر حال خوشبو والے کی صحبت و رفاقت میں بیٹھنے والا اس کی خوشبو سے ضرور مستفید ہوتا ہے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی بھٹی جلانے والے کی معیت وصحبت میں بیٹھتا ہے، تو اسے "وَ نَافِخُ الْكِيْرِ إِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ، وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا خَبِيْثَةً." یا تو آگ سے نقصان ہو سکتا ہے، یا کم از کم اس کی بدبو اور گرمی سے تو ضرور واسطہ پڑے گا، یہی حال اچھے برے لوگوں کی صحبت اور ان کے ساتھ نشست و برخاست کا ہے۔

حدیثِ پاک میں بیان کردہ حقیقت کی ایک بہترین مثال سگِ اصحابِ کہف اور پسرِ نوح بھی ہیں، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ جو شخص سچے اور اچھے لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے تو عطر فروش کی طرح یہ لوگ بھی از خود اسے سچائی اور اچھائی کی باتیں بتلا کر اس کی طرف مائل

کرتے ہیں، یا یہ صحبت میں رہنے والا ان سے سچائی اور اچھائی کی باتیں و راہیں معلوم کر کے اس کی طرف مائل ہوتا ہے، یا کم از کم سچے اور اچھے لوگوں پر اللہ کی رضا و رحمت کی خوشبودار ہوائیں چلتی ہیں، اُن متبرک ہواؤں کا کوئی نہ کوئی جھونکا ان کی صحبت میں رہنے والے کو بھی ضرور نصیب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے دِل میں نیکی کے خیالات و جذبات پیدا ہوتے ہیں، غرض سچے اور اچھے لوگوں کی صحبت میں رہنے والا سچائی، اچھائی اور نیکی سے ضرور مستفید ہوتا ہے، محروم نہیں رہتا۔

صالحین کا جلیس بھی سعید بن جاتا ہے:

حدیثِ قدسی سے ثابت ہوتا ہے کہ صالحین کا جلیس بھی سعید بن جاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ "هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" (بخاری، مشکوٰۃ/۱۹۷) (حدیثِ قدسی نمبر:۴)

علاوہ ازیں صحبتِ صالحین کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان کی صحبت دارین کی سعادت کا سبب ہے، صالحین کی صحبت سے شقی بھی عموماً سعید بن جاتا ہے۔ جیسے حضراتِ صحابہؓ سب کے سب سعید تھے، تو وہ سید الانبیاء ﷺ کی صحبت کی برکت تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سعید بنانا چاہتے ہیں، اس لیے قرآنِ کریم میں ہمیں خصوصی حکم دیا کہ تم بھی صحبتِ صالحین اختیار کر کے سعید بن جاؤ، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ (التوبۃ/۱۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (یہ بات اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے) سچوں کے ساتھ رہو۔

مطلب یہ ہے کہ اے میرے بندو! تم خواہ گناہوں کی وجہ سے کتنے ہی گندے کیوں نہ ہو جاؤ، مگر جب تم میرے پیاروں کی صحبت میں رہو گے تو ان کی معیت وصحبت سے تم میں بھی سچائی، اچھائی اور پرہیز گاری پیدا ہو جائے گی اور تم سعید بن جاؤ گے، اس کی کئی مثالیں اور شواہد موجود ہیں۔

فیضانِ صحبتِ صالحین کا واقعہ :

ایک عجیب وغریب واقعہ منقول ہے، حضرت عبید بن عمیرؒ مشہور تابعی گذرے ہیں، اللہ نے ان کو بڑی فصیح زبان عطا فرمائی تھی، جس کی وجہ سے مشہور صحابیٔ رسول ﷺ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کی مجلس اور صحبت میں بیٹھا کرتے تھے، بعض اوقات ان کی دل پر اثر کرنے والی گفتگو سے پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے، ان کے زمانہ میں مکہ کی ایک جوان شادی شدہ عورت تھی، جس کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حسن سے نوازا تھا، (یہ حسن بھی بڑی عجیب چیز ہے، بعض اوقات بڑے بڑے بہادر، پہلوان اور سورما کسی حسینہ کی ایک ’’نگاہِ غلط انداز‘‘ کے وار سے ڈھیر ہوکر زخمی اور گھائل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں) یہ خاتون اپنے شوہر کی موجودگی میں ایک مرتبہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر شوہر سے کہنے لگی: ’’کوئی شخص ایسا ہوسکتا ہے جو میرا یہ حسین چہرہ دیکھے اور اس پر فریفتہ نہ ہو؟‘‘ شوہر نے کہا: ’’ہاں، ایک شخص ہے‘‘ کہنے لگی: ’’کون؟‘‘ کہا: ’’حضرت عبید بن عمیرؒ ‘‘ اسے بھی شرارت سوجھی، کہنے لگی: ’’اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ابھی اُنہیں اسیرِ محبت بنائے دیتی ہوں‘‘ شوہر نے پتہ نہیں کس خیال میں اجازت دے دی۔

وہ عورت حضرت عبید بن عمیرؒ کے پاس آئی اور کہا: ’’حضرت! مجھے تنہائی میں ایک مسئلہ پوچھنا ہے‘‘ چنانچہ آپ مسجدِ حرام کے ایک گوشہ میں اس کے ساتھ الگ کھڑے ہوگئے، تو فوراً اس عورت نے اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیا، جس کی وجہ سے اس کا چاند سا چہرہ قیامت ڈھانے لگا، حضرت عبید بن عمیرؒ نے اُسے بے پردہ دیکھ کر فرمایا: ’’اللہ کی بندی! اللہ سے ڈر، مگر وہ حسینہ (اشارہ وکنایہ میں بدکاری کی دعوت دیتے ہوئے) کہنے لگی: ’’میں آپ پر فریفتہ ہوگئی ہوں، لہٰذا آپ میرے متعلق غور کر لیجئے‘‘ حضرت عبیدؒ اس کے جھانسے میں کب آنے والے تھے؟ آپ نے فرمایا: ’’میں تجھ سے چند سوالات پوچھتا ہوں، اگر تو نے صحیح اور درست جوابات دیے تو میں تیری دعوت پر غور کرسکتا ہوں‘‘ اس نے ہامی بھری، تو فرمایا

:’’موت کا فرشتہ روح قبض کرنے آجائے، تو کیا اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا؟‘‘ کہنے لگی: ’’ہرگز نہیں‘‘ فرمایا: ’’جواب درست ہے‘‘ پھر سوال کیا: ’’لوگوں کو ان کے اعمال نامے دیے جارہے ہوں، اور تجھے اپنے اعمال نامے کے متعلق معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں ہاتھ میں، اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا؟‘‘ کہنے لگی: ’’ہرگز نہیں‘‘ فرمایا: ’’جواب درست ہے‘‘ ارشاد ہوا: ’’پل صراط کو عبور کرتے وقت تجھے اس گناہ کی خواہش ہوگی؟‘‘ کہنے لگی: ’’بالکل نہیں‘‘ فرمایا: ’’جواب درست ہے‘‘ پھر فرمایا: ’’جس وقت تو اللہ کے روبرو سوال و جواب کے لیے کھڑی ہوگی، تب تجھے اس گناہ کی رغبت ہوگی؟‘‘ کہنے لگی: ’’بالکل نہیں‘‘ فرمایا :’’جواب درست ہے‘‘ اس کے بعد اس عورت سے آپؒ نے فرمایا: ’’اللہ کی بندی! اللہ سے ڈر، اللہ نے تجھ پر انعام واحسان کیا ہے، اس کی نافرمانی نہ کر‘‘۔

جانتے ہو حضرت عبید بن عمیرؒ کی اس تھوڑی سی صحبت وجامع نصیحت کا کیا اثر ہوا؟ جب وہ عورت اپنے شوہر کے پاس گھر لوٹی تو اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی، اب دنیوی لذتیں اور شہوتیں اسے بے حقیقت معلوم ہونے لگیں، شوہر نے پوچھا: ’’کیا ہوا؟‘‘ کہنے لگی: ’’اگر مرد عبادت گزار اور پرہیزگار بن سکتے ہیں، تو ہم عورتیں کیوں نہیں بن سکتیں؟‘‘ اس کے بعد تو واقعی وہ عورت نماز، مناجات اور عبادات میں منہمک ہوکر ایک عابدہ اور متقیہ بن گئی، اس کا آزاد منش شوہر اس کی یہ حالت دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ ’’مجھے عبید بن عمیرؒ کے پاس بیوی کو بھیجنے کا کس نے مشورہ دیا تھا؟ جس کی وجہ سے اس میں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی، پہلے ہماری ہر شب شبِ زفاف تھی، اب ہر شب شبِ عبادت بن گئی۔

(کتاب الثقات للعجلی: ۲/ ۱۱۹، از ’’کتابوں کی درسگاہ میں‘‘)

اسی لیے اکبر الہ آبادیؒ فرماتے ہیں کہ:

نہ کتابوں سے، نہ وعظوں سے، نہ زر سے پیدا ☆ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس شعر کے متعلق عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ کتابیں اور نصیحتیں اگرچہ مفید ہیں،

مگر بزرگوں کی صحبتیں مفید ترین ہیں، کتابوں اور نصیحتوں سے بھی ذہن سازی ہوتی ہے، لیکن بزرگوں کی صحبت سے مردم سازی ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو بزرگوں کی تھوڑی سی صحبت سے بھی زندگی میں ایک صالح انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

صحبتِ صالحین صلاح وفلاح کی اساس اور جڑ ہے:

حدیثِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ نظر کا لگنا برحق ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "اَلْعَيْنُ حَقٌّ".

(مسلم، مشکوٰۃ:۳۸۸، کتاب الطب والرقیٰ)

صاحبو! اگر بری نظر لگ سکتی ہے تو اچھی نظر بھی اپنا اثر دکھاتی ہے، بری نظر سے اگر انسان بیمار ہو سکتا ہے تو اچھی نظر سے دل کا روحانی بیمار تندرست بھی ہو سکتا ہے، اسی کو کہنے والے نے کہا:

جو ہو ذوقِ یقین پیدا، تو کٹ سکتی ہیں زنجیریں ☆ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اور جب بزرگوں کی ایک نظر اتنی مؤثر ہو سکتی ہے تو صحبت تو بدرجۂ اولیٰ مؤثر ہوگی۔
ہمارے حضرت شیخ الزماں مولانا محمد قمر الزماں مدظلہ فرماتے ہیں کہ "ایک بزرگ فرماتے تھے: "اگر مجھے جمعہ کی ساعتِ اجابت کسی طرح معلوم ہو جائے تو میں اس قبولیت والی گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے صحبتِ صالحین کی دعا کروں گا، اس لیے کہ یہ تمام صلاح وفلاح کی اساس اور جڑ ہے۔" غالباً اسی لیے علماءِ مفسرین نے صحبتِ صالحین کو دنیا کی بہترین چیزوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرۃ/۲۰۱)

اس میں دارین کی بھلائی اور بہتری کی دعا ہے، اب آخرت کی بھلائی وبہتری تو بلا حساب وکتاب دخولِ جنت ہے، لیکن دنیا کی بھلائی وبہتری سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں علامہ آلوسی بغدادیؒ صاحبِ روح المعانی نے فرمایا کہ "دنیا کی بھلائی اور بہتری میں دس

چیزیں داخل ہیں: (۱) اَلْعَافِيَةُ وَالْكَفَافُ : عافیت اور کفایت، یعنی عافیت کی نعمت بھی ملے، اور اتنی حلال روزی ملے جو کافی ہو جائے۔ (۲) اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ : نیک بیوی کا ملنا۔ (۳) اَلْعِلْمُ وَ الْعِبَادَةُ : حصولِ علم وعبادت کی توفیق ملنا۔ (۴) اَلْمَالُ الصَّالِحُ : حلال روزی کے ذریعہ مالداری۔ (۵) اَلْأَوْلَادُ الْأَبْرَارُ : نیک اولاد کا ملنا۔ (۶) ثَنَاءُ الْخَلْقِ : مخلوق میں نیک نامی حاصل ہونا۔ (۷) الصِّحَّةُ وَالْكِفَايَةُ : تندرستی اور بقدرِ کفاف روزی کا مل جانا۔ (۸) النُّصْرَةُ عَلَى الْأَعْدَاءِ : کبھی اگر دشمنوں کا سامنا ہو تو نصرتِ الٰہی کا تمہارے ساتھ ہونا۔ (۹) اَلْفَهْمُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ : کتاب اللہ کی فہم وفراست کا میسر آنا۔ (۱۰) صُحْبَةُ الصَّالِحِيْنَ : صالحین کی صحبت کا ملنا۔" (روح المعانی:۹۱/۲)

یہ تمام چیزیں دنیا کی بھلائی وبہتری کی نشانیاں ہیں، جن میں صحبتِ صالحین بھی داخل ہے، لہٰذا جس کو صحبتِ صالحین حاصل ہوگئی وہ ان شاء اللہ العزیز دارین کی بھلائی سے مالا مال ہوگا۔

ایک حکایت وحقیقت:

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ/۱۱۹) دارین کی بھلائی وکامیابی کے خواہش مند ایمان والو! صالحین کی صحبت اختیار کرو تا کہ صحبتِ صالحین کی برکت سے تمہیں بھی تقویٰ اور تعلق مع اللہ (جو فلاحِ دارین کا سرچشمہ ہے) نصیب ہو جائے۔

دانائے رومؒ نے اس حقیقت کو ایک حکایت کے ذریعہ یوں بیان کیا کہ "ایک چیونٹی کے دل میں بیت اللہ جانے کی نیک خواہش پیدا ہوئی، مگر وہ مسکین اتنا طویل فاصلہ کس طرح طے کرتی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی طلبِ صادق کے نتیجے میں حرم شریف کے ایک کبوتر کو اس کے پاس فلائٹ بنا کر بھیج دیا، وہ اس کے قدموں سے چمٹ گئی، کبوتر اسے لے کر اُڑا، پھر شہروں، صحراؤں، سمندروں اور پہاڑوں کو چیرتا ہوا سیدھا منزلِ سعادت پر جا پہنچا۔"

مولاناؒ فرماتے ہیں:

مورِ مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد　　دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

ایک مسکین چیونٹی کے دِل میں جب بیت اللہ جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، تو اس نے (حرم کے) کبوتر کے پاؤں پکڑ لیے اور منزلِ سعادت تک پہنچ گئی، اگر حرم کے کبوتر سے تعلق قائم کرنے والی چیونٹی حرمِ کعبہ تک پہنچ سکتی ہے، تو تم بھی اللہ والوں سے تعلق قائم کر کے اللہ تک پہنچ سکتے ہو، یہی تو ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کا راز ہے کہ تعلق مع اللہ والوں سے تم بھی تعلق پیدا کروگے تو تمہیں بھی ان کی برکت سے تقویٰ اور تعلق مع اللہ نصیب ہوگا؛ کیوں کہ سونے کی کان میں سونا، لوہے کی کان میں لوہا اور کپڑے والوں کے یہاں کپڑا ملتا ہے، تو اللہ والوں کے یہاں اللہ اور اس کا تعلق ملتا ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں تین چیزیں دین میں پختگی کا سبب ہیں: (۱) اتباعِ سنت مع اخلاصِ نیت۔ (۲) ذکر اللہ کی کثرت۔ (۳) اہل اللہ کی صحبت۔

حسبِ فرصت بزرگوں کی تھوڑی صحبت بھی ضرور اختیار کریں۔

لہٰذا ان کی صحبت کا اہتمام کریں، لیکن اگر کسی کو مشغولیت کی وجہ سے مستقل اپنے شیخ وغیرہ کی صحبت میں رہنے کا موقع نہ ملے، تو کم از کم کبھی کبھی کچھ وقت کے لیے بھی حاضری دے دیا کرے، اور اپنے حالات سے انہیں باخبر کرکے اصلاح کی کوشش کرے، ان شاء اللہ اتنا بھی کافی ہوگا۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں: ”آج کل (شیخ سے فیض حاصل کرنے کی) استعداد اتنی کمزور ہوگئی کہ اکتسابِ فیض مشکل ہوگیا ہے، اس لیے شیخ کے پاس زیادہ وقت نہ گذارے، (کہ ہر وقت بس اُن سے چمٹا رہے) بلکہ حسبِ فرصت تھوڑے وقت کے لیے حاضر ہوکر اور ضروری بات کرکے واپس ہوجائے، پھر شیخ کی (شرعی) ہدایت کے موافق

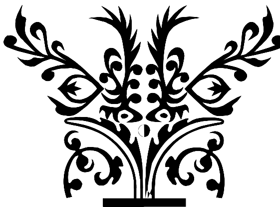
عمل کرتا رہے، اگر شیخ کی خدمت میں زیادہ رہے گا تو دو مہلک بیماریوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہوگا: (۱) یا تو اپنے شیخ کی عبادت کو کم سمجھ کر شیخ سے بدظن ہوجائے گا، جو بڑی محرومی کا سبب ہے۔ (۲) یا اُن کی عبادت واعمال کو زیادہ سمجھ کر اپنے شیخ ہی کو بہت کچھ سمجھ لے گا، اور دوسرے مشائخ کو حقیر جانے گا، تو اس کا بھی مہلک ہونا ظاہر ہے۔“ (سلوک واحسان/۲۵۳)

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھائیں اور ہمیں اپنا صحیح تعلق نصیب فرماکر منزلِ سعادت تک پہنچائیں، آمین۔

۴/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۵ھ/ بروز: جمعرات
مطابق: ۳ جولائی/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۸)

خانقاہ کی حقیقت اور اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِذَا مَرَرۡتُمۡ بِرِيَاضِ الۡجَنَّةِ، فَارۡتَعُوۡا، قَالُوۡا: وَ مَا رِيَاضُ الۡجَنَّةِ ؟ قَالَ: حِلَقُ الذِّكۡرِ."

(ترمذی، مشکوٰۃ/۱۹۸، باب ذکر اللّٰہ عز وجل والتقرب إلیٰ اللّٰہ/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب تم جنت کے باغات سے گذرو تو خوب میوے کھاؤ!'' حضرات صحابہؓ نے (از راہِ تعجب) عرض کیا کہ ''جنت کے باغات کیا ہیں؟'' تو فرمایا کہ ''ذکر کے حلقے۔''

انسان کی فلاح نفس کی اصلاح میں پوشیدہ ہے:

اللہ رب العالمین نے نفس انسانی میں طاعت ومعصیت اور نیکی وبدی کی صلاحیتیں پیدا فرما کر اسے خیر وشر کا سنگم بنا دیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا برے سے برا انسان نیکی پر قادر ہے، تو اچھے سے اچھا انسان بدی سے عاجز بھی نہیں ہے، ہم انسان ہیں، فرشتہ نہیں کہ ہم سے گناہ نہ ہوں، لیکن شیطان بھی نہیں کہ توبہ نہ ہو، اور دل کبھی بدی سے خالی ہی نہ ہو، اب اگر دنیا

کا انسان اس دار الامتحان میں فلاح یاب اور کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ نفس میں پیدا ہونے والے نیکی کے خیالات وجذبات کو روبعمل لائے، اور بدی کے خیالات وتقاضوں کو دبانے کی کوشش کرے، اس کے باوجود کبھی نفسانیت وشہوت کے تقاضے سے معصیت صادر ہو جائے، تو توبہ کر کے اپنے نفس کا تزکیہ واصلاح کر لے، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو مسلسل سات قسمیں کھا کر اس طرح بیان فرمایا: ﴿قَدۡ أَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا﴾ (الشمس/۹-۱۰) فلاح اسے (ہی) ملے گی جو نفس کی اصلاح کر لے، یعنی نفس امارہ پر محنت وکوشش کر کے اسے نفس لوامہ بلکہ مطمئنہ بنا لے، لیکن اگر نفس کی اصلاح نہ کی اور نفس امارہ کے تقاضوں پر عمل کرتا رہا تو ﴿وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا﴾ نامراد ہوگا وہ جو نفس کو گناہ میں دھنسائے اور پھنسائے رکھے، العیاذ باللہ العظیم۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح نفس کی اصلاح میں پوشیدہ ہے، اصلاحِ نفس کے بغیر کوئی بھی انسان حقیقی اعتبار سے نہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ قربِ الٰہی۔

کسی نے خوب کہا ہے:

بعلم اللہ! راہِ خدا از دو قدم بیش نیست — یک قدم بر نفس نہ و دیگر بر کوئے دوست

ترجمہ: اللہ کے علم کی قسم! اللہ (کے قرب) کا راستہ بہت دور نہیں، بلکہ قریب ہے، بس ایک قدم خواہشاتِ نفسانی (جو مرضیاتِ ربانی کے خلاف ہوں ان) پر رکھو، تو تمہارا دوسرا قدم اللہ کی گلی (دربار) میں ہوگا، یعنی بس نفس کی اصلاح کر لو، پھر تمہیں اللہ کا قرب اور کامیابی نصیب ہو جائے گی۔

خانقاہ کا مطلب اور مقصد:

نفس کی اصلاح تو ایک انسان اللہ پاک کی توفیق سے کہیں بھی کر سکتا ہے، لیکن جس طرح دینی تعلیم وتعلم کا پاکیزہ سلسلہ مدارسِ دینیہ کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہے، کہ اُن کے

بغیر بھی اگرچہ تعلیم ممکن تو ہے مگر عادۃً آسان نہیں، اسی طرح اصلاحِ نفس اور تزکیۂ نفس کا سلسلہ خانقاہ کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہے، اس کے بغیر بھی اگرچہ تزکیۂ نفس ممکن تو ہے، مگر مشکل ضرور ہے، جب کہ خانقاہ کا ماحول سراپا اصلاح کا ہوتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے۔ پھر وہاں بزرگوں اور نیک لوگوں کا عموماً اجتماع ہوتا ہے، اس لیے توبہ اور نفس کے تزکیہ کا کام وہاں پر نہایت ہی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ویسے خانقاہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ ''درویشوں اور مشائخ کے رہنے کی جگہ'' (فیروز اللغات: ۵۸۳) اور ہماری اصطلاح میں جس جگہ اللہ والے یا اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر نفس کی اصلاح اور ذکر اللہ کے لیے قیام کیا جاتا ہے، اسے خانقاہ کہتے ہیں؛ کیوں کہ خانقاہ کا مقصد ہی تزکیۂ نفس اور تکثیر ذکر ہے، بقولِ مرشدی حضرت شیخ الزماں مولانا محمد قمر الزماں مدظلہٗ ''قیامِ خانقاہ کا اصلی مقصد تحسین اخلاق (تزکیۂ نفس) اور تکثیر ذکر ہے، اسی مقصد کے تحت خانقاہ کا قیام اور وہاں اجتماع کا التزام کیا جاتا ہے۔''

حکیم العصر حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ فرماتے ہیں:

اہلِ دل کے دل سے نکلے آہ آہ   بس وہی اخترؔ ہے اصلی خانقاہ

خانقاہ اصحابِ صفہ کی نقل ہے:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ تزکیۂ نفس (یعنی تعلیم و تربیت) اور تکثیر ذکر بھی ان عظیم مقاصد میں سے ہیں جن کے لیے عہدِ رسالت میں مختلف مقامات سے تشریف لا کر حضراتِ صحابہؓ مرشدِ اعظم رحمت عالم ﷺ کی صحبت میں مسجدِ نبوی کے قریب بنے ہوئے صفہ پر باقاعدہ قیام کا اہتمام فرماتے تھے، تو ان کے اس مبارک جذبہ کی قدر کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے خود حضور ﷺ کو صفہ میں قیام پذیر درویشانِ اسلام کے ساتھ مجالست، مدارات اور خاطر داری کا حکم فرمایا، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الکھف/۲۸)

ترجمہ: اور اپنے آپ کو استقامت (و اہتمام) کے ساتھ ان لوگوں کے پاس رکھو جو صبح و شام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ وہ اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کے ساتھ خود حضور ﷺ کو بیٹھنے کا حکم دیا گیا وہ اصحابِ صفہ تھے، جو درحقیقت اصحابِ کہف کا نمونہ تھے۔ چنانچہ طبرانی میں حضرت عبد الرحمٰن بن سہلؓ کی روایت ہے کہ جس وقت مذکورہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اس وقت آپ ﷺ اپنے حجرۂ مبارکہ میں تھے، فوراً آپ ﷺ ان حضرات کی تلاش میں نکلے، تو ایک جماعت کو ذکر اللہ میں مشغول اور اس حالت میں پایا کہ بعضوں کے بال بکھرے ہوئے، کھال بھی نہایت خشک اور بدن پر صرف ایک ہی کپڑا ہے، جب آپ ﷺ نے اُنہیں دیکھا، تو قریب آ کر بیٹھ گئے، پھر ارشاد فرمایا کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ أَمَرَنِيْ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِيْ مَعَهُمْ'' (ابن جرير والطبراني وابن مردويه، كذا في الدر، مستفاد از تصوف و سلوك/۸۴)

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے (جن کی دلجوئی و حوصلہ افزائی کے لیے خود) مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔

تو ان سے مراد وہی عہدِ رسالت کے درویش صحابہؓ ہیں جو تعلیم و تربیت کی غرض سے مسجدِ نبوی کے صفہ پر قیام فرماتے تھے، آج اسی نیک مقصد کے تحت طالبینِ صادقین اولیاء اللہ کی خانقاہوں میں قیام فرماتے ہیں، لہٰذا صاحبو! یہ خانقاہ کوئی خواہ مخواہ اور بے حقیقت چیز نہیں ہے، بلکہ یہ حضرات اصحابِ صفہ کی مقدس اصل کی مبارک نقل ہے، اور اس کا سلسلہ اسی خانقاہِ محمدی یعنی صفۂ نبوی میں مقیم اصحابِ صفہ اور ان کے مرشدِ کامل سے جا ملتا ہے، اگرچہ عہدِ رسالت میں خانقاہ کی اصطلاح نہ تھی، مگر اس کی حقیقت، اس کا مقصد اور مفہوم بلا شبہ موجود تھا، بزرگوں کی ان خانقاہوں میں بھی بحمد اللہ عہدِ رسالت کی طرح اُسی توبہ، نفس کی اصلاح اور ذکر اللہ والے پاکیزہ ماحول کی جھلک نظر آتی ہے، اور اسی کی برکت سے خانقاہ میں

مقیم طالبینِ صادقین کی اصلاح بآسانی ہوجاتی ہے۔

بنی اسرائیل کے قاتل کا قصہ :

یہ بات مسلم ہے کہ معاشرہ اور ماحول انسان کی کردار سازی اور تعمیرِ شخصیت میں بہت ہی اہم اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اگر کسی خوش نصیب کو پاکیزہ معاشرہ اور ماحول میسر آجائے تو اس کے لیے واقعی گناہوں سے بچنا اور نفس کی اصلاح کرنا آسان ہوجاتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصۂ قاتل سے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے، حدیثِ پاک میں بیان کردہ یہ واقعہ مشہور ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ ِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : "كَانَ فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَّ تِسْعِيْنَ إِنْسَانًا" حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی نے ننانوے ناحق قتل کیے، "ثُمَّ خَرَجَ يَسْأَلُ" ایک مرتبہ اس کے دل میں اپنی اصلاح اور توبہ کا خیال من جانب اللہ آیا، جس کی وجہ سے وہ لوگوں سے اس بارے میں پوچھنے لگا، "فَأَتٰى رَاهِبًا، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: أَلَهُ التَّوْبَةُ ؟ اسی دوران اس کی ملاقات ایک راہب (جو بے چارہ محض عابد تھا، مگر عالم نہ تھا، اس) سے ہوئی، سوال کیا کہ اتنے جرائم کے باوجود میرے لیے اصلاح وتوبہ کی کوئی گنجائش ہے؟ " قَالَ: لَا" اس نے فوراً ہی انکار کردیا، جس سے اس قاتل کو غصہ آگیا اور "فَقَتَلَهُ" اُس راہب کو بھی وہیں ڈھیر کردیا، اس طرح اس نے قتل ناحق میں سینچوری (سو کی تعداد) پوری کرلی، پھر خیال آیا کہ یا اللہ! یہ تو بہت ہی غلط ہوا، پھر احساسِ اصلاح وتوبہ میں اس نے کسی اور سے دریافت کیا، " وَ جَعَلَ يَسْأَلُ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: اِئْتِ قَرْيَةَ كَذَا وَ كَذَا" خوش قسمتی سے اب کی مرتبہ اس کو کسی نے بتلایا کہ تو اگر اپنی اصلاح اور توبہ چاہتا ہے تو صالحین کی فلاں بستی میں چلا جا اور وہاں صالحین کی صحبت میں رہ کر توبہ واصلاح کرلینا، تیرا کام بن جائے گا، گویا اس زمانہ کی خانقاہ کی طرف رہنمائی کردی، یہ سن کر وہ قاتل شخص چل پڑا، لیکن جب وہ آدھے راستہ کے قریب پہنچا تو اس کو اپنی موت کی علامت محسوس ہوئی، " فَأَدْرَكَهُ الْمَوْتُ، فَنَاءَ بِصَدْرِهِ نَحْوَهَا" لیکن اس طالبِ اصلاح و

توبہ نے اپنی کوشش برابر جاری رکھی، حتیٰ کہ مرتے مرتے اس نے اپنا سینہ صالحین کی اس بستی کی طرف جھکا دیا اور پھر اسی حالت میں اس کی روح قبض ہوگئی، پھر رحمت وعذاب کے فرشتے آکر آپس میں بحث کرنے لگے، "فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ" رحمت کے فرشتوں کا کہنا تھا کہ یہ اگرچہ قاتل تھا، مگر خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی اصلاح وتوبہ کے لیے صالحین کی بستی (اور خانقاہ) کی طرف متوجہ ہوگیا تھا، لہٰذا یہ تائب تھا، جب کہ عذاب کے فرشتوں کا کہنا تھا کہ اس نے اب تک سو افراد کے قتل کے باوجود توبہ نہیں کی تھی، لہٰذا اسے ہمارے حوالے کیا جائے، ہم اسے عذابِ الٰہی کی طرف لے جائیں گے، اب طالبِ توبہ واصلاح کے لیے اللہ کی رحمت کی وسعت دیکھئے!" فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلٰى هٰذِهٖ أَنْ تَقَرَّبِيْ، وَ إِلٰى هٰذِهٖ أَنْ تَبَاعَدِيْ" اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو جس کی طرف وہ توبہ اور اصلاح کی نیت سے جارہا تھا حکم دیا کہ وہ میت کے قریب آجائے، اور اس بستی کو جہاں سے وہ قتل کرکے آرہا تھا حکم دیا کہ وہ میت سے دور ہوجائے۔ طبرانی کی روایت میں ہے کہ نیک بستی کا نام "نَصْرَة" تھا اور بری بستی کا نام "كَفْرَة" تھا۔ (فتح الباری:۶/۵۱۷)

"فَقَالَ: قِيْسُوْا مَا بَيْنَهُمَا" پھر حق تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا: ان بستیوں کے درمیان پیمائش کرو، پھر مرنے والا جس بستی کے قریب ہوگا اسی کے مطابق رحمت وعذاب کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا، "فَوَجَدُوْا إِلٰى هٰذِهٖ أَقْرَبَ بِشِبْرٍ، فَغُفِرَ لَهٗ" (متفق علیہ، مشکوٰۃ/۲۰۳، باب الاستغفار والتوبۃ/الفصل الأول) (حدیث قدسی نمبر : ۵)

چنانچہ فرشتوں نے پیمائش کی، تو اپنی اصلاح وتوبہ کے ارادہ سے جس بستی کی طرف وہ چلا تھا اس کو ایک بالشت کے بقدر قریب پایا، لہٰذا رحمت کے فرشتوں کے حوالے کردیا گیا اور اس کی مغفرت کردی گئی۔

غور کیجیے کہ جب صالحین کی بستی میں سچی توبہ اور نفس کی اصلاح کی نیت سے محض جانے والا بھی محروم نہیں رکھا گیا، تو دورِ حاضر میں صالحین کی بستی یعنی خانقاہوں میں آنے والے طالبینِ صادقین کو کیوں کر محروم رکھا جائے گا! ضرور اُنہیں بھی نوازا جائے گا۔

خانقاہیں اور ریاض الجنۃ:

علاوہ ازیں خانقاہ میں وعظ ونصیحت اور تعلیم وتذکیر کے ذریعہ توبہ اورنفس کی اصلاح کے ساتھ ذکراللہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، اِسی لیے ارشادِ باری: ﴿فِیُ بُیُوُتٍ أَذِنَ اللّٰہُ﴾ سے مسجدیں اور خانقاہیں مراد ہیں۔ (معارف القرآن ادریسی : ۱۳۲/۵)

اور جہاں ذکراللہ کا اہتمام وحلقے ہوں، حدیث کے مطابق وہ جگہیں ’’ریاض الجنۃ‘‘ یعنی جنت کے گارڈنس اور باغات ہیں، اس اعتبار سے یہ خانقاہیں بھی ریاض الجنۃ ہیں، لہٰذا جس خوش نصیب کو خانقاہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوجائے وہ اس حدیث کو بھی ملحوظ رکھے جس میں حضور ﷺ فرماتے ہیں: ”إِذَامَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ، فَارْتَعُوا“ جب تم جنت کے باغات سے گذروتو خوب میوہ خوری کرو، خوف فائدہ اٹھاؤ، توصحابہؓ نے عرض کیا: ”وَ مَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ؟“ حضور! جنت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ ”قَالَ: حِلَقُ الذِّكْرِ“ فرمایا: ذکر کے حلقے، اور جب اس سے مراد ذکر کے حلقے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی ایسی مجلس وخانقاہ میں حاضر ہو جہاں لوگ اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں، تو تم بھی شریکِ مجلس بن کر ذکراللہ میں مشغول ہوجاؤ؛ کیوں کہ یہ ذکراللہ کے حلقے باغِ جنت اس لیے ہیں کہ اس کی وجہ سے ذاکر باغِ جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرلیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خانقاہیں تربیت گاہیں اور روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے شفاخانے اور جمالِ روحانی کے بیوٹی پارلر ہونے کے ساتھ جنت کے باغات بھی ہیں، یہاں کے نورانی ماحول میں آنے والا نفس کی اصلاح اور ذکراللہ کی برکت سے دارین میں فوز وفلاح کا مستحق بن جائے گا، ان شاءاللہ العزیز۔

حق تعالیٰ ہم تمام کو توبہ، استغفار، اصلاحِ نفس اور کثرتِ ذکر کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

۱۸/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۵ھ/ بروزِ منگل مطابق: ۱۷/ جون/ ۲۰۱۴ء (بزم صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۹)

ظلم اور ظالم کی مذمت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : "الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (متفق عليه، مشكوٰة ۴۳۴/باب الظلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ ’’ظلم قیامت کے دِن اندھیروں کی صورت میں ہوگا۔‘‘

ظلم کی حرمت:

اللہ رب العزت الرحمٰن بھی اور الرحیم بھی ہے، ارشاد ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (النمل/ ۳۰) یہ اس کی صفت رحمانیت ورحیمیت ہی کا نتیجہ ہے کہ بندوں کی مسلسل گندگیوں، نافرمانیوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ عموماً اُنہیں فوراً عذاب نہیں دیتا، بلکہ اُنہیں اپنی عنایتوں اور نعمتوں سے بھی محروم نہیں کرتا، البتہ ایک برائی اتنی شدید اور خطرناک ہے جس کو وہ کسی بھی بندے سے زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کرتا، اور وہ ہے ظلم وزیادتی، لغت میں کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹاکر رکھنا ظلم کہلاتا ہے، یہ بڑا جامع لفظ ہے، جو ہر اس فعل اور

چیز کو شامل ہے جو حد سے تجاوز کر جائے، یا واجب الذمہ حقوق میں کمی وکوتاہی کرنے کا نام ظلم ہے، اور واجب الذمہ حقوق تین ہیں، حقوق اللہ، حقوق النفس اور حقوق العباد، لہٰذا ان میں بھی کسی طرح کی کمی یا کوتاہی کرنا ظلم کہلاتا ہے، لیکن عام طور پر ہمارے عرف میں طاقت و صلاحیت کے غلط اور بے موقع استعمال کو ظلم کہا جاتا ہے، بہرحال ظلم جس شکل میں بھی ہو، حرام ہے، ایک حدیثِ قدسی میں ظلم کی حرمت بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْمَا يَرْوِيْ عَنِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى، أَنَّهُ قَالَ: "يَاعِبَادِيْ! إِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ، وَ جَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالَمُوْا." ...... الخ

(مسلم، مشکوٰۃ/۲۰۳/ باب الاستغفار) (حدیث قدسی نمبر: ٦)

اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم کو خود پر حرام کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہیں، وہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتے، اس کے یہاں عدل ہے یا فضل ہے، ظلم کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے، قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کو بیان کیا، ایک جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (النساء/٤٠) (اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا) دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ أَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ﴾ (الأنفال/٥١) (اور یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں ہیں) حدیثِ قدسی میں ہے: میرے بندو! جس طرح میں نے خود پر ظلم حرام کیا ہے اسی طرح تمہارے لیے بھی ظلم کو حرام کیا ہے: "وَ جَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا" لہٰذا اے میرے بندو! تم بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، "فَلَا تَظَالَمُوْا" اس کے باوجود اگر کوئی فرد یا گروہ کسی پر ظلم کرتا ہے، تو گویا وہ اللہ کی غیرت کو چیلنج کرکے اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے اور اس کے ہولناک عذاب کو دعوت دیتا ہے۔

ظلم کی مذمّت:

ظالم کو اللہ پاک اس دنیا میں ایک وقت تک کے لیے مہلت اور ڈھیل ضرور دیتے

ہیں، اس لیے یہ تو ممکن ہے کہ ظالم کو کچھ وقت مل جائے، لیکن جب ظالم اللہ پاک کی اس مہلت کو غفلت سمجھتے ہوئے ظلم وستم میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور ظلم سے باز نہیں آتا، تو پھر ایسے ظالم پر دردناک عذاب نازل ہوجاتا ہے، چنانچہ حدیثِ پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰی ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ الظَّالِمَ، حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَ كَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَآ أَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ (متفق علیه، مشکوٰۃ/٤٣٤/ باب الظلم)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ایک وقت تک مہلت دیتے ہیں، اس کے بعد جب اسے پکڑتے ہیں تو پھر چھوڑتے نہیں، اس بات کو بیان فرما کر رحمتِ عالم ﷺ نے قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَ كَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ ......الخ﴾ (ہود/۱۰۲) اور جب تمہارا رب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی سخت ہوا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی پکڑ بڑی شدید اور دردناک ہوتی ہے، اس کے آخری حصے میں مظلوم کے لیے تسلی اور ظالم کے لیے وعید ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ گناہوں کی اصل سزا تو آخرت میں ہی ملے گی، لیکن ظلم وزیادتی وہ بدترین برائی ہے کہ اس کا بدترین انجام جلد اسی دنیا میں ظالم کے سامنے آجاتا ہے۔

ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو قدرت کو جلال آتا ہے　　جب کوئی فرعون سر اٹھاتا ہے تو موسیٰؑ پیدا ہوتا ہے

ظالموں کے حالات اور ان کی ہسٹری دیکھئے تو یہ حقیقت ظاہر ہوجائے گی۔

ظالم کا ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں کئی عبرت ناک واقعات ہیں، مثلاً علامہ ابن حجرؒ اپنی کتاب ''الزواجر'' میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص جس کا ہاتھ کندھے سے کٹا ہوا تھا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''لوگو! مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرو، اور کسی پر ظلم نہ کرو'' کسی نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' تو اس نے اپنا درد بھرا عبرت ناک واقعہ بیان کیا کہ ''ایک مرتبہ میں نے ایک مچھیرے کو دیکھا

کہ وہ ایک بہترین اور بڑی مچھلی لے کر جارہا ہے، مجھے وہ مچھلی پسند آ گئی، میں نے اس سے وہ مچھلی لینا چاہا، مگر اس نے انکار کیا، تو میں نے ظلماً اس سے وہ مچھلی چھین لی اور لے کر چلتا بنا، جس وقت میں اسے لے کر جارہا تھا تبھی اس مچھلی نے میرے انگوٹھے میں زور سے کاٹ لیا، جس کی وجہ سے مجھے سخت درد ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ میرا پورا ہاتھ سوج گیا، رات بھر بے چینی میں گزار کر صبح طبیب کے پاس گیا، تو اس نے انگوٹھے کا معاینہ کرنے کے بعد کہا کہ ’’انگوٹھا سڑنا شروع ہوگیا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اُسے کٹوا دو، ورنہ پورا ہاتھ سڑ جائے گا‘‘ میں نے مجبوراً انگوٹھا کٹوا دیا، لیکن میری تکلیف پھر بھی ختم نہ ہوئی، سڑاند انگوٹھے کے بعد اب ہاتھ میں شروع ہوگئی، بالآخر پورے ہاتھ کو کٹوانے کی نوبت آئی، کسی نے اس کا سبب معلوم کیا تو میں نے اصل واقعہ بتلا دیا، اس نے کہا: ’’فوراً مچھلی والے سے جا کر اپنے کیے ہوئے اس ظلم و زبردستی کی معافی مانگ لو، شاید اس سے تمہاری تکلیف ختم ہو جائے‘‘ اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی، اور میں مچھیرے کی تلاش میں نکل گیا، تلاش و جستجو کے بعد میں نے اس سے معافی مانگی، اس نے میرا عبرت ناک انجام دیکھ کر مجھے اللہ کے لیے معاف کر دیا، اس کے بعد میں نے مچھیرے سے پوچھا کہ ’’جب میں نے تم سے مچھلی زبردستی چھین لی، اس وقت تم نے کیا مجھے کوئی بددعا دی تھی؟‘‘ اس نے کہا: ’’ہاں، میں نے کہا تھا: ’’اے اللہ! یہ اپنی طاقت سے مجھ پر غالب آ گیا، اور تو نے مجھے جو رزق دیا تھا وہ مجھ سے چھین لیا، اور ظلم کیا، لہٰذا اے اللہ! تو اس ظالم کو اپنی طاقت کا کرشمہ دکھا دے‘‘ یہ بات سن کر میں نے کہا: ’’بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاقت کا کرشمہ دکھا دیا، اور میں نے اپنے ظلم کے بھیانک انجام کو بھی دیکھ لیا، اب میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں کبھی بھی کسی پر ظلم نہیں کروں گا۔‘‘ (مستفاد از بکھرے موتی: ۵/ ۲۱ تا ۵/ ۲۲)

عربی زبان کا ایک شاعر کہتا ہے:

لَا تَظْلِمَنَّ إِذَا كُنْتَ مُقْتَدِرًا   فَالظُّلْمُ تَرْجِعُ عُقْبَاهُ إِلَى النَّدَمِ

ترجمہ: جب تمہیں اقتدار، حکومت اور قوت حاصل ہو تو کسی پر ہرگز ظلم نہ کرو؛ کیوں کہ اس کا انجام ندامت ہے۔

ظالموں کا انجامِ بد:

حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ظالموں کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝﴾ (الشعراء/ ۲۲۷) (اور جن لوگوں نے ظلم کیا وہ عنقریب جان لیں گے کہ وہ کیسی جگہ لوٹ کر جائیں گے) قیامت کے دِن ظالم اپنے انجامِ بد کو پا لے گا، بسا اوقات تو دنیا ہی میں ظالم کو اس کے ظلم کا کچھ نہ کچھ بدلہ مل ہی جاتا ہے، لیکن اگر بالفرض وہ دنیا میں کسی طرح بچ بھی گیا اور توبہ کیے بغیر مر گیا، تو آخرت کے عذاب سے ہرگز نہ بچ سکے گا، وہ دِن ظالم کے لیے بہت برا ہوگا، اور عموماً جب برا وقت آتا ہے تو دنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے کہ اس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا، سب لوگ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

بقولِ شاعر:

مشکل ہے ساتھ دے کوئی حالِ تباہ میں   سایہ بھی چھوڑ جاتا ہے روزِ سیاہ میں

اس حقیقت کے باوجود یہاں دنیا میں تو کوئی نہ کوئی اس کا یار و مددگار ہو سکتا ہے، لیکن قیامت میں تو ظالموں کا ہرگز کوئی یار و مددگار نہ ہوگا، حق تعالیٰ کا فرمانِ برحق ہے: ﴿مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾ (المؤمن/ ۱۸) (اس دن ظالموں کا نہ کوئی یار و مددگار ہوگا نہ سفارشی، جس کی بات مانی جائے) یعنی جو ظالم آج اپنی طاقت کے زور پر ظلم کر رہے ہیں کل قیامت کے دِن وہ خود کو کمزور اور مفلس محسوس کریں گے۔

قیامت میں ظالم کا حال:

قیامت میں ظالم کو جب عذابِ الٰہی چاروں طرف سے آ پکڑے گا، اُس وقت وہ روئے گا، چلائے گا، معافی مانگے گا، لیکن ان سب باتوں سے بھی اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا، اسے کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی مضمون کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا: ﴿لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ

مَـعْـذِرَتُـهُـمْ وَ لَـهُـمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُـمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (المؤمن/۵۲) (جس دن ظالموں کو ان کی معافی اور معذرت فائدہ نہ دے گی، اور ان پر لعنت ہوگی، اور ان کے لیے بہت برا گھر ہوگا) اس مضمون کو حدیثِ مذکور میں اس طرح بیان فرمایا کہ "الظُّـلْـمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" ظلم قیامت کے دن اندھیریوں کا باعث ہوگا۔ اس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ قیامت کا وہ سخت دِن جس میں حق تعالیٰ اس چمکتے ہوئے سورج کو بے نور کردیں گے۔ ﴿إِذَا الشَّـمْـسُ كُوِّرَتْ ۝﴾ (التکویر/۱) اس دِن اہل ایمان کے لیے ان کے اعمالِ صالحہ کا نور بنا کر اسے ان کے دائیں بائیں دوڑایا جائے گا۔ ﴿نُـوْرُهُـمْ يَسْـعٰـى بَيْـنَ أَيْـدِيْهِـمْ وَ بِـأَيْـمَـانِـهِـمْ﴾ (التحریم/۸) لیکن حدیثِ پاک کے مطابق ظالم اس دِن نور سے محروم ہوگا، اعمالِ صالحہ نور کا سبب ہوں گے، تو ظلم تاریکی کا، قیامت کے دن ظالم کو ہر طرف سے تاریکی گھیر لے گی۔ "الظُّـلْـمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کا ایک مطلب تو یہ ہے۔ لیکن حضرات محدثین نے اس کا دوسرا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ یہاں ظلم سے مراد مشکلات اور عذاب ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ایک جگہ ظلمات کا یہی معنیٰ مراد ہے، فرمایا: ﴿قُـلْ مَـنْ يُّـنَـجِّـيْـكُـمْ مِّـنْ ظُلُـمَـاتِ الْبَـرِّ وَ الْبَحْرِ﴾ (الأنعام/۶۳) (کہہ دیجیے: تمہیں جنگل اور دریا کی تکالیف اور مشکلات سے کون نجات دیتا ہے)۔ (اللہ ہی) تو جیسے یہاں ظلمات سے مراد تکالیف اور مشکلات ہیں، اسی طرح حدیثِ مذکور میں بھی ظلمات سے یہی مراد ہے، لہٰذا اب مطلب یہ ہوا کہ ظلم قیامت کے دن عذاب کا باعث ہوگا، ظالم کو چاروں طرف سے عذاب گھیر لے گا۔

صاحبو! اس دن کے آنے سے پہلے پہلے آج موقع ہے، اگر ہم سے نادانستہ طور پر کسی پر ظلم ہوگیا ہو، مظلوم خواہ کوئی بھی ہو، تو آج دنیا میں موت سے قبل پہلی فرصت میں ہی مظلوم سے معافی مانگ لیں، ورنہ حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ اگر ظلم سرزد ہوجانے کے بعد مظلوم سے معافی وتلافی نہ کی تو قیامت کے دن نیکیاں بھی ضائع ہوسکتی ہیں، چنانچہ رحمتِ عالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

عَـنْ أَبِـيْ هُـرَيْـرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَتْ لَهٗ

مَـظْلَمَةٌ لِأَخِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ، أَوْ شَيْءٌ، فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ، قَبْلَ أَنْ لَا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَّ لَا دِرْهَـمٌ، إِنْ كَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ، أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهٖ، وَ إِنْ لَّمْ تَكُنْ لَهٗ حَسَنَاتٌ، أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهٖ، فَحُمِلَ عَلَيْهِ." (مشکوٰۃ/۴۳۵، بحوالہ: بخاری)

ترجمہ: اگر تم میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے، یا اس کی آبروریزی کی ہے، یا کم از کم ظلم وزیادتی والی بات کہہ دی ہے، تو آج ہی معافی تلافی کرلے، اس دن سے پہلے پہلے جس دن درہم ودینار (اور روپیہ پیسہ) کام نہ آئے گا، اگر ظالم کے پاس اعمالِ صالحہ ہوں گے بھی تو اس کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی، اور اگر ظالم کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو ظالم پر مظلوم کے گناہ (ظلم کے بقدر) ڈال دیے جائیں گے۔ یعنی جس عذاب کا مظلوم مستحق تھا وہ عذاب بھی ظالم کو بھگتنا ہوگا، العیاذ باللہ۔

نقصانِ ظلم سے بچنے کا راستہ:

یہ کتنا بڑا خسارہ ہے، اس سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ظلم سے بچیں، اور اب تک کیے ہوئے ظلم کی مظلوم سے معافی مانگ لیں، اور یہ چیز خوفِ الٰہی اور تواضع وعاجزی کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے اللہ کا خوف، تواضع اور عاجزی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہر طرح کے معاصی اور ظلم وزیادتی سے ہماری حفاظت ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہر طرح کے معاصی اور ظلم سے ہماری اور قیامت تک کی نسلوں کی حفاظت فرمائے، آمین۔

۷/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۵ھ/ قبل الجمعہ

مطابق: ۳/ اکتوبر/ ۲۰۱۴ء (بزمِ صدیق)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۰)

اذان کے حقائق اور فضائل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ : " إِذَا نُوۡدِيَ لِلصَّلَاةِ، أَدۡبَرَ الشَّیۡطَانُ لَهٗ ضُرَاطٌ، حَتّٰی لَا یَسۡمَعَ التَّأۡذِیۡنَ، فَإِذَا قُضِيَ النِّدَاءُ أَقۡبَلَ، حَتّٰی إِذَا ثُوِّبَ بِالصَّلَاةِ، أَدۡبَرَ، حَتّٰی إِذَا قُضِيَ التَّثۡوِیۡبُ أَقۡبَلَ، حَتّٰی یَخۡطُرَ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ نَفۡسِهٖ، یَقُوۡلُ: " اُذۡكُرۡ كَذَا، اُذۡكُرۡ كَذَا،" لِمَا لَمۡ یَكُنۡ یَذۡكُرُ، حَتّٰی یَظَلَّ الرَّجُلُ لَا یَدۡرِیۡ كَمۡ صَلّٰی." (متفق علیه/ بخاری ۲/۸٤، ومسلم ۱/۲۹۱/مشکوٰة المصابیح : ٦٤)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے، تاکہ اذان کی آواز نہ سن سکے، جب اذان ختم ہوجاتی ہے تو پھر واپس آجاتا ہے، اور جس وقت اقامت ہوتی ہے تو پھر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے، جب اقامت ختم ہوجاتی ہے تو پھر واپس آجاتا ہے، تاکہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجائے، چنانچہ نمازی سے کہتا ہے: ''فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر،'' جو چیزیں نمازی کو یاد نہیں ہوتیں وہ یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ نمازی کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعات پڑھیں۔''

63

اذان کے معنیٰ اور حقیقت:

اللہ جل شانہٗ کی الوہیت وعظمت اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کی شان وشوکت اور غلبہ کی علامت، ساری انسانیت کے سامنے فلاحِ دارین کی دعوت اور اسلامی تعلیمات وحقائق کا مجموعہ وخلاصہ پیش کرنے کا جونہایت پاکیزہ اعلان اللہ کی طرف سے القاء والہام ہوا اُسے اذان کہتے ہیں، ویسے ''اذان'' کے معنیٰ اعلان کے ہیں، اور اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد وہ چند مخصوص کلمات ہیں جن کے ذریعہ فرض نمازوں کی اطلاع دی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اذان کے ان مخصوص کلمات میں نماز کی دعوت واعلان کے علاوہ توحید ورسالت کی حقیقت اور فلاحِ دارین کی دعوت کا ایک بلیغ اعلان بھی ہوتا ہے، اسی لیے ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ مَنۡ أَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَآ إِلَی اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ إِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۝﴾ (حٰمٓ السجدة / ۳۳)

اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے۔ علماءِ مفسرین کے قول کے مطابق اس میں دعوت کی تمام صورتیں داخل ہیں، جن میں سے ایک صورت اذان ہے، اِسی لیے اذان کے بعد کی دعا میں یہ الفاظ موجود ہیں:

" اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعۡوَةِ التَّآمَّةِ، وَ الصَّلَاةِ الۡقَائِمَةِ، اٰتِ مُحَمَّدَنِ الۡوَسِیۡلَةَ وَ الۡفَضِیۡلَةَ، وَ ابۡعَثۡهُ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدَانِ الَّذِیۡ وَعَدۡتَهٗ." (بخاری شریف، مشکوٰة المصابیح :٦٥)

(حدیثِ پاک میں ہے کہ اذان کے بعد اِس دعا کا اہتمام کرنے والے کے لیے شفاعت واجب ہوجاتی ہے۔)

اور ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول یہ آیت مؤذنین کے بارے میں نازل ہوئی، اس لیے "مَنۡ دَعَا إِلَی اللّٰهِ" سے مراد مؤذن ہے، اور اذان ایک دعوت و اعلان ہے، جس کے کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء والہام کیے گئے ہیں۔ (مستفاد از:

معارف القرآن: ۷/۶۵۲، وگلدستۂ تفاسیر: ۶/۳۱۴)

اذان کی ابتداء کا دلچسپ واقعہ:

اس کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے، جب تک رحمتِ عالم ﷺ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے تب تک مسلمانوں کی تعداد مختصر تھی، مسلمانوں کے ساتھ کفارِ مکہ انسانیت سوز مظالم کا مظاہرہ کر رہے تھے، ایسی حالت میں دعوتِ دین اور نماز کے لیے بشکل اذان اعلان کی علی العموم قدرت نہ تھی، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں جماعت کا اہتمام اور تاکید نہیں تھی، اور نہ علی العموم جماعت پر قدرت تھی، اس لیے جماعت کے واسطے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے اذان واعلان کی کوئی ضرورت نہ تھی، نماز کے وقت حضرات صحابۂ کرامؓ مسجد میں جمع ہو جاتے اور امام اعظم رحمتِ عالم ﷺ ان کے ساتھ نماز ادا فرما لیا کرتے تھے۔

ہجرت کے بعد جب مدینہ طیبہ میں کھلی فضا میسر آئی اور دِن بدِن مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی، اور نماز باجماعت کی تاکید کی گئی، تو اس وقت سب کو ایک خاص وقت پر جمع کرنے کے لیے ایسی صورت تجویز کرنے کی ضرورت پڑی کہ پہلے آنے والوں کو انتظار نہ کرنا پڑے اور بعد میں آنے والوں کو جماعت کے چھوٹنے کا خطرہ بھی نہ ہو، اور سب مل کر نماز باجماعت ادا کرلیں، اس کے لیے آپ ﷺ نے اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ نماز باجماعت کا وقت قریب ہونے کی عام اطلاع کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس پر حضراتِ صحابہؓ نے اس زمانے کے دیگر مذاہب کے مروّجہ طریقوں کے مطابق کسی نے آگ جلانے، کسی نے ناقوس بجانے، کسی نے گھنٹہ بجانے اور کسی نے جھنڈا گاڑنے کی رائے دی، آپ ﷺ نے ان میں سے کسی بھی طریقے کو پسند نہیں فرمایا؛ کیوں کہ ان سب صورتوں میں تشبہ بالغیر لازم آتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ ایک شخص کو مقرر کر دیا جائے کہ وہ

64

جماعت کے وقت گھر گھر جا کر لوگوں کو اس کی اطلاع کرے، آپ ﷺ نے وقتی طور پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ گھوم گھوم کر ”الصلاة جامعة“ کا اعلان کریں، لیکن اس میں پریشانی یہ تھی کہ حضرت بلالؓ کو نماز کے پانچوں وقت پورے مدینہ طیبہ کا طواف کرنا پڑتا، پھر جن کو پہلے اطلاع ملتی وہ پہلے آجاتے، اور آبادی کے آخری حصہ کے لوگوں کو آخر میں اطلاع ملتی، اس لیے وہ بعد میں پہنچتے، اس طرح انتظار طویل ہو جاتا، اس لیے اس نظام وانتظام کے باوجود آپ ﷺ اور دیگر بڑے صحابہؓ نماز باجماعت کی اطلاع اور اعلان کے لیے اسلام کے مناسب اور شایانِ شان طریقہ اختیار کرنے کے لیے برابر فکرمند رہتے۔

اسی دوران ایک انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ نے اور حضرت عمرؓ نے بھی ایک عجیب وغریب خواب دیکھا، جس میں انہیں اذان واقامت کے پاکیزہ کلمات سکھائے گئے، وہ صبح سویرے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا خواب بیان کیا کہ اللہ کے رسول! میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں ناقوس لیے جا رہا ہے، میں نے اس سے کہا: ”کیا تم یہ ناقوس مجھے فروخت کرو گے؟“ اس نے کہا: ”کیوں؟“ تو میں نے کہا کہ ”ہم اس کے ذریعہ لوگوں کو نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے بلایا کریں گے،“ اس نے کہا: ”کیا میں تمہیں اس کے لیے ایک بہترین طریقہ بتلاؤں؟“ میں نے کہا: ”ضرور!“ اس پر مجھے یہ کلمات تلقین کیے گئے، پھر انہوں نے کلماتِ اذان جو ان کے ذہن نشین ہو گئے تھے سنائے، آپ ﷺ نے سن کر فرمایا: ”إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ.“

(أبو داوٗد: ۱/۳۳۷، مشكوٰة المصابيح: ٦٤)

یعنی ان شاء اللہ یہ خواب برحق اور من جانب اللہ ہے۔ اس موقع پر علامہ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ ”حضور ﷺ نے شبِ معراج میں ایک فرشتہ کو اذان کے یہی کلمات کہتے ہوئے سنا، لیکن اس وقت ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ اس کا منشا کیا ہے، پھر جب خواب کے ذریعہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا تو اس وقت فوراً یہ بات سمجھ میں آگئی کہ شبِ معراج کی اذان کا محل یہی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلال کو یہ کلمات سکھا دو“؛ کیوں کہ ان کی آواز

بلند ہے، تاکہ وہ ہر نماز کے لیے اسی طرح اذان دیا کریں، بس اُسی دِن سے اذان کا یہ نظام جو دراصل پیغامِ اسلام بھی ہے جاری ہوا، اور ان شاء اللہ قیامت تک ساری دنیا میں جاری و ساری رہے گا۔

اذان کی جامعیت:

واقعہ یہ ہے کہ اذان کے ان کلمات میں بہت ہی جامعیت ہے، سب سے پہلے ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' میں اللہ کی عظمت اور کبریائی کا بیان ہے؛ کیوں کہ ظاہر اور مادّہ پرست انسان ظاہری اور مادّی چیزوں کی عظمت اور بڑائی سے بہت جلدی متاثر ہو جاتا ہے، یہ کبھی زمین و آسمان کو بڑا سمجھنے لگتا ہے تو کبھی عہدہ اور کرسی کو، کبھی بادشاہوں کو بڑا سمجھتا ہے تو کبھی اپنے بوس (Boss) کو، اور کبھی تو یہ نادان خود اپنے آپ ہی کو بڑا سمجھنے لگتا ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی بڑائی کے عقیدے اور تصور پر ضرب لگائی گئی، اور ''اَللّٰـهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہلوا کر یہ بات دل میں بٹھائی گئی کہ اے مادّی اور دنیا کی چیزوں کو بڑا سمجھنے والے نادان انسان! سب سے بڑا تو اللہ ہے، اس کے سامنے ساری بڑائیاں ہیچ ہیں، لہٰذا اب تو اس اعلان کے بعد اپنی تمام مصروفیتوں اور نفس کے تقاضوں کو اس کی کبریائی کے سامنے حقیر جان کر قربان کر دے۔

اس کے بعد ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ'' میں اس حقیقت کا اعلان ہے جس کو از حضرت آدم علیہ السلام تا رحمتِ عالم ﷺ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام نے اپنے اپنے وقت میں سخت سے سخت حالات برداشت کر کے بھی ڈنکے کی چوٹ بیان کیا، اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک مطلب ہے: ''لَا مَعْبُوْدَ إِلَّا اللّٰهُ''، دوسرا مطلب ہے: ''لَا مَحْبُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ''، تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''لَا مُتَصَرِّفَ فِي الْعَالَمِ إِلَّا اللّٰهُ'' عبادت کے لائق اس کے سوا اور کوئی نہیں، محبت کے لائق اس کے سوا اور کوئی نہیں، یعنی سب سے محبت رب ہی کے لیے ہو، نبی ﷺ سے محبت اللہ کے لیے، صحابہؓ سے محبت اللہ کے لیے، والدین سے محبت

65

اللہ کے لیے، اہل و عیال سے محبت اللہ کے لیے، اہل ایمان سے محبت اللہ کے لیے، اللہ کی مخلوق سے محبت اللہ کے لیے، اور تیسرے مطلب میں کہا گیا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ظاہری اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن حقیقت میں تصرف کرنے والا اللہ ہی ہے، اس کو دل سے مان کر عملی زندگی میں اس کا مظاہرہ کرنا ہی توحید ہے، جو اذان کے دوسرے کلمہ میں بیان کی گئی۔

اس کے بعد ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کا اعلان ہے، اس لیے کہ توحید کے ذریعہ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد کہ بس اللہ ہی حقیقی معبود، محبوب اور مختارِ کل ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بندگی کا صحیح طریقہ اور اس تک پہنچنے کا راستہ کس سے معلوم کیا جائے؟ تو فرمایا: ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''

گاندھی جی ایک مرتبہ کہنے لگے کہ ''وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ'' کا مضمون میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس سلسلہ میں کئی حضرات سے تحقیق کی، لیکن میرے دِل کو تسلی نہیں ہوئی، بالآخر جب میں نے اسیر مالٹا حضرت شیخ الہندؒ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اذان میں اللہ کی الوہیت کے ساتھ جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا اعلان روزانہ پانچ وقت اذان میں ہوتا ہے، تو ''وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ'' کی اس سے بہتر تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے، گاندھی جی کہتے ہیں کہ اس جواب سے مجھے پوری تسلی ہو گئی۔'' (امداد الباری: ۷/۱۴۷۶ از: الکوثری: ۱/۳۵۹)

اس کے بعد ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ'' کے ذریعہ اُس نماز کی دعوت دی جاتی ہے جو اذان کا اصل مقصد اور اللہ کی عبادت و بندگی اور اس سے رابطہ قائم کرنے کا نہایت اعلیٰ ذریعہ ہے، نماز کی اس دعوت کے ساتھ فوراً ہی ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کے ذریعہ اس بات کا اظہار ہے کہ یہی نماز اگر حقیقت میں نماز بن جائے اور تمہاری زندگی صفتِ صلاۃ پر آ جائے تو پھر تمہارے لیے آخرت میں فلاح و کامیابی یقینی ہے، پھر اخیر میں ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' اور ''لَا

اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کومکرر (دوبارہ) لاکر پہلے والے مضمون کی یعنی اللہ کی عظمت، اس کی الوہیت اور کبریائی کی تاکید کردی؛ کیوں کہ جو چیز اہم ہوتی ہے اس کو تاکید سے بیان کیا جاتا ہے، لہٰذا اخیر میں ان کلمات کے ذریعہ یہ تلقین بلکہ تاکید کی جارہی ہے کہ دنیا والو! دنیا بنانے والے کو اپنا مطلوب اور مقصود بنالو، اسی میں فلاحِ دارین کا راز پوشیدہ ہے۔

اذان کی یہی وہ حیرت انگیز خوبی ہے جس کی بنا پر اذان کی آواز شیطان کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے، اور اذان سنتے ہی وہ شور مچاتا ہوا اتنی دور بھاگ جاتا ہے جہاں سے اس کی آواز سنائی نہ دے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے، لیکن یاد رکھو! اذان کی یہ آواز زمین سے بلند ہوکر آسمان تک جا پہنچتی ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''آسمان والے زمین والوں سے صرف اذان ہی سنتے ہیں۔'' (مصنف عبدالرزاق)

اذان کا تقاضا:

صاحبو! کلماتِ اذان کی اس جامعیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اذان دی اور سنی جائے، اور عملی زندگی اس کے مطابق بنائی جائے، رسمی طور پر اذان دے کر اسے صرف ظاہر کے کان سے سن کر سنی اَن سنی نہ کی جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''اذان کا یہ لفظ ''اذن'' سے بنا ہے، جس کے معنی کان کے آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اذان کوئی معمولی اعلان نہیں کہ جس کو سن کر سننے والا یوں ہی گذر جائے، بلکہ اذان وہ اعلان ہے جس کو دل کے کان سے سنا جائے، اذان وہ اعلان ہے جس کو سن کر سننے والا بیدار ہوجائے، بیٹھنے والا کھڑا ہوجائے، اور کھڑا ہونے والا اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے۔''

عہدِ رسالت میں سچے مسلمان حضرات صحابۂ کرامؓ کا یہی حال ہوتا تھا، روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ بازار میں تھے کہ اذان کی آواز سنائی دی، تو دیکھتے دیکھتے سارا بازار بند ہوگیا، اس وقت حضرت ابن عمرؓ نے بے ساختہ یہ فرمایا کہ ان ہی لوگوں کی شان میں قرآن کہتا ہے:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِيْتَآءِ

الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْأَبْصَارُ ﴾ (سورة النور/۳۷)

ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی تجارت یا کوئی خرید وفروخت نہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے، نہ نماز قائم کرنے سے، نہ زکوٰۃ ادا کرنے سے، وہ ڈرتے ہیں اس دِن سے جس دن دل اور نگاہیں اُلٹ پلٹ ہوں گی۔

لہٰذا آیئے!

سارے عالم میں کریں ہم نشرِ پیغامِ اذاں ☆ کہ ہے اُسی میں فلاحِ دوجہاں

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مکان کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا، جو صاحب عیال ہونے کے سبب نوافل کا زیادہ اہتمام نہیں کرسکتا تھا، البتہ جب اذان کی آواز سنتا تو فوراً کام چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہوجاتا، حتیٰ کہ اگر اس نے لوہا کوٹنے کے لیے ہتھوڑا ہاتھ میں اُٹھایا ہوتا اور اُس حالت میں اذان ہوجاتی تو وہ ہتھوڑا لوہے پر مارے بغیر زمین پر رکھ دیتا اور کہتا کہ اب میرے رب کی طرف سے بلاوا آگیا، لہٰذا ''پہلے نماز، بعد میں کام''۔ جب اس کی وفات ہوئی تو کسی نے خواب میں دیکھا کہ وہ بڑی اچھی حالت میں ہے، پوچھا: کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے عرض کیا کہ حق تعالیٰ نے مجھے معاف فرما کر حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نیچے والا درجہ عطا فرمایا، اور یہ سب اذان کی حرمت کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے۔ (مستفاد از: ''بکھرے موتی'' ۷/۱۵۳)

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اذان کے ان حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے اذان کہی اور سنی جائے اور عملی زندگی اس کے مطابق بنائی جائے تو یقیناً ہماری زندگی میں ایک صالح انقلاب پیدا ہوجائے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھائیں اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

۹/ربیع الآخر/۱۴۳۶ھ/قبل الجمعہ   مطابق: ۳۰/جنوری/۲۰۱۵ء (بزم صدیق)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۱)

حضورِ پاک ﷺ کی گھریلو زندگی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ الْأَسْوَدِ رحؒ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رضؓ مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْنَعُ فِيْ بَيْتِهٖ ؟ قَالَتْ: ”كَانَ يَكُوْنُ فِيْ مِهْنَةِ أَهْلِهٖ، – تَعْنِيْ خِدْمَةَ أَهْلِهٖ – فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ.“ (بخاری:۲/۱٦۲، مشکوٰۃ/ص:۵۱۹، باب فی أخلاقه و شمائله ﷺ، الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت اسودؒ (جو جلیل القدر تابعین میں سے ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے ام المومنین والمومنات عفیفۂ کائنات سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیقؓ سے دریافت کیا کہ رحمتِ عالم ﷺ اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟ فرمانے لگیں کہ ”آپ ﷺ اپنے گھر میں کام کاج میں مشغول رہتے، یعنی گھریلو کام میں شریک رہتے تھے، اور جب نماز کا وقت آجاتا تو نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔“

ازواجِ مطہراتؓ نے آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کو تعلیمِ اُمت کے لیے پیش کیا

اللہ رب العزت نے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو قیامت تک کی انسانیت کے لیے مبعوث فرمایا ہے، اور چوں کہ آپ ﷺ کا ہر عمل تعلیمِ اُمت کے لیے

67

ہوتا تھا، اس لیے یہ بات ضروری تھی کہ آپ ﷺ کی انفرادی و اجتماعی اور خانگی و بیرونی غرض زندگی کا ہر ہر شعبہ قیامت تک کی انسانیت کے لیے مستند اور معتبر ذریعوں سے محفوظ ہو جائے، چنانچہ سیرۃ النبی کا سب سے معتبر و مستند ماخذ کلامِ الٰہی کے بعد حدیثِ نبوی ہے، اور حدیثِ نبوی کے اوّلین راوی حضراتِ صحابہؓ ہیں۔

اب جہاں تک تعلق ہے آپ ﷺ کی اجتماعی و بیرونی زندگی کا، تو حضراتِ صحابہؓ نے اس ذمہ داری کو ادا فرماتے ہوئے آپ ﷺ کے ہر قول و عمل کو محفوظ فرما دیا، جب کہ آپ ﷺ کے انفرادی و خانگی امور کو ازواجِ مطہرات امہات المومنین والمومناتؓ نے محفوظ فرما دیا، لہٰذا حضراتِ صحابہؓ نے آپ ﷺ کی اجتماعی و بیرونی زندگی کے احوال کو امت کے لیے محفوظ فرما کر احسان کیا، تو حضراتِ ازواجِ مطہراتؓ نے آپ ﷺ کی انفرادی و گھریلو زندگی کے وہ حالات جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان کو امت کے سامنے پیش فرما کر احسان فرمایا۔

آپ ﷺ کا گھر میں داخل ہونے کا طریقہ:

روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے ذمہ حقوق وذمہ داریوں کو کما حقہ انجام دینے کے لیے اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا، تاکہ ہر کام حسن انتظام سے انجام پا سکے، ان میں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا، جس میں آپ ﷺ عبادت، تلاوت اور ذکر واذکار فرماتے، دوسرا حصہ اللہ کے بندوں کے لیے تھا، جس میں آپ ﷺ ہر عام وخاص سے ملتے اور ان کی ضروریات کی طرف توجہ اور رہنمائی فرماتے، تیسرا حصہ اپنے لیے تھا، جس میں آپ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات اور گھر والوں کے ساتھ وقت گذارتے، تو حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے نظام الاوقات کا جو حصہ گھریلو زندگی سے متعلق ہے اس میں بھی اُمت کے لیے سامانِ ہدایت ہے۔

مثلاً دیکھئے! اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ﷺ گھر میں

(سفر وغیرہ سے آکر) اچانک داخل نہ ہوجاتے، بلکہ گھر والوں کو مطلع فرماتے۔ (زاد المعاد ۲۰/۲:)

اس میں تعلیم ہے کہ بے وقت یا سفر وغیرہ سے جب واپسی ہو تو فون وغیرہ کے ذریعہ گھر والوں کو اطلاع کرے۔

پھر آپ ﷺ گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھتے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَ خَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَ بِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَ عَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا." (حصن حصين : ١٣٤، أبوادود : ٦٩٥/٢، مشكوٰة المصابيح : ٢١٥)

ترجمہ: اے اللہ! میں اچھے داخلہ اور اچھے نکلنے کا سوال کرتا ہوں، اللہ ہی کے نام سے داخل ہونا اور نکلنا ہے، اور اللہ ہی پر جو ہمارا رب ہے ہمارا بھروسہ ہے۔"

اس میں ہدایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے گھر (مسجد) ہی میں نہیں؛ بلکہ اپنے گھر میں بھی اور ہر جگہ یاد رکھو، اس سے کبھی غافل مت رہو۔

اس کے بعد آپ ﷺ سلام فرما کر مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے، ظاہر ہے کہ اتباعِ سنت میں اس طرح گھر میں داخل ہونا برکت اور اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔

آپ ﷺ گھر میں کس طرح رہتے؟

گھر میں داخل ہونے کے بعد آپ ﷺ بے تکلف (نارمل) رہتے، گھر والوں کے مزاج کی رعایت فرماتے، اور نہایت اُلفت ومحبت بھرا معاملہ فرماتے، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ "ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ جب گھر تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ میرے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہیں، اور مسجدِ نبوی کے صحن میں جہاں اصحابِ صفہ کے لیے چبوترہ بنا ہوا تھا وہاں حبشہ کے لوگ نیزوں سے کھیل رہے تھے، تو حضور ﷺ نے اپنی چادر سے مجھے پردہ میں لے لیا، تاکہ میں آپ ﷺ کے

کان اور مونڈھے کے درمیان سے دیکھتی رہوں، آپ ﷺ اس وقت تک میری خاطر کھڑے رہے جب تک میں کھڑی رہی۔" (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ٢٨٠/باب عشرة النساء)

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ گھر والوں کے مزاج ومسرت کی رعایت میں دیر تک بلا تکلف نیزہ بازی کا کھیل دِکھاتے رہے۔ اس کے علاوہ کبھی کوئی بات گھر والوں سے خلافِ (شرع تو نہیں؛ لیکن خلافِ) مزاج پیش آجاتی تو آپ ﷺ برہم نہ ہوجاتے، بلکہ اُسے برداشت کرتے، اور یہ برداشت کرنا بزدلی نہیں، خوش اخلاقی ہے، جیسے روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ خادمِ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا یا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا یا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا میں سے کسی نے ایک پلیٹ میں خادمہ کے ہاتھ کھانے کی کوئی چیز بھیجی، اسے دیکھتے ہی انہوں نے اس خادمہ کے ہاتھ پر اس طرح مارا کہ وہ پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی اور کھانا گر گیا، اس موقع پر بجائے اس کے کہ آپ ﷺ ڈانٹ ڈپٹ فرماتے ٹوٹی ہوئی پلیٹ کے ٹکڑوں کو دوبارہ اکٹھا کیا اور گرے ہوئے کھانے کو اٹھا کر کمالِ تحمل سے زوجۂ محترمہ کے غصہ کو کم کرنے کے لیے صرف اتنا فرمایا کہ "غَارَتْ أُمُّكُمْ" تمہاری ماں نے سوکن پن کی غیرت سے یہ عمل کیا، جو کہ عورت کے مزاج وفطرت میں پائی جاتی ہے، یعنی آپ ﷺ سوکنوں کی ایسی باتیں جو غیرت سے تعلق رکھتی تھیں وسعتِ اخلاق کی وجہ سے برداشت فرماتے، ان کی وجہ سے گھر کے ماحول کو مکدّر اور تنگ نہ فرماتے۔ (مشکوٰۃ المصابیح/ص:۲۵۵/ باب الغصب والعاریۃ، بحوالہ: بخاری)

اس میں اُمت کے ہر فرد کو اس بات کی تعلیم ہے کہ گھر میں خلافِ مزاج بات پیش آبھی جائے تو حتی الامکان اُسے برداشت کرے، اور گھر میں خوشیوں والا ماحول بنائے رکھنے کی کوشش کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ گھر میں بچوں کی طرح بے تکلف اور اُلفت ومحبت کے ساتھ رہے، البتہ جب کام کا موقع آئے تو پھر جوان بن کر گھر والوں کا ان کاموں میں ہاتھ بٹائے، گھریلو زندگی میں ہمارے آقا ﷺ کا طرزِ عمل اور طریقہ یہی تھا، جس کا پتہ

حدیثِ مذکور سے چلتا ہے۔

حضور ﷺ کے گھر میں کام کاج:

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کی گھریلو مصروفیات کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "کَانَ یَکُوْنُ فِیْ مِهْنَةِ أَهْلِهٖ، تَعْنِیْ خِدْمَةَ أَهْلِهٖ" گھر تشریف لانے کے بعد محض آرام کے بجائے گھر کے چھوٹے بڑے یا کم از کم خود اپنے ذاتی کام کاج میں آپ ﷺ مشغول رہتے تھے، اس موقع پر حافظ ابن حجرؒ نے دیگر احادیث بھی پیش کی ہیں جن سے حضور ﷺ کی گھریلو مصروفیات واضح ہوتی ہیں۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ "مِهْنَةِ أَهْلِهٖ" سے مراد بکری کا دودھ دوہنا، کپڑے، موزے وغیرہ کو پیوند لگانا ہے۔ (مظاہر حق جدید: ۵/۳۲۴)

اور مسندِ احمد کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھر میں کبھی کبھی جوتے گانٹھ لیتے، کپڑے سی لیتے، (پانی کا) ڈول بھر لاتے۔ (شمائلِ کبریٰ: ۴/۲۵۴، بحوالہ: مسند احمد: ۱/۴۶۱)

یعنی آپ ﷺ اپنے گھر میں حاکم بن کر نہیں، بلکہ گھر کا ایک فرد بن کر ان کے کام کاج میں معاون بن جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر میں فرصت کے اوقات میں اپنے اور گھر کے کام کرنا خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہوں، بہر حال یہ حضور ﷺ کا طریقہ اور سنت ہے۔

حضور ﷺ گھر کے کام کا اہتمام کیوں فرماتے تھے؟

یہاں سوچنے کی بات ہے کہ جن کاموں کا حدیثِ مذکور میں تذکرہ ہوا وہ بظاہر کوئی محنت و مشقت والے اور بڑے نہ تھے، پھر ازواجِ مطہراتؓ کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ پر سو جان سے فدا تھیں، آپ ﷺ کے چشم و ابرو کے اشاروں پر قربان تک ہونا اپنی سعادتِ عظمیٰ سمجھتی تھیں، بالخصوص سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فداکاری کا تو یہ حال تھا کہ جب حضور

ﷺ ان کی باری میں گھر تشریف لاتے تو فرطِ محبت میں فرماتیں:

لَنَا شَمْسٌ وَ لِلْآفَاقِ شَمْسٌ ☆ وَ شَمْسِیْ خَیْرٌ مِّنْ شَمْسِ السَّمَاءِ
فَإِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرٍ ☆ وَ شَمْسِیْ طَالِعٌ بَعْدَ الْعِشَاءِ

(مثالی دولہن/صفحہ: ۱۶۱)

ایک سورج تو ہمارا ہے، اور ایک سورج آسمان یعنی دنیا والوں کا ہے، ربِ اکبر کی قسم! میرا سورج آسمان کے سورج سے بہتر ہے، آسمان کا سورج تو روزانہ فجر میں طلوع ہوتا ہے (اور رات میں ڈوب جاتا ہے) لیکن میرا سورج تو اتنا روشن اور چمکدار ہے کہ جب سے طلوع ہوا آج تک اس کی روشنی سارے عالم میں موجود ہے۔

اس فداکاری اور محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ذرا ان کو یہ اندازہ ہو جاتا کہ حضور ﷺ فلاں کام کرنا چاہتے ہیں تو ازواجِ مطہراتؓ خود حکم کے انتظار کے بغیر آگے بڑھ کر اسے انجام دے لیتیں، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ ازواجِ مطہراتؓ کی موجودگی میں گھر کے چھوٹے بڑے کام کرنے کا اہتمام فرماتے تھے، آخر کیوں؟

حضور ﷺ کے گھریلو کام انجام دینے کی وجہ اور اس کے فوائد:

علماء نے اس کی مختلف وجوہات میں پہلی وجہ یہ بیان فرمائی کہ گھر میں کام کا اہتمام کرنے سے عبدیت کی فضیلت حاصل ہوتی ہے، اس لیے اگر کوئی شخص گھر میں اپنے اور گھر کے کام کرنے سے کتراتا ہے تو اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ کام چور اور سست آدمی ہے، اور یہ بات پسندیدہ نہیں، اسی لیے رحمتِ عالم ﷺ نے اپنی مقبول دعاؤں میں سستی سے پناہ مانگی ہے، فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَ الْكَسَلِ." (بخاری/ باب ما یتعوّذ من الجبن، مشکوٰة المصابیح: ۲۱۵)

ترجمہ: اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سستی سے۔

معلوم ہوا کہ سستی بری چیز ہے، اور اپنے ذاتی اور گھریلو کام نہ کرنے کا ایک سبب سستی ہوسکتا ہے، لیکن دوسرا سبب کبر ہوسکتا ہے، کہ اس طرح کے کاموں کو آدمی اپنی شان کے خلاف سمجھے، ظاہر ہے کہ یہ تو سستی سے بھی بری بلا ہے۔

اور صاحبو! یاد رکھو! تکبر اور تعلق مع اللہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی جمع نہیں ہوسکتیں، تعلق مع اللہ، تواضع، عاجزی اور بندگی سے پیدا ہوتا ہے، اور اپنے اور گھر کے کام کرنے سے آدمی میں کسرِ نفسی اور عاجزی پیدا ہوتی ہے، جو اللہ کو بہت پسند ہے، اور اسی لیے آپ ﷺ قصداً اپنے گھر کے کام خود انجام دیتے، حتیٰ کہ ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے بذاتِ خود بازار بھی تشریف لے جاتے، جو کہ گھریلو کام ہی کا ایک حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ کفار و مشرکین نے آپ ﷺ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا، جس کو قرآن نے یوں نقل کیا:

﴿وَ قَالُوْا مَا لِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (الفرقان / ۷)

ترجمہ: یہ کیسا رسول ہے! جو کھانا بھی کھاتا ہے، اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔

غور کیجیے! ہمارے آقا ﷺ تو گھر کے کام کاج خود انجام دیں، حتیٰ کہ اپنی اور گھر کی ضروری اشیاء خریدنے کے لیے بازار بھی جائیں، اور ہم اسے اپنی شان کے خلاف سمجھیں، تو یہ شیطانی خیال ہے، اس سے بچنے کا طریقہ ہے کہ ہم ان کاموں کو انجام دینا شروع کریں، حضور ﷺ کا منشا بھی اُمت کو تعلیم دینا ہی تھا، آپ ﷺ اسی لیے گھر میں گھر کے کام خود انجام دیتے تاکہ اُمت عبرت حاصل کرے اور کام کا مزاج بنائے، اس سے ایک تو کسرِ نفسی اور عاجزی پیدا ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ گھر کے کام اتباعِ سنت کی نیت سے انجام دینے سے ثواب بھی ملے گا۔ اسی کے ساتھ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے ماتحتوں اور گھر کے دیگر افراد کو بھی کام کا حوصلہ ملے گا، بلکہ ان میں مزید چستی پیدا ہوگی کہ جب ہمارے بڑے کام میں لگے ہیں تو ہمیں بدرجۂ اولیٰ کام میں لگنا چاہیے، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ آدمی اپنے ذاتی کام

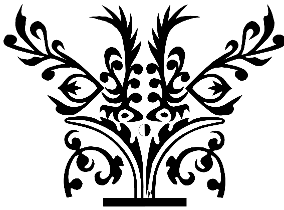
کاج جس فکرمندی اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے عموماً اس طرح فکرمندی و خوش اسلوبی سے دوسرا انجام نہیں دے سکتا، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ غالباً ہمارے آقا ﷺ گھریلو امور بذاتِ خود انجام دے کر امت کو یہی تعلیم دینا چاہتے تھے، لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم حضور ﷺ کی گھریلو زندگی کو سامنے رکھ کر اُسی کے مطابق زندگی گذاریں، تاکہ گھر کا ماحول بھی خوشگوار اور پر بہار بنا رہے۔

حق تعالیٰ ہماری ساری زندگی اسوۂ حسنہ کے مطابق بنادے۔ آمین۔

۵/ ربیع الآخر/ ۱۴۳۵ھ (بزم صدیقی)
مطابق: ۲۶/ جنوری/ ۲۰۱۵ء/ بروز پیر

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۱۲)

اجرِ اعمال اور ایصالِ ثواب کی صورت میں ربِ کریم کا فضلِ عظیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا الْمَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْغَرِيْقِ الْمُتَغَوِّثِ، يَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهُ مِنْ أَبٍ أَوْ أُمٍّ أَوْ أَخٍ أَوْ صَدِيْقٍ، فَإِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا، وَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُدْخِلُ عَلٰى أَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ، وَ إِنَّ هَدِيَّةَ الْأَحْيَاءِ إِلَى الْأَمْوَاتِ الْإِسْتِغْفَارُ لَهُمْ." (مشكوٰة المصابيح/ص:٢٠٦/باب الاستغفار والتوبة/الفصل الثالث، و أخرجه البيهقي في شعب الإيمان:٦/٢٠٢، رقم الحديث: ٧٩٠٤)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مرنے والے کی کیفیت قبر میں ایسی ہوتی ہے جیسے ڈوبنے والا فریاد کرنے والا ہوتا ہے، وہ اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے، اور جس طرح وہ سہارے کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح مرنے والا بھی والدین اور دوست، احباب نیز اقرباء

واعزاء کی دعاؤں کا منتظر رہتا ہے، جب کوئی (اس کے لیے) دعا کرتا ہے اور وہ پہنچتی ہے تو یہ دعا اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہوتی ہے، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ قبر والوں کو زمین والوں کی دعا کی وجہ سے پہاڑوں کے مانند اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، (ان ساکنانِ خاکدانِ ارضی کی دعا قبر والوں کے حق میں پہاڑ جیسے اجر و ثواب کے برابر ہوتی ہے) اور مردوں کے لیے زندوں کا ہدیہ یہی دعاءِ مغفرت ہے۔

عملِ قلیل پر اجرِ عظیم، فضلِ کریم ہے:

اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کی صحیح اطاعت کا نام عبادت ہے، دنیا کا ہر انسان اللہ کا بندہ ہے، اس لیے اللہ کی عبادت و بندگی بندہ کی ذمہ داری ہے، اب اگر بندگی اور اداءِ ذمہ داری یعنی عبادت و نیک عمل پر اللہ اُسے اجر بھی دے تو یہ اس کا فضل ہے، اور اہل ایمان اللہ کے وفادار اور تابع فرمان ہوتے ہیں، اس لیے ان پر اس کا فضل بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، کہ ان کے کسی ایک نیک عمل کا کم از کم اجر دس گنا ہے: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (أنعام/١٦٠) اور زیادہ سے زیادہ کتنا ہے؟ تو ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ اللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ (بقرة/٢٦١) اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اجر و ثواب میں) کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔

واقعی ایمان والا احسان و اخلاص کی کیفیت اور اتباعِ سنت کے ساتھ جب کوئی عمل کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے عملِ قلیل پر بھی محض اپنے فضل سے اجرِ عظیم عطا فرماتے ہیں، جس کی کئی مثالیں کتاب و سنت میں موجود ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اخلاص کے ساتھ ایک مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہنے کا اجر میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ مَالِكِ نِ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ......الخ" (مشكوٰة المصابيح/٣٨/كتاب الطهارة/ الفصل الأول، و أخرجه مسلم ١/٣٠٢، رقم الحديث: ٢٢٣٠١)

ظاہر ہے، اس طرح کے عملِ قلیل پر اجرِ عظیم یہ فضلِ کریم کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے!

چند اعمال ایسے ہیں جن کا اجر مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے:

پھر یہ تو زندگی میں کیے ہوئے اعمال پر وعدۂ اجر کی بات ہے، جب کہ بعض اعمال تو ایسے بھی ہیں کہ اگر اہلِ ایمان ان کا اہتمام اپنی زندگی میں کر لیں تو حق تعالیٰ مرنے کے بعد جس وقت عمل کا سلسلہ منقطع اور بند ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود محض اپنے فضل سے ان اعمال کا اجر و ثواب مرنے والے کو عطا فرماتے ہیں، جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم : " إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُّنْتَفَعُ بِهٖ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَّدْعُوْ لَهٗ." (مشکوٰة المصابیح : ۳۲ / کتاب العلم / الفصل الأول، و أخرجه مسلم فی باب: ما یلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته)

کہ جب انسان دنیا (جو کہ دار العمل ہے) میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کا اجر مرتب اور مقرر فرما کر آخرت کے لیے محفوظ فرما دیتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد جب یہ سلسلہ بند ہو جاتا ہے تو بظاہر اجر کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے، مگر چند اعمال ایسے ہیں جن کو اگرچہ مرنے والا بذاتِ خود انجام نہیں دے پاتا اس کے باوجود ان اعمال کا اجر و ثواب دوام و استمرار کے ساتھ مرنے والے کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک ہے: "إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ" صدقۂ جاریہ، مطلب یہ ہے کہ انسان نے اللہ کا عطا کردہ مال اپنی زندگی میں کسی ایسے خیر و بھلائی کے کام میں لگایا جو اس کے بعد بھی باقی رہے، اور لوگ اس سے فائدہ اُٹھاتے رہیں، مثلاً کوئی زمین، جائداد مسجد، مدرسہ یا نیک کام کے لیے وقف کر دی، یا پانی کے بور (Bore) یا کنویں وغیرہ کا انتظام کر دیا، اسی طرح کسی جگہ درخت لگا دیا، اور لوگ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے رہے، تو آئندہ جب تک اس کا صدقۂ جاریہ والا یہ کام باقی رہے گا اس کو برابر اجر ملتا رہے گا، بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص تو فضل کریم کے پیشِ نظر یہ ہے کہ اگر مرنے والے کا صدقۂ جاریہ والا عمل کسی وجہ سے باقی بھی

نہ رہا، لیکن اس کی نیت ہمیشہ کے لیے لوگوں کو نفع پہنچانے کی تھی، تو ان شاء اللہ سچی اور اچھی نیت کے مطابق ثواب ہمیشہ اسے ملتا ہی رہے گا۔

دوسرا عمل "أَوْ عِلْمٍ يُّنْتَفَعُ بِهٖ"، علمِ نافع ہے، یعنی وہ علم جو خود صاحبِ علم کے لیے دارین کے اعتبار سے نافع ہو، اگر مرنے والا دار العمل میں ایسا علم حاصل کر کے لوگوں کو تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ فیض یاب کرتا رہا تو مرنے کے بعد اس علم کا اجر اس کو مسلسل ملتا رہے گا۔

تیسرا عمل ہے: "أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَّدْعُوْ لَهٗ" اپنی اولاد کو صحیح تربیت و تعلیم کے ذریعہ نیک بنانا، یہ عمل ایک مومن کے لیے دارین میں نیک نامی اور کامیابی کا ذریعہ ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اولاد کو نیک صالح بنا کر چھوڑنا یہ خود ایسا نیک عمل ہے کہ اس پر مرنے کے بعد والدین کو اولاد کی نیکیوں کا اجر و ثواب (ان کے اصل اجر و ثواب میں کمی کیے بغیر) ملتا ہے، پھر اگر وہ اولاد اپنے والدین کے لیے دعا و ایصالِ ثواب کا اہتمام بھی کرے تب تو سونے پر سہاگہ، والدین کے اجر و ثواب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد اگرچہ عمل کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، لیکن اگر ایک مومن یہ چاہے کہ موت کے بعد بھی اس کے عمل کا سلسلہ جاری اور اجر میں اضافہ ہوتا رہے، تو ربِ کریم کی جانب سے اس کے بھی مواقع ان اعمال کی شکل میں موجود ہیں، اور جب یہ حقیقت ہے تو اب ہمارے لیے ان اعمال سے غفلت مناسب نہیں ہے۔ ؎

مرنے سے پہلے مناسب نہیں اعمال سے تغافل ☆ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے اجر کا تسلسل

ایصالِ ثواب کی صورت میں دوسروں کا اجر بھی مومن کو ملتا ہے:

اتنا ہی نہیں کہ مرنے والے مومن کو اس کے بعض اعمال کا اجر برابر ملتا رہتا ہے، بلکہ ایصالِ ثواب کی صورت میں دوسروں اور زندوں کی عبادات و اعمال خواہ وہ مالی ہوں یا بدنی ہوں، یا مشترک، لیکن ان کا اجر و ثواب بھی اسے ملتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی متعدد آیات و

احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

بدنی عبادت کے ذریعہ ایصالِ ثواب:

مثلاً بدنی عبادات واعمال میں دعا واستغفار ایسے اعمال ہیں کہ جن کا پختہ ثبوت بہت سی آیات واحادیث سے ملتا ہے، منجملہ ان میں ایک جگہ خود رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو خصوصی خطاب کرکے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ ﴾ (محمد / ٤٩)

ترجمہ: اور اپنے قصور پر بخشش کی دعا مانگتے رہو، اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہ کی بخشش کے لیے بھی (دعا مانگتے رہو)

واضح ہو کہ حضور ﷺ تو معصوم تھے، آپ ﷺ سے گناہ کا کوئی کام ہوا ہی نہیں، لیکن آپ ﷺ کی کسی کسی رائے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ آپ کے مقامِ بلند کے مناسب نہیں تھی، مثلاً جنگِ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؐ کا فیصلہ، نیز بشری تقاضے سے کبھی کبھی آپ ﷺ سے نماز کی رکعات میں بھول بھی ہوئی، تو اس قسم کی باتوں کو یہاں قصور سے تعبیر فرمایا ہے، اور درحقیقت اس میں آپ ﷺ کی امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب آپ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ جو گناہ بھی نہیں ہیں۔ استغفار فرماتے ہیں، تو امت کے لوگوں کو تو اپنے ہر چھوٹے بڑے گناہ پر بدرجۂ اولیٰ استغفار کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (آسان ترجمۂ قرآن: ۳/۱۵۵۳، علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ)

اور سورۂ حشر میں سابقین اوّلین من المہاجرین والانصار کے بعد آنے والے ان مسلمانوں کی بڑی قدر افزائی کے ساتھ تعریف کی گئی ہے جو مومنین سابقین کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ ﴾ (سورۃ الحشر / ۱۰)

ترجمہ: اور (یہ مالِ فئی) ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان (مہاجرین وانصار) کے بعد آئے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرمائیے، اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں۔''

نیز سورۂ مومن میں عرشِ الٰہی کے حامل فرشتوں اور اسی مقامِ مقرب کے دوسرے ملائکہ کے متعلق اطلاع دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح وتحمید کے ساتھ تمام مومنین اور توابین بلکہ ان کے آباءِ صالحین اور ازواج وذریات تک کے لیے اللہ سے مغفرت ورحمت کی دعائیں اور جہنم سے بچانے اور دخولِ جنت کی التجائیں کرتے رہتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ (سورۃ المومن / ۷)

ترجمہ: وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد موجود ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو ایمان لے آئے ہیں ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں (کہ): اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز پر حاوی ہے، اس لیے جن لوگوں نے توبہ کرلی ہے اور تیرے راستے پر چل پڑے ہیں ان کی بخشش فرمادے، اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

﴿ رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (سورۃ المؤمن / ۸)

ترجمہ: اور اے ہمارے رب! انہیں ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں داخل فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، نیز ان کے ماں باپ اور بیوی بچوں میں سے جو نیک ہوں انہیں بھی، یقیناً تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے جس کی حکمت

بھی کامل ہے۔

اسی طرح سورۂ ابراہیم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا منقول ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ (إبراهيم / ٤١)

ترجمہ: اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہوگا اس دن میری مغفرت فرمائیے، میرے والدین کی بھی، اوران سب کی بھی جو ایمان رکھتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر تو کافر تھا، پھر آپ نے اس کی مغفرت کی دعا کیسے فرمائی؟ جواب یہ ہے کہ اس کے حق میں مغفرت کا مطلب توفیقِ ایمان ہے، جو سببِ مغفرت ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دعا اس وقت مانگی گئی ہو جب آپ کو مشرک باپ کے لیے دعا سے منع نہیں کیا گیا تھا۔

نیز سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعا موجود ہے:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ (سورة نوح / ٢٨)

ترجمہ: میرے پروردگار! میری بھی بخشش فرما دیجیے، میرے والدین کی بھی، اور ہر اس شخص کی بھی جو میرے گھر میں ایمان کی حالت میں داخل ہوا ہے، اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کی بھی۔

علاوہ ازیں قرآنِ کریم نے اولاد کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنے والدین کے حق میں اس طرح دعا کیا کریں:

﴿ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ (سورة بنی اسرائل / ٢٤)

ترجمہ: اے رب! جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھے پالا ہے آپ بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجیے!

اِن آیات سے تمام اہلِ ایمان خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ ان کے لیے دعا واستغفار کا

ثبوت ملنے کے علاوہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت نوح وابراہیم علیہما السلام جیسے پیغمبروں کی سنت ہے، اور خود حضور ﷺ کو اس کا حکم ہے، پھر قرآنِ کریم کی ان آیاتِ بینات کے علاوہ کئی احادیث ایسی ملتی ہیں جن سے بدنی اعمال وعبادت کے ذریعہ بھی ایصالِ ثواب کرنا یا دوسرے لفظوں میں زندوں کی مساعی اور اعمال سے مردوں کو نفع پہنچنا ثابت ہوتا ہے، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے ایسی متعدد حدیثیں اپنی تفسیر میں جمع کر دی ہیں، مثلاً حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جو شخص قبرستان میں جا کر سورۂ یٰسین پڑھے تو اللہ تعالیٰ مردوں سے عذاب کو ہلکا کر دیں گے۔ (تفسیر مظہری:۱۲/۳۲۴)

ایک اور حدیث میں ہے، حضرت ابواسیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابیؓ نے رحمتِ عالم ﷺ سے عرض کیا کہ میرے والدین کی وفات ہوچکی ہے، کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ میں اپنے والدین پر احسان کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چار طریقوں سے تم ان پر احسان کر سکتے ہو: ۱- ان کی نمازِ جنازہ پڑھنا (دعا واستغفار کرنا) ۲- ان کے وعدوں کو پورا کرنا۔ (ایسی اچھی وصیت جو زندگی کے آخری وقت میں کی گئی یا نصیحت اور نیک مشورہ انہوں نے دیا ہو اس پر عمل کرنا) ۳- ان کے دوستوں کی عزت کرنا۔ (ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا) ۴- ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا۔ یہ وہ سلوک ہے جو ان کے مرنے کے بعد ان کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ (ابوداود، ابن ماجہ، بحوالہ: گلدستۂ تفاسیر: ۴/۲۰۲)

اِسی طرح حدیثِ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے کو قبر میں اس کے اقرباء و اعزاء کی دعاؤں اور ایصالِ ثواب کی وجہ سے پہاڑوں کے مانند اجر وثواب ملتا ہے، وغیرہ۔

نیز نمازِ جنازہ میں اموات کے لیے دعا واستغفار کرنا اور بعد دفن قبر پر اور اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں جیسے قبرستان میں داخل ہوتے وقت اہلِ قبور کے لیے مغفرت ورحمت کی دعا مانگنا وغیرہ، یہ سب حضور ﷺ سے تعلیماً وعملاً بہ طریق تواتر قطعی طور پر ثابت ہے، اور عہدِ رسالت سے آج تک ساری اُمت کا اس پر عمل بھی رہا ہے۔

مالی عبادت کے ذریعہ ایصالِ ثواب:

جہاں تک صدقات اور مالی عبادات کے ذریعہ ایصالِ ثواب کرنے کی بات ہے تو اس بارے میں بھی متعدد روایتیں موجود ہیں، مثلاً صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''دربارِ رسالت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری والدہ اچانک انتقال کر گئیں اور انہوں نے کوئی وصیت نہیں کی ہے، لیکن میرا گمان ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ صدقہ وخیرات ضرور کرتیں، اب اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ وخیرات کروں تو کیا ان کو ثواب پہنچے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔'' (بخاری : ۱/۳۸۶، مشکوٰۃ المصابیح : ۱۷۲/باب صدقة المرأة من مال الزوج)

اسی طرح حدیثِ پاک میں حضرت سعدؓ کا ایک واقعہ ہے کہ ۵ھ میں رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ دومۃ الجندل کے سلسلہ میں مدینہ طیبہ سے باہر تھے، حضرت سعد بن عبادہؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، اسی دوران ان کی والدہ کا جن کا نام عمرہ بتایا جاتا ہے انتقال ہوگیا، روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے: حضور! میری عدمِ موجودگی میں میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے، تو کیا اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو یہ ان کے لیے نافع ہوگا؟ اس کا ثواب ان کو پہنچے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، عرض کیا کہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ ''صحراب'' میری ماں کی طرف سے صدقہ ہے۔ (بخاری شریف: ۱/۳۸۷)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ والدہ ماجدہ کی طرف سے کونسا صدقہ افضل ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الماء'' یعنی اللہ کی مخلوق کے لیے پانی کا انتظام کردینا، اس پر انہوں نے ایک کنواں تیار کروایا (جو سقایہ آلِ سعد کے نام سے مشہور ہوا) اور فرمایا: ''هٰذَا لِأُمِّ سَعْدٍ'' یہ سعد کی ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے وقفِ عام ہے۔ (نسائی شریف: ۲/۱۱۵)

اسی طرح عباداتِ مالیہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب کا ایک واضح ثبوت وہ متعدد احادیث بھی ہیں جن سے رحمتِ عالم ﷺ کا اپنی آل اور پوری امت کی طرف سے قربانی کرنا ثابت ہوتا ہے، جیسے صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ عید الاضحیٰ کے موقع پر حضور ﷺ نے ایک اچھے موٹے تازے سینگوں والے مینڈھے کی قربانی فرمائی، اس کو ذبح کرتے وقت فرمایا: ''بِسْمِ اللّٰہِ اللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَّ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ.'' (صحيح مسلم / كتاب الضحايا)

ظاہر ہے کہ جب آپ ﷺ نے اپنی آل اور امت کی طرف سے قربانی فرمائی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کا ثواب اپنی آل اور امت کو بخشا ہے، علاوہ ازیں اس طرح کی اور بھی متعدد روایات ہیں جو مالی عبادات کے ذریعہ ایصالِ ثواب کے درست ہونے کو بتاتی ہیں، اس لیے صدقات کے ذریعہ ایصالِ ثواب میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں۔ ''وَ لَيْسَ فِي الصَّدَقَةِ اخْتِلَافٌ.'' (الجامع لأحكام القرآن : ۱۷/۱۱۵)

حج وعمرہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب:

رہ گئیں وہ عبادات جو مال اور بدن دونوں سے مرکب ہیں جیسے حج وعمرہ، یہ عبادات بیک وقت بدنی بھی ہیں اور مالی بھی، ان میں روپیہ پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے اور محنت و مشقت بھی کرنی پڑتی ہے، چنانچہ دوسروں کی طرف سے حج وعمرہ کی ادائیگی اور حج وعمرہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب پر بھی متعدد حدیثیں مروی ہیں، ازاں جملہ ایک تو حضرت بریدہؓ کی وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں منقول ہے کہ ''ایک عورت نے حاضرِ خدمت ہوکر چند مسائل حضور ﷺ سے پوچھے، جن میں آخری مسئلہ یہ تھا کہ ''إِنَّهَا لَمْ تَحُجَّ قَطُّ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: حُجِّيْ عَنْهَا.'' (مسلم / باب قضاء الصوم عن الميت)

میری والدہ نے کبھی حج نہیں کیا، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، تم ان کی طرف سے حج کرو۔

ایک اور حدیث حج کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت حاضرِ خدمت ہوکر کہنے لگی کہ ''میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی، لیکن وہ اسے پورا کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ ضرور کرسکتی ہو، پھر فرمایا: بتاؤ! اگر تمہاری والدہ کے ذمہ کچھ قرض ہوتا تو تم اس کو ادا کرتیں یا نہیں؟ عرض کیا: جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح اللہ کا جو حق ان پر تھا (حج کی صورت میں) اس کو بھی ادا کرو، اللہ پاک تو ادائیگیٔ حقوق کا زیادہ مستحق ہے۔''

اس مضمون کی اور بھی روایتیں ہیں جن میں حضور ﷺ سے معذوروں اور ایسے بوڑھوں کے متعلق سوال کیا گیا جو سفر اور نقل و حرکت کی طاقت نہیں رکھتے تھے، کہ کیا ان کی طرف سے کوئی دوسرا حج و عمرہ ادا کرسکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے اس کی اِجازت مرحمت فرمائی۔

لیکن حضراتِ صحابہؓ کا عام طرزِ عمل یہ تھا کہ اس قسم کے کاموں میں وہ مخلصین اخفاء کو زیادہ پسند فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اجتماعی قسم کے دینی کاموں کے علاوہ اس طرح کے انفرادی اعمال کی احادیث ان سے زیادہ منقول نہیں، ایصالِ ثواب بھی ایسا ہی ایک عمل ہے، کہ اس میں اعلان و اظہار کے بجائے اخفاء اولیٰ ہے، اس لیے ذخیرۂ احادیث میں اس کا ثبوت کم ملتا ہے، ورنہ عہدِ صحابہؓ میں بھی ایصالِ ثواب کا اہتمام تھا، اس لیے جمہورِ امت اس کے صحیح ہونے پر متفق ہیں، اور حنفیہ، حنابلہ اور ایک قول کے مطابق مالکیہ و سلفِ صالحین کے نزدیک بدنی عبادت کے ذریعہ بھی ایصالِ ثواب درست ہے۔ (قاموس: ۲/۲۶۴)

ایصالِ ثواب کے صحیح ہونے کی شرطیں:

لہٰذا ان حقائق سے ایصالِ ثواب کا برحق ہونا ثابت ہوتا ہے، البتہ اس کے صحیح ہونے کے لیے چند شرطیں ہیں، جن کے بغیر ایصالِ ثواب صحیح نہیں ہوسکتا: (۱) میت صحیح

العقیدہ ہو۔ اگر میت صحیح العقیدہ نہیں، مشرک اور کافر ہے، تو اس کے لیے استغفار اور دعا و ایصالِ ثواب جائز ہی نہیں، ارشادِ باری ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوٓا أُولِىْ قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ○﴾ (سورة التوبة / ۱۱۳)

ترجمہ: یہ بات نہ تو کسی نبی کو زیب دیتی ہے اور نہ دوسرے مومنوں کو کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں، خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ وہ دوزخی لوگ ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے اپنے والد اور حضور ﷺ کے اپنے چچا جناب ابوطالب (جن دونوں کا کفر پر خاتمہ ہوا تھا ان) کے لیے دعا و استغفار کرنے پر یہ ممانعت آئی۔

(۲) خود ایصالِ ثواب کرنے والا بھی صحیح العقیدہ ہو۔ اگر ایصالِ ثواب کرنے والا بدعقیدہ اور بے ایمان ہے تو قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ وَ إِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ○﴾ (سورة آل عمران / ۱۷۹)

ترجمہ: اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اجرِ عظیم کے حقدار ہوگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بے ایمان اجرِ آخرت کا مستحق نہیں ہے، اور جب بے ایمان کو خود اس کے عمل پر (آخرت میں) کوئی اجر نہیں ملنے والا ہے، تو کسی دوسرے کو اس کے عمل کا اجر کیسے مل سکتا ہے۔ (۳) جو عمل کیا جائے وہ صحیح ہو۔ اور شرعی طریقہ کے مطابق اخلاصِ نیت و اتباعِ سنت کے مطابق ہو، یعنی رسومات اور خرافات و بدعات سے پاک ہو، آج کل اہلِ ہوا و ہوس نے ایصالِ ثواب کی بنیاد پر تیجہ، دسواں، چالیسواں اور عرسِ سالانہ وغیرہ مختلف قسم کی بدعات اور نہایت قبیح رسومات کو گھڑ لیا ہے ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص مذکورہ شرائط کی رعایتوں کے ساتھ ایصالِ ثواب کا اہتمام کرتا ہے، تو اگرچہ یہ فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن بلاشبہ یہ جائز بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔

"لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ" کا مطلب:

اب جہاں تک معتزلہ اور (دورِ حاضر میں گویا ان کی ایک شاخ) غیر مقلدین کے اس نظریہ کی بات ہے کہ ارشادِ باری: ﴿ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ (نجم/۳۹) کے بموجب انسان کو صرف اپنی سعی و عمل سے نفع ہوتا ہے، دوسرے کے عمل سے نہیں، اس لیے کسی عمل کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچایا جاسکتا۔ تو اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آیت اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر سلامتیٔ فہم کے ساتھ معمولی غور و فکر سے بھی کام لیا جائے تو اس سے یہ غلط فہمی دور ہوسکتی ہے، یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ آیت میں لفظِ " لِلْاِنسان " پر جو "ل" ہے، اس کے متعلق دو احتمال ہیں: (۱) ملکیت کے لیے ہے۔ (۲) انتفاع کے لیے ہے۔ پہلی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان صرف اپنی ہی سعی و محنت اور عمل کا مالک و مختار ہے، دوسروں کی محنت و سعی اور عمل کا نہ وہ مالک ہے نہ مختار ہے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں، اور جب انسان اپنے عمل و سعی کا مالک و مختار ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا کوئی عمل اور چیز کسی دوسرے کو ہدیہ کردے، ایصالِ ثواب میں یہی تو ہوتا ہے، اس اعتبار سے اگر یہاں "ل" کو ملکیت کے لیے مانتے ہیں تو اِسی آیت سے گویا ایصالِ ثواب کی تائید ہوتی ہے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ "ل" کا استعمال اکثر ملکیت ہی کے لیے ہوتا ہے، قرآنِ کریم میں بھی اس کا اکثر استعمال اسی معنیٰ میں ہوا ہے۔

اور اگر دوسری صورت کے مطابق "ل" کو انتفاع کے لیے لیا جائے تو اس کا مطلب اور مفاد یہ ہوگا کہ "انسان کو اپنی ہی سعی و عمل سے نفع ہوتا ہے، اور اسکی اپنی ہی کمائی اس کے کام آتی ہے"، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کو اپنے ذاتی عمل کے سوا کسی دوسری چیز سے مطلقاً کوئی فائدہ اور نفع پہنچ ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ یہ بات شرعاً و عقلاً ہر اعتبار سے غلط ہے، شرعاً تو اس لیے کہ مثلاً قرآنِ کریم نے جابجا انفاق کا حکم دیا، کہیں ترغیبی انداز میں تو کہیں ترہیبی انداز میں، جس کا خلاصہ یہی ہے کہ تم اپنی کمائی اور مال سے دوسروں کو نفع پہنچاؤ،

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک شخص محنت کر کے کماتا ہے، اور بہت سوں کو کھلاتا اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ نفع پہنچاتا ہے، علیٰ ہٰذا قرآن بتلاتا ہے کہ ایک شخص کے مرجانے سے اس کا مال اس کے ورثہ کو ملتا ہے، اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی ایک کی سعی و عمل سے دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں ایک کے خون وغیرہ سے دوسرے کو نفع پہنچنا بھی اس کی واضح نظیر ہے۔ آخرت میں بھی اسی طرح ہوگا کہ اپنے نیک عمل کے علاوہ ربِ کریم کی رحمت اور نبیٔ کریم ﷺ کی شفاعت سے بہت سے ایمان والوں کو بہت کچھ ملے گا۔

اس لیے یہ نظریہ کہ کسی انسان کو اپنی سعی و عمل کے علاوہ کسی دوسری چیز سے کوئی نفع نہیں پہنچتا صحیح نہیں ہے، آیتِ کریمہ میں "ل" کو اگر انتفاع کے لیے مانا جائے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ حصر محض اضافی اور عرفی ہے، یہ منطقی طرز کا حصرِ حقیقی نہیں ہے، اور اس کا مقصد انسان کی اپنی سعی کے علاوہ جمیع ما سویٰ سے نافعیت کی نفی کرنا نہیں، بلکہ خاص طور پر مشرکین کی غلط فہمیوں کو دور کرنا مقصود ہے، جن میں وہ مبتلا تھے اور آج بھی ہیں، مثلاً بنواسرائیل سمجھتے تھے کہ ہم چوں کہ انبیاء کی اولاد ہیں، اس لیے جنت میں تو ہم ہی جائیں گے، اسی طرح عیسائی سمجھتے تھے کہ یسوع مسیح سولی پر چڑھ کر ہم تمام کی طرف سے کفارہ ادا کرچکے، اسی طرح مشرکین عرب کا خیال تھا کہ ہمارے دیوتاؤں کا اللہ سے خاص تعلق ہے، لہٰذا یہ ہماری نجات کا ذریعہ بنیں گے، آیتِ کریمہ میں اس قسم کے توہمات و بے اصل خیالات کی نفی مقصود ہے، اور مطلب صرف یہ ہے کہ اس طرح غلط فہمیوں اور جھوٹی امیدوں میں مبتلا نہ رہئے کہ ہمارے آباء و اجداد اور پیشواؤں کی وجہ سے ہم نجات پا جائیں گے، اور ان کے نیک اعمال ہمیں بھی جنت میں لے جائیں گے، بلکہ تمہارے کفر کی وجہ سے ان کی نجات اور نیکیوں سے تمہیں کوئی نفع نہ ہوگا۔

حضرت ربیع بن انسؓ سے منقول ہے کہ یہ حکم صرف کافروں کے حق میں ہے،

مسلمانوں کے حق میں نہیں۔ (تفسیر مظہری: ۱۲/۳۲۴)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ’’آیت کریمہ میں سعیِ ایمانی مراد ہے، جو آخرت میں غیر (مومن) کے لیے کار آمد نہیں ہوسکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی اور کی ہوجائے، اور حدیث میں سعیِ عملی مراد ہے جو ایک دوسرے کے کام آسکتی ہے۔‘‘ (’’متاعِ وقت اور کاروانِ علم‘‘/۱۰۳، بحوالہ: پیش لفظ فتاویٰ دار العلوم)

لیکن عاجز کے ناقص خیال میں اس کی سب سے بہترین توجیہ وہ ہے جو امام آلوسیؒ سے منقول ہے کہ انسان کو حق کی حیثیت سے جو اجر حاصل ہوگا وہ تو صرف وہ ثواب ہے جو خود اس کے اپنے عمل پر مبنی ہو، اس کے سوا جو ثواب ہوگا وہ اللہ کے فضل کی وجہ سے ہوگا، ورنہ انسان اصلاً اس کا حقدار نہیں ہوگا، تو گویا ایصالِ ثواب کی صورت میں اجر و ثواب کا ملنا یہ بھی ربِ کریم کے فضلِ عظیم کی علامت ہے، لہٰذا کہنے دیجیے:

کرلو ایصالِ ثواب اللہ کے واسطے ☆ مرنے کے بعد محتاج ہوجاؤ گے عمل کے واسطے

اور

بے شک اے مومن! تجھ پر ہے فضل باری ☆ کہ مرنے کے بعد بھی ہے تیرا ثواب جاری

اے رب کریم! دارین میں ہمیں بھی فضل عظیم سے نواز دے۔ آمین۔

۱۲/ ربیع الاول/ ۱۴۳۶ھ
مطابق: ۴/ جنوری/ ۲۰۱۵ء/ بروز: اتوار

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

78

(۱۳)

اللہ پاک کا انعامِ عظیم الشان بصورتِ مکان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ’’اِتَّقُوا الْحَرَامَ فِي الْبُنْيَانِ؛ فَإِنَّهُ أَسَاسُ الْخَرَابِ.‘‘ (مشكوٰة المصابيح: ٤٤٤/كتاب الرقاق/الفصل الثالث، بحواله: بيهقى فى شعب الإيمان: ٧/٤٩٣، رقم الحديث: ١٠٧٢٢)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’بنیان (مکان اور اس کی تعمیر وغیرہ) میں حرام مال (خرچ کرنے) سے بچو؛ کیوں کہ یہ (دینی یا خود تعمیری اعتبار سے) ویرانی کی جڑ ہے۔‘‘

مکان یہ ایمان کے بعد اللہ کا عظیم الشان انعام ہے:

اللہ رب العزت نے اس فانی دنیا کی مختصر سی زندگی کو سکونِ قلبی کے ساتھ گذارنے

کے لیے انسان کو تین نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک عظیم الشان نعمت انسان کا اپنا ذاتی گھر اور مکان بھی ہے۔ مکان انسان کی بنیادی اور اصلی ضرورت ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ حضور ﷺ نے وضو کے درمیان پڑھی جانے والی دعا میں رزق میں برکت سے پہلے مکان میں وسعت کی دعا مانگی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَ وَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَ بَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ". (عمل الیوم واللیلۃ)

اور یہ ضرورت کرایہ کے یا دوسرے کے مکان میں مقیم ہونے سے بھی پوری تو ہو جاتی ہے، لیکن اگر کسی کے پاس اپنا ذاتی عمدہ یا سادہ مکان ہے تو یقیناً یہ اس کے لیے اللہ پاک کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے جہاں اپنی مختلف نعمتوں کو بیان فرمایا وہاں مکان کا بھی تذکرہ کیا ہے، فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ (سورۃ النحل / ۸۰)

ترجمہ: اور اللہ نے تمہارے لیے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مکان بھی اللہ کا وہ عظیم الشان انعام ہے جو سکونِ زندگی کا باعث ہے۔

سکونِ زندگی کے لیے دوسری نعمت گھر کے ساتھ گھر والی اور بیوی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا﴾ (روم / ۲۱)

ترجمہ: اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔

پتہ چلا کہ میاں بیوی کو اللہ نے ایک دوسرے کے لیے سکون کا باعث بنایا۔

اور تیسری چیز ہے رات، ارشادِ باری ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾ (سورۃ یونس/۶۷)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں سکون

حاصل کرو۔

معلوم ہوا انسان کے پاس اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں یہ تین وہ نعمتیں ہیں جو سکونِ زندگی اور سکونِ قلبی کا باعث ہیں، اب جو لوگ اپنے گھر میں گھر والی کے ساتھ رات گذارتے ہیں عموماً ان کی زندگی پُرسکون ہوا کرتی ہے، لیکن اگر رات بھی ہے، اور گھر والی ساتھ بھی ہے، لیکن گھر نہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس اللہ کی بہت سی نعمتیں ہوں، لیکن وہ مکان کی نعمت سے محروم ہو، تو وہ شخص بڑی حد تک سکونِ زندگی اور بعض اوقات تو ایمان ہی سے محروم ہو جاتا ہے، اس لیے بعض بزرگوں نے یہ عجیب بات ارشاد فرمائی کہ "لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا مَكَانَ لَهٗ" مکان کے بغیر ایمان نہیں، آج بہت سے لوگ مکان کے حصول کے لیے ایمان تک کا سودا کر لیتے ہیں، اس لیے ایمان کے بعد (دنیا کی مادّی نعمتوں میں سے ایک) عظیم الشان نعمت ذاتی مکان ہے، خواہ وہ معمولی درجہ کا اور سادہ ہی کیوں نہ ہو۔

مکان کا پہلا درجہ "رہائش" ہے:

ویسے مکان کے مختلف درجات ہیں، چنانچہ حضرت شیخ الاسلام علامہ تقی عثمانی مدظلہٗ نے اپنے مواعظ (اصلاحی خطبات: ۱۸/ ۲۲۵) میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے حوالہ سے مکان کے چار درجات اور ان کے احکام بیان فرمائے، جن میں پہلا درجہ "رہائش" کا ہے، یعنی مکان رہائش کے قابل ہو، قبرستان کی طرح ویران اور پریشان کن نہ ہو، بلکہ ایسا ہو جس میں آدمی اپنے کنبہ کے ساتھ دھوپ، بارش، گرمی، سردی اور موسم کے برے اثرات سے حفاظت کے ساتھ زندگی گذار سکے، اب یہ ضرورت کسی ایسے سادہ مکان سے بھی پوری ہو سکتی ہے کہ جس میں نہ پلاسٹر ہو نہ رنگ روغن، ایسا سادہ ذاتی مکان بھی اللہ کی نعمت ہی ہے، اور خود حضورِ اکرم ﷺ کا مکان بھی ایسا ہی سادہ تھا، حالاں کہ آپ ﷺ اگر چاہتے تو عالی شان مکان بنوا سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے امت کے غریب ترین فرد کی سطح پر آکر زندگی گذاری، تاکہ آپ ﷺ کے غریب سے غریب امتی کو یہ تسلی ہو جائے کہ ہمارے آقا بھی

ہماری طرح سادہ زندگی گذارتے تھے، اس لیے عمدہ مکان بنانا اگرچہ جائز ہے، لیکن سادہ مکان میں زندگی گذار دینا آپ ﷺ کا پسندیدہ طریقہ ہے۔

شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کا مکان:

اسی وجہ سے بعض صحابہؓ تو بالقصد سادہ مکان اپنے لیے گنجائش کے باوجود پسند فرماتے تھے، چنانچہ منقول ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے زمانہ میں شام کے گورنر تھے؛ کیوں کہ اس کے اکثر علاقے ان کی کوشش سے فتح ہوئے تھے، (اِس وقت تو شام چار ممالک میں منقسم ہے، جن میں شام، اُردن، فلسطین اور لبنان ہیں، لیکن اس وقت یہ چاروں ممالک اسلامی ریاست کا ایک صوبہ تھے، اور اس کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ تھے۔) شام کا علاقہ بڑا زرخیز تھا اور وہاں مال و دولت کی ریل پیل تھی، سیدنا فاروقِ اعظمؓ مدینہ طیبہ میں رہ کر سارے عالمِ اسلام کی کمان کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ معاینہ کے لیے شام کے دورہ پر تشریف لائے، اس دوران ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے فرمایا: ''میں تمہارا مکان دیکھنا چاہتا ہوں''، اس خواہش پر حضرت ابوعبیدہؓ فاروقِ اعظمؓ کو شہر سے باہر لے کر آئے، اور آبادی سے باہر جا کر کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ایک سادہ مکان دکھایا، جس میں بہت ہی مختصر سا سامان تھا، حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: ''اے ابوعبیدہ! اللہ کی قسم! دنیا کی اس ریل پیل نے تم کو ذرّہ برابر نہیں بدلا، تم ویسے ہی ہو جیسے حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے، اس دنیا نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔'' (سیر اعلام النبلاء:۱/۱۶)

کہتے ہیں کہ کچھ چیزوں کی کبھی شکایت نہ کرو: (۱) اولاد کے سامنے اپنے بڑوں کی۔ (۲) غیر کے سامنے اپنے دوست کی۔ (۳) رخصت کرنے کے بعد مہمان کی۔ (۴) اپنی تقدیر کی۔ (۵) ذاتی مکان ہوتے ہوئے اس کی تنگی کی۔ یاد رکھو! مہنگائی کے اس دور میں اگر کسی کے پاس اپنا ذاتی مکان ہے جس میں وہ اپنے کنبہ کے ساتھ سکون سے رہتا

ہے، تو یہ معمولی اور ادنیٰ درجہ کا قابل رہائش مکان بھی اللہ کی نعمت ہی ہے، اس کی قدر ان سے پوچھو جو بے گھر ہونے کی وجہ سے دردر پھرتے ہیں۔

مکان کا دوسرا درجہ ''آسائش'' ہے:

لیکن اگر اللہ نے کسی کو سہولت عطا فرمائی ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے قابل رہائش مکان کو آرام اور آسائش کے قابل بنانا چاہتا ہے، تو مکان کا دوسرا درجہ آسائش کا ہے، مطلب یہ ہے کہ مکان کو آرام و راحت کے قابل بنایا جائے، مثلاً مکان کی چھت ٹین کی ہے، تو ایسا مکان رہائش کے قابل ضرور ہے، لیکن اس میں بارش میں چھت ٹپکتی ہے، اور گرمی میں تپتی ہے اس لیے آسائش اور آرام کی غرض سے چھت کو پکا بنا دیا، یا پلاسٹر کے ذریعہ اس کی دیواروں کو مزید پختہ کر دیا، تو اس کی بھی اِجازت ہے، بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ نے جسے سہولت عطا کی ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنا اور اہل وعیال کے آرام کا خیال کرتے ہوئے مکان کو قابل آسائش اور پختہ ہی بنائے، خواہ مخواہ تکلف سے کام نہ لے؛ کیوں کہ قرآن و حدیث میں اہل ایمان کے اتحاد کو ''بنیان'' سے تشبیہ دی ہے، جس کا مطلب ہے مضبوط عمارت، اور ارشادِ باری ہے: ﴿كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (صف/٤) نیز ارشادِ نبوی ہے: ''اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ'' (مشكوٰة: ٤٢٢) یعنی ایمان والے اپنے اتفاق واتحاد میں مضبوط عمارت اور مکان کے مانند ہیں، تو اس میں ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ مکان بھی پختہ اور مضبوط ہونا چاہیے، اور یہ کوئی ناجائز نہیں، شرعاً اس کی اجازت ہے کہ مکان قابل آسائش اور مضبوط بنایا جائے۔ اللہ نے اگر اپنے فضل سے کسی کو آسائش والا مکان عطا فرمایا ہو تو یہ قابل رہائش مکان سے بڑی نعمت ہے۔

مکان کا تیسرا درجہ ''آرائش'' ہے:

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اللہ کی عطا کردہ سہولت اور وسعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

مکان کو"رہائش" اور" آسائش" سے بڑھ کر" آرائش" کے قابل بنائے، تو مکان کا تیسرا درجہ آرائش ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مکان کو آرام و راحت کے قابل بنانے کے علاوہ مناسب طریقہ پر سجاوٹ کر کے اسے خوبصورت بنا دیا جائے، تو اس کی بھی رخصت کے درجہ میں اجازت ہے، مثلاً ایک شخص نے اپنے رہنے کے قابل مکان تو بنا لیا، لیکن اس میں پلاسٹر نہیں کیا، یا پلاسٹر بھی کیا، لیکن اس میں رنگ روغن نہیں کیا، تو ایسا مکان اگر چہ قابل رہائش ہے، اور اس میں فی الجملہ آسائش و آرام کا بھی انتظام ہے، لیکن آرائش اور زیب و زینت کا اہتمام نہیں، اس لیے دیکھنے میں ذرا اچھا نہیں لگتا، اب اگر کوئی شخص اللہ کے دیے ہوئے رزقِ حلال سے اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے فضول انہماک اور اشتغال کے بغیر فرنیچر وغیرہ کے ذریعہ مکان کو مناسب درجہ میں خوبصورت بنا لے، تو یہ بھی جائز ہے، بلکہ یہ قابل آرائش مکان بھی قابل آسائش مکان سے بڑی نعمت ہے۔

اور صاحبو! یہ در اصل سرکارِ دو عالم ﷺ کی قربانیوں کا صدقہ ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ خود اس سلسلہ میں نہایت سادگی کے ساتھ زندگی بسر فرما کر تشریف لے گئے، لیکن امت کے لیے سہولت اور رخصت کے دروازے کھول گئے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں فرمایا کہ جب تک تم بھی ایسی سختی و سادگی والی زندگی بسر نہیں کرو گے جس طرح حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے بسر کی، وہاں تک تم نجات نہیں پاؤ گے، تو یقیناً اس مطالبہ پر بڑے بڑے اولیاء، صوفیاء اور علماء فیل ہو جاتے، لیکن قربان جایئے حضور ﷺ کی سادگی پر! کہ خود سختی و سادگی کے ساتھ زندگی بسر فرما دی، اور ہمارے لیے رخصت و سہولت پیدا فرما دی، لہٰذا اللہ نے اگر کسی کو سہولت و وسعت عطا فرمائی ہے اور وہ اپنے رزقِ حلال سے مکان کو قابل آرائش بناتا ہے، تو اس کی بھی اجازت ہے۔

مکانوں کی سجاوٹ علامتِ قیامت:

البتہ اس میں غلو کرنا یا اسراف سے کام لینا ظاہر ہے اس کی اجازت نہیں، اس لیے

کہ حدیثِ پاک کے مطابق یہ علاماتِ قیامت میں سے ہے:

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَبْنِيَ النَّاسُ بُيُوْتًا يُوَشُّوْنَهَا وَشْيَ الْمَرَاحِيْلِ." (رواه البخاری فی الأدب المفرد / باب البناء، اصلاحی خطبات : ۲۲۱/۱۸)

ترجمہ: رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک لوگ ایسے گھر نہ بنائیں جن کو وہ ایسے نقش و نگار سے آراستہ کریں گے جیسے نقش و نگار والے کپڑے۔

یعنی قیامت کی علامت یہ بھی ہے کہ دیدہ زیب اور خوشنما قسم کے نقش و نگار والے کپڑوں کی طرح مکانوں کو بھی سجایا جائے گا، علماءِ محدثین فرماتے ہیں کہ مکان کو مزین و منقش کرنا شرعی حدود میں رہتے ہوئے تو جائز ہے، لیکن آپ ﷺ نے اس کو علامتِ قیامت قرار دے کر ایک ہلکا سا اشارہ اس طرف فرما دیا کہ یہ بات پسندیدہ نہیں کہ آدمی اپنی دولت و صلاحیت کا بڑا حصہ اسی میں لگا دے اور آخرت سے بے فکر ہو جائے۔

مکان کا چوتھا درجہ "نمائش" ہے:

اگر اس نقش و نگار اور آرائش کا مقصد نمائش اور دِکھلاوا ہو تو یہ حرام ہے، حدیثِ مذکور میں رحمتِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: " اِتَّقُوْا الْحَرَامَ فِی الْبُنْيَانِ؛ فَإِنَّهٗ أَسَاسُ الْخَرَابِ." مکان میں حرام سے بچو؛ کیوں کہ وہ ویرانی کی جڑ ہے۔ شراحِ حدیث کے قول کے مطابق اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ کے تحت بیان ہوا، یعنی مالِ حرام سے مکان کی تعمیر نہ کرو، یہ چیز دین و دنیا ہر اعتبار سے ویرانی کی جڑ ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مکانوں میں حرام امور اور گناہوں کے ارتکاب سے بچو، یعنی مکان اس لیے نہ بناؤ کہ اس میں فسق و فجور اور گناہ کیے جائیں، جیسے دورِ حاضر میں خاص اس مقصد کے لیے کلب (Club) وغیرہ بنائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دین و دنیا دونوں اعتبار سے خرابی کی جڑ

ہے۔ بعض حضرات نے ایک اور مطلب یہ بھی مراد لیا ہے کہ تعمیر مکان کا جو درجہ حرام ہے، یعنی نمائش کا، اس سے بچو؛ کیوں کہ مکان کتنا ہی مضبوط بنا لیا جائے، بالآخر فنا ہونے والا ہے، جب دنیا کی ہر شئی کو فنا ہے تو تمہارا یہ نمائشی مکان کس شمار میں ہے۔ دانائے رومؒ فرماتے ہیں:

می نماند در جہاں یک تارِ مو ☆ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ

ترجمہ: دنیا میں ایک بال بھی باقی نہ رہے گا، سوائے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات کے ہر چیز کو فنا ہے۔

لہٰذا آدمی کتنی ہی جاندار اور شاندار عمارت بنا لے، ایک نہ ایک دِن وہ فنا ہو کر ہی رہے گی، کسی عربی شاعر نے نہایت نصیحت آمیز اشعار کہے ہیں:

أَلَا يَا سَاكِنَ الْقَصْرِ الْمُعَلّٰى ☆ سَتُدْفَنُ عَنْ قَرِيْبٍ فِيْ التُّرَابِ
قَلِيْلٌ عُمْرُنَا فِيْ دَارِ دُنْيَا ☆ فَمَرْجِعُنَا إِلٰى بَيْتِ التُّرَابِ
لَهٗ مَلَكٌ يُّنَادِيْ كُلَّ يَوْمٍ ☆ لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَ ابْنُوْا لِلْخَرَابِ

ترجمہ: اے اونچے محلوں میں رہنے والو! عن قریب مٹی میں دفن ہو جاؤ گے، دنیا میں ہماری عمریں بہت کم ہیں، ہمارے لوٹنے کی جگہ تو قبر ہے، روزانہ ایک فرشتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کرتا ہے کہ بچے جنو مرنے کے لیے اور عمارت بناؤ ویرانی کے لیے۔

تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ ہے کہ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ نے نہایت شاندار نمائشی محل تعمیر کرایا، حسن و جمال کے سارے اسباب اور زیبائش و نمائش سے مزین و منقش محل تعمیر ہونے کے بعد جو بھی اس کا نظارہ کرتا بادشاہ کو دادِ تحسین پیش کرتا، اور خود بادشاہ بھی اپنے نمائشی محل کے متعلق ہر کسی سے پوچھتا رہتا کہ ’’محل کیسا لگا؟ کوئی عیب یا نقص تو اس میں نہیں؟‘‘ اب کسی کی کیا مجال جو اس خوبصورت محل میں خامی نکالتا؟ ہر کوئی اس کی

تعریف کے پل باندھتا اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتا کہ حضورِ والا! آپ کا یہ محل بلاشبہ بے نظیر و بے مثال ہے۔

مگران میں ایک اللہ کا بندہ ایسا بھی نکل آیا جس نے اس نمائشی محل میں ایک نہیں، بلکہ دو دو عیب ڈھونڈ نکالے، عرض کیا: ’’بادشاہ کا محل یوں تو بڑا شاندار ہے، مگر اس میں دو عیب بھی ہیں۔‘‘ بادشاہ نے حیرت و غیظ و غضب کے ملے جلے انداز میں پوچھا، تو فرمایا: ’’اس کا ایک عیب تو یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا اس کی خوبصورتی اور مضبوطی میں کمی ہوتی جائے گی، اور دوسرا عیب یہ ہے کہ ایک دِن دنیا سے اس کا مالک اسے یوں ہی چھوڑ کر چلا جائے گا، یعنی یا تو محل کا مالک نہیں رہے گا، یا پھر محل نہیں رہے گا۔‘‘

سنتے ہی بادشاہ ایک گہرے فکر میں ڈوب گیا، اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی، خوبصورت محل مٹی کا ڈھیر معلوم ہونے لگا، اسی وقت سچی توبہ کی اور فکرِ آخرت، جنت اور اس کے دائمی محلات وانعامات کے حصول میں مشغول ہو گیا۔ (صداقت و عزیمت کے تابندہ نقوش/ص:۱۴)

حق تعالیٰ ہمیں بھی معصیت سے توبہ اور فکرِ آخرت کی دولت سے مالا مال فرما کر جملہ معاصی و نمائشی امور سے محفوظ فرما کر ہمارے تعمیر و ترمیمِ مکان کے تمام مراحل کو آسان فرمائے۔ آمین۔

۱۷/ ربیع الاول/ ۱۴۳۶ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۹/ جنوری/ ۲۰۱۵ء (بزمِ صدیقی)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۱۴)

اسلام میں قرض کے احکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: " مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ أَدَاءَ هَا، أَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ، وَ مَنْ أَخَذَ يُرِيْدُ إِتْلَافَهَا، أَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ."

(بخاری، مشکوٰۃ: ۲۵۲، باب الإفلاس والإنظار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص لوگوں سے (قرض اور اُدھار کا) مال ادائیگی کی نیت سے لے اور اس کے لیے کوشش بھی کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دیں گے۔ (قرض کی ادائیگی میں اس کی مدد فرمائیں گے، اور اگر وہ دنیا میں ادائیگی کی کوشش کے باوجود ادا نہ کر سکا تو آخرت میں اس کی طرف سے ادا فرما کر اس کو سبکدوش فرما دیں گے اور صاحبِ حق کو راضی کر لیں گے) اور جو شخص کسی سے (بلا ضرورت) مال قرض کے طور پر لے اور پہلے ہی سے اس کا ارادہ برا تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کو تلف اور تباہ کر دیں گے۔'' (نہ اس کی مدد فرمائیں گے، نہ اس کے رزق میں وسعت پیدا فرمائیں گے، بلکہ اس کے مال ہی کو ہلاک کر دیں گے، اور آخرت میں بھی اس کے لیے وبالِ عظیم ہوگا۔ العیاذ باللہ العظیم)

قرض کی ضرورت واجازت:

اللہ رب العزت نے دنیا کے اس دارالاسباب میں انسان کو مختلف ضروریات کے ساتھ پیدا فرمایا، اس لیے دنیا کا ہر انسان اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے، ان میں قناعت پسند انسان تو اپنی مناسب تدبیر اور جائز کوشش کے بعد جو کچھ اسے میسر آجاتا ہے اسی پر قناعت اختیار کر لیتا ہے، اور اپنا گذر بسر کر لیتا ہے، اس کے باوجود بعض اوقات اپنی اور اہل وعیال کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے اسے بھی قرض لینے کی نوبت آجاتی ہے، اگرچہ قناعت کے ساتھ زندگی گذارنے والوں کو قرض لینے کی نوبت کم ہی آتی ہے، لیکن اس دنیا میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جن کو کبھی بھی قرض لینے کی ضرورت پیش ہی نہ آتی ہو، اور ایسا بھی نہیں کہ قرض کی ضرورت صرف بے سہارا اور غریب ومجبور لوگوں ہی کو پیش آتی ہو، بلکہ کبھی کبھی بڑے بڑے دولتمندوں حتیٰ کہ بڑی بڑی حکومتوں تک کو پیش آجاتی ہے، مثلاً ایک شخص اپنے وطن میں گھر پر لاکھوں روپئے کا مالک ہوتا ہے، مگر سفر میں کسی وقت وہ چند روپیوں کے لیے مجبور اور محتاج ہو جاتا ہے، یا ایک آدمی ہزاروں روپئے مہینے میں کماتا ہے، اور اس کے اہل وعیال اچھی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ وہ یک بیک مر جاتا ہے، اور بعد میں اس کے بیوی بچے اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اسی طرح بڑی بڑی حکومتیں جو کئی ممالک کو قرض دیتی ہیں، جنگ کے زمانے میں معمولی آمدنی رکھنے والے افراد تک سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

غرض یہ کہ انسانی زندگی میں بعض اوقات قرض کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے، اور شریعتِ مطہرہ کا ایک اہم ترین مقصد رفع حرج یعنی انسان سے ناقابل برداشت حرج اور تنگی کو دور کرنا بھی ہے۔

اس لیے کسی جائز مقصد اور ضرورت کے لیے شدید مجبوری کے وقت شریعت نے

چند اخلاقی و قانونی پابندیوں کے ساتھ قرض لینے کی اجازت بھی ہمیں عطا فرمائی، اور خود صاحب شریعت رحمت عالم ﷺ نے بھی ضرورت کے وقت اپنے ساتھیوں بلکہ غیر مسلموں اور یہودیوں سے بھی قرض لیا ہے، پھر ادائیگی کے وقت "هَلْ جَزَاءُ الإِحْسَانِ إِلَّا الإِحْسَانُ" کے اصول پر حق واجب سے زیادہ اور بہتر طریقے سے ادا بھی فرمایا ہے، اور یہی سنت بھی ہے، (بشرطیکہ کسی شرط اور معاہدہ کی بنا پر نہ ہو)

قرض کی حقیقت اور بلاضرورت قرض لینے کی مذمت:

لیکن چوں کہ قرض بذاتِ خود کوئی اچھی چیز بھی نہیں، اس کی وجہ سے بعض اوقات اچھے خاصے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں، کیوں کہ قرض کے اصل معنیٰ کاٹنے کے ہیں، اسی لیے قینچی کو عربی میں مقراض کہتے ہیں، کہ وہ کاٹنے کا ذریعہ اور آلہ ہے، اب جو آدمی قرض یا اُدھار کوئی چیز یا رقم لیتا ہے وہ گویا اپنی آمدنی یا جمع شدہ رقم کا ایک حصہ کاٹ کر اس کو دیتا ہے، اور غالبًا اس لیے بھی اس کو قرض کہتے ہیں کہ اگر قرض خواہ اور قرض دار، اسلام میں قرض کے جو احکام ہیں ان کی رعایت نہ کریں تو پھر دونوں کے تعلقات کو یہ قرض کاٹ دیتا ہے، اسی لیے یہ ضرب المثل مشہور ہے: "اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمَحَبَّةِ" (قرض محبت کی قینچی ہے) قرض سے بسا اوقات محبت ختم ہوجاتی ہے، اس لیے رحمت عالم ﷺ قرض کو اتنی مذموم چیز سمجھتے تھے کہ سوتے وقت اور پنج وقتہ نمازوں کے اخیر میں جن چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے ان میں بطورِ خاص قرض سے آپ ﷺ ضرور پناہ مانگتے تھے، فرماتے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَ الْمَغْرَمِ". (بخاری/باب من استعاذ من الدَّین)

اے اللہ! میں معصیت اور قرض کے بوجھ سے پناہ مانگتا ہوں، عموماً قرض دار آدمی کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ایک قیدی کی ہوتی ہے، یعنی جس طرح قیدی میں بلندی، عزت اور آزادی کے بجائے احساسِ کمتری، ذلت اور غلامی کا تصور پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح مقروض میں بھی یہ باتیں پیدا ہوجاتی ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ "صَاحِبُ الدَّيْنِ مَأْسُوْرٌ

بِدَيْنِهٖ" (مشکوٰۃ: ۲۵۲) قرض دار آدمی اپنے قرض کا قیدی ہوتا ہے، پھر یہ قرض دِن میں رسوائی اور رات میں بے چینی کا سبب ہے۔ حضرت لقمانؒ نے فرمایا کہ "میں نے بہت سے بوجھ اٹھائے؛ لیکن قرض سے زیادہ بھاری کسی چیز کو نہ پایا۔" قرض کی اسی حقیقت کے پیش نظر ہمارے علماء نے فرمایا کہ شریعت نے کسی جائز مقصد اور شدید ضرورت کے وقت جو قرض کی اجازت دی ہے تو وہ اجازت ایسی ہی ہے جیسے کسی مجبور آدمی کے لیے مردار کھانے کی اجازت، جس طرح انتہائی مجبوری میں بقدرِ ضرورت ہی اس کی اجازت ہے بالکل اسی طرح انتہائی مجبوری میں بقدرِ ضرورت حسب وعدہ ادا کرنے کی نیت ہی کے ساتھ قرض لینے کی اجازت ہے۔

قرض کی ادائیگی کے متعلق نصرتِ الٰہی کا ایک واقعہ:

پھر اس صورت میں اللہ تعالیٰ قرض لینے والے کی نصرت بھی فرماتے ہیں، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں ارشاد ہوا کہ "مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ أَدَاءَ هَا، أَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ" عاجز کے ناقص خیال میں اس کا مطلب یہی ہے کہ جو شخص انتہائی مجبوری میں ضروری قرض ادائیگی کی نیت سے لیتا ہے، پھر حسب استطاعت اس کی کوشش بھی کرتا ہے، تو حق تعالیٰ قرض کی ادائیگی میں اس کی بھرپور مدد فرماتے ہیں، اس کے لیے رزق میں وسعت کے ساتھ اسبابِ سہولت پیدا فرمادیتے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں بخاری شریف میں ایک واقعہ تین جگہ منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کو انتہائی مجبوری میں قرض کی ضرورت پیش آئی، تو اس نے اپنے ایک دوست سے اس کا مطالبہ کیا کہ مجھے ایک ہزار درہم قرض چاہیے، میں فلاں وقت تک اپنی ذمہ داری سے ادا کردوں گا، اس پر اس نے کوئی وکیل، کفیل اور گواہ طلب کیا، کیوں کہ قرض دینے والے کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ مقروض سے اپنے دیے ہوئے قرض کے لیے کوئی وثیقہ اور اطمینان حاصل کرلے، تاکہ اس کے لیے یہ ثبوت یا قرض کی وصول یابی کا ذریعہ بن سکے،

یہ وثیقہ تین طرح کا ہوسکتا ہے: (۱) دستاویز۔ (۲) کفیل۔ (۳) رہن۔

دستاویز سے مراد یہ ہے کہ قرض کے سلسلہ میں کوئی تحریر مرتب کرلی جائے اور اس پر مقروض کی طرف سے وصولی کے دستخط لے لیے جائیں، اس میں مزید تاکید وتوثیق کے لیے دو گواہوں کے دستخط بھی لیے جاسکتے ہیں، خود قرآن نے بھی اس کی تلقین کی ہے، چنانچہ فرمایا:
﴿يٰأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ (البقرہ: ٢٤٢)

کفالت سے مراد یہ ہے کہ مقروض کی طرف سے کوئی شخص اس بات کی ذمہ داری قبول کرلے کہ اگر کسی وجہ سے مقروض نے قرض ادا نہ کیا تو وہ اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا۔ اور رہن کا مطلب یہ ہے کہ قرض دہندہ مقروض سے کوئی ایسی چیز اپنے پاس رکھوالے جس کو بوقتِ ضرورت فروخت کرکے قرض وصول کرنا ممکن ہو۔ (قاموس الفقہ: ۴/۴۹۳)

بہر حال! قرض دینے والے نے وثیقہ اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے قرض لینے والے سے کفیل اور گواہ کا مطالبہ کیا، تو اس نے کہا کہ اس وقت تو کوئی کفیل اور گواہ موجود نہیں، لہٰذا میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں، وثیقہ کی ان تینوں صورتوں کی جو تلقین کی گئی تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اطمینان حاصل ہوجائے، اور اسی میں احتیاط بھی ہے، لیکن اگر اس کے بغیر بھی اطمینان حاصل ہوجائے تو پھر اس کی ضرورت نہیں، الغرض جب قرض لینے والے نے اللہ کو گواہ بنانے کی بات کہی تو اس پر قرض دینے والا مطمئن ہوگیا اور اس نے ایک ہزار درہم قرض دے دیے، اور قرض لینے والے نے اس سے اپنی ضرورت پوری کرلی، اس کے بعد جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا تو اس کی سچی نیت کی بنا پر اللہ نے اس کا غیبی انتظام اس طرح فرمایا: بات یہ پیش آئی کہ جس وقت یہ اپنے دوست کا قرض ادا کرنے کی نیت سے چلا تو راستے میں سمندر پڑتا تھا، اور اتفاق سے ان دِنوں اس میں بہت زور کا طوفان تھا، جس کی وجہ سے یہ شخص بڑا فکرمند ہوا، بالآخر اس کے دل میں اللہ نے ایک بات ڈالی، اس نے قریب میں پڑی ہوئی ایک لکڑی کا صندوق بنا کر اس میں ایک ہزار درہم رکھ دیے، اور ساتھ ہی ایک

رقعہ میں یہ لکھ دیا کہ عزیزم! میں حسبِ وعدہ تمہارا قرض ادا کرنے کے لیے گھر سے چلا، تو سمندر میں طوفان تھا، اور کسی طرح آپ تک آنا ممکن نہ رہا، تو جس خدا کو گواہ بنا کر میں نے تم سے قرض لیا تھا اسی کے بھروسہ پر یہ ہزار درہم تم تک پہنچاتا ہوں، پھر اس نیت کے ساتھ اس نے یہ صندوق سمندر میں ڈال دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے یہ ہزار درہم پہنچادیے تو فبہا، ورنہ میں بعد میں ادا کردوں گا۔

دوسری طرف قرض دہندہ اپنے مقروض کا وقت پر انتظار کرنے لگا، اسی سلسلہ میں جب وہ سمندر کے کنارے گیا تو وہاں کشتی کے بجائے لکڑی کے صندوق کو دیکھا، اس نے اپنی ضرورت میں کام لانے کے خیال سے سمندر سے وہ صندوق اٹھالیا، گھر لاکر جب اسے کھولا تو ہزار درہم اور رقعہ کو پایا، تب اسے یقین آگیا کہ میرے مقروض نے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر قرض لیا تھا، پھر حتی المقدور اس کی ادائیگی کی کوشش کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی غیبی مدد فرمادی۔

قرض ادا کرنا فرض ہے:

اسی کو حدیث میں فرمایا کہ جو شخص بوقتِ ضرورت ادائیگی کی نیت سے قرض لیتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں، جس کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ یا تو دنیا ہی میں قرض کی ادائیگی کے اسباب پیدا کردیے جاتے ہیں، ورنہ قیامت کے دِن اس کی طرف سے صاحبِ حق کو راضی کردیا جائے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص قرض ادا کرنے کی نیت ہی نہیں رکھتا "وَمَنْ أَخَذَ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا" اس نے مال ڈوبانے کی نیت سے ہی قرض لیا ہے، تو یہ ایک طرح ظلم ہی ہے، جس کی نحوست حدیثِ مذکور میں یہ بیان فرمائی کہ "أَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ" اللہ اس کے مال کو ضائع کردے گا، اس کے مال سے برکت ختم ہوجائے گی، اور یہ چیز اس کے لیے دارین میں رسوائی و بربادی کا سبب بن جائے گی، اس لیے صاحبو! اگر مرض کا علاج ضروری ہے تو قرض کی ادائیگی بھی ضروری ہے، اور جیسے فرض ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح قرض ادا کرنا بھی فرض ہے، جس کی ادائیگی کے لیے مناسب تدبیر اور کوشش کے علاوہ

حضور ﷺ کی تلقین کردہ یہ دعا بھی بہت مفید ہے:

"اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ أَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ."

(ترمذی:۲/۱۹۵، مشکوٰۃ المصابیح : ۲۱۶)

اگر پہاڑوں کے برابر قرض بھی ہوگا تو ان شاء اللہ اس ترتیب پر عمل کرنے سے ادا ہوجائے گا۔ علاوہ ازیں اجتناب عن المعاصی اور اہتمامِ توبہ واستغفار بھی رزق میں برکت اور اداءِ قرض میں آسانی کے اسباب ہیں۔

قرض دینے کی فضیلت:

یہ وہ اسلامی احکام ہیں جن کا تعلق قرض لینے والے سے ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاضرورت قرض لینا اچھی بات نہیں، البتہ بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت ادائیگی کی نیت کے ساتھ قرض لینے کی اجازت ہے، اس کے بعد جو قرض دار حسبِ استطاعت کوشش کرتا ہے اس کی من جانب اللہ مدد کی جاتی ہے، اسلام نے ایک طرف جہاں مقروض کو ان احکام کا پابند کیا وہاں آسودہ حال لوگوں کو بھی اس بات کی ترغیب دی کہ وہ ضرورت مندوں اور غریبوں کی معاشی ضرورت وحاجت کا خود ہی خیال رکھیں، پھر یہ لوگ اپنی واقعی ضرورت و حاجت کا اظہار کریں تو افضل یہی ہے کہ صدقہ کے ذریعہ ان کی مدد کریں، اگر کسی وجہ سے یہ آسان نہ ہو تو قرضِ حسنہ کے طور پر کچھ مال دے دیں، قرضِ حسنہ وہ قرض ہے جس میں تین باتیں نہ ہوں: (۱) سود نہ ہو۔ (۲) مدت متعین نہ ہو۔ (۳) اظہارِ احسان نہ ہو۔

قرآنِ پاک میں حق تعالیٰ نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (البقرة: ۲٤٥)

کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، اور اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے، جس میں غریبوں کی امداد بھی داخل ہے۔

(آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۱۵۴)

آخری درجہ یہ ہے کہ قرض کی مدت متعین کرکے اطمینان حاصل کرنے کے بعد سود کے بغیر قرض دیں، یہ بھی نیکی میں تعاون ہی کی ایک شکل ہے۔ (بشرطیکہ بے مقصد یا معصیت کے لیے قرض نہ لیا جائے) حدیثِ پاک کے مطابق اس پر بھی صدقہ کا بلکہ بعض اوقات صدقہ سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔

چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے شبِ معراج میں جنت کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب تو دس گنا ہے، مگر قرض کا ثواب اٹھارہ گنا ہے، تو میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں ہے؟ تو جبرئیل امین علیہ السلام نے کہا: سائل (جس کو صدقہ دیا جاتا ہے وہ) اس حالت میں بھی سوال کرتا ہے اور صدقہ لیتا ہے جب کہ اس کے پاس کچھ ہو، (لیکن عموماً) قرض مانگنے والا قرض اُسی وقت مانگتا ہے جب وہ محتاج ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ: ۲/۶۱، اس روایت کی سند میں خالد بن یزید ہیں، جن کو متعدد محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ قاموس: ۴/۴۸۷)

مفکرِ اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غریب مگر شریف وعفیف بندہ انتہائی حاجت منداور اضطرار کی حالت میں ہوتا ہے، لیکن وہ نہ کسی سے سوال کرتا ہے، نہ صدقہ وخیرات لینے کے لیے اس کا دل آمادہ ہوتا ہے، ہاں، وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے قرض چاہتا ہے، تو پھر ظاہر ہے کہ اس کو قرض دینا صدقہ سے افضل ہوگا۔ (معارف الحدیث: ۷/۹۱)

مقروض کو مہلت دینے یا معاف کرنے کی فضیلت:

پھر قرض دینے کے بعد مقروض اسے ادا نہ کرسکے، تو اسے مہلت دینے یا اگر وہ زیادہ محتاج ہوجائے تو کچھ قرض یا اللہ اگر وسعت دیں تو سارا قرض معاف کرنے کی بڑی زبردست فضیلت قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ إِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ أَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرة: ۲۸۰)

ترجمہ: اور اگر کوئی تنگدست (قرض دار) ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے (کشادگی) تک مہلت دینی چاہیے، اور اگر بالکل معاف (صدقہ) ہی کر دو، تو یہ تمہارے لیے بہت زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

اس کی بہتری کا اندازہ قیامت میں ہوگا، حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رضي الله عنه قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ عَنْهُ، أَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (رواه مسلم، مشكوٰة/ص:۲۵۱)

ترجمہ: جس شخص نے کسی غریب تنگدست کو مہلت دی، یا (اپنے قرض کا کچھ حصہ یا مکمل ہی) معاف کر دیا، تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دِن کی تکلیفوں اور سختیوں سے نجات عطا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو توفیقِ عمل سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

۱۶/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۶ھ

مطابق: ۴/ جولائی/ ۲۰۱۵ء/ بروز: سنیچر، بزمِ صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۱۵)

سود کی تباہ کاریاں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ. (ابن ماجه/ص:۱۶۴، مشكوٰة/ص:۲۴۶، باب الربا/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''سود (کی برائیوں) کے ستر (۷۰) درجے ہیں، جن میں سب سے ادنیٰ درجہ ایسا گھناؤنا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے زنا کرے۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

تمہید:

اللہ رب العزت نے انسان کو اپنی بقا و حفاظت بلکہ عبادت و اطاعت سب ہی میں دنیوی ضروریات کا محتاج بنایا ہے، اور دینی و دنیوی ضروریات کی تکمیل کا ایک بہترین وسیلہ اور ذریعہ مال کو بنایا ہے، اس لیے مال کے متعلق ایک حکم تو یہ ہے کہ حلال طریقہ سے کماؤ، اور دوسرا حکم یہ دیا کہ مال کی حفاظت کرو، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ﴾ (النساء:۵)

''اور ناسمجھوں اور نادانوں کو اپنے اموال مت دو، (کیوں کہ ان ہی) اموال کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی گذارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔'' تمہاری بہت سے دینی و دنیوی ضروریات اس سے وابستہ ہیں، لہٰذا جس طرح اعمال کی حفاظت مطلوب اور ضروری ہے اسی طرح اموال کی حفاظت بھی مطلوب ہے، اور مال خواہ اپنا ہو یا کسی اور کا، اسے ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہیے، اگر حرام کمانا جائز نہیں تو حلال کو ضائع کرنا بھی جائز نہیں، حدیثِ پاک میں مروی ہے:

عَنِ الْمُغِيرَةِ - رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ - قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْأُمَّهَاتِ وَ وَأْدَ الْبَنَاتِ وَ مَنْعَ وَ هَاتِ وَ كَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَ قَالَ وَ كَثْرَةَ السُّؤَالِ وَ إِضَاعَةَ الْمَالِ. (بخاری: ۱/ ۳۲۴، مشکوٰۃ: ۴۱۹، باب البر والصلة)

اللہ رب العزت نے (دینی، دنیوی اور اُخروی تباہ کاریوں سے تمہیں بچانے کے لیے) جن چیزوں کو حرام قرار دیا وہ یہ ہیں: ماؤں کو تکلیف دینا، بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا، بخل کرنا، (یا بلا کسی شرعی مجبوری کے لوگوں سے اپنے لیے سوال کرنا، یا پھر حقدار کو اس کے حق سے محروم رکھنا) اور زیادہ سوال کرنا، اور اپنے اموال کو ضائع کرنا۔

چوں کہ مالِ حلال کو ضائع کرنا بھی حرام ہے، اِسی لیے شریعت میں ان تمام صورتوں کو بھی حرام قرار دیا جن میں اپنا یا دوسرے کا مال ضائع اور تباہ ہوتا ہو، من جملہ ان میں سے ایک صورت سود کی بھی ہے، جو آمدنی کے حرام ذرائع میں سب سے بدترین ذریعہ ہے۔

سود کی حقیقت:

سود کی حقیقت یہ ہے کہ جب ایک ہی جنس کی چیزوں کا تبادلہ ہو، جیسے روپیہ کا روپیہ سے، سونے کا سونے سے اور چاول کا چاول سے، وغیرہ، تو اس وقت اس شرط پر معاملہ کیا جائے کہ ایک طرف سے مقدار زیادہ ہوگی اور دوسری طرف سے کم، مثلاً ایک لاکھ روپئے دیے جائیں اور بعد میں ایک لاکھ دس ہزار روپئے وصول کیے جائیں، اس کے بارے میں

حدیثِ پاک وارد ہے: "فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى". (مسلم، مشکوٰۃ: ۲۴۴)

یہ زیادہ لینا یا اس کا مطالبہ کرنا سود ہے، ایک دوسری حدیث میں فرمایا: "كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا" (السنن الكبرىٰ للبيهقي: ٥/٥٧٣/باب كل قرض......الخ)

''ہر وہ قرض جس پر کسی بھی طرح کا نفع حاصل کیا جائے وہ بھی سود میں شامل ہے۔'' اس سلسلہ میں حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی احتیاط اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے جس شخص کو قرض دیا ہوتا اس کی دیوار کے سایہ میں کھڑے رہنا بھی گوارا نہ فرماتے، تاکہ قرضدار کی کسی چیز سے انتفاع نہ ہوجائے، جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

سود کی ممانعت:

شریعت میں سود کی ممانعت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے مال تباہ و برباد ہوتا ہے، اور یہ مالی تباہی سود دینے والے کی تو ہوتی ہی ہے، لیکن خود سود لینے والے کا مال بھی مآل اور انجام کے اعتبار سے نقصان سے دوچار ہوتا ہے، اسی مالی تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے حق تعالیٰ نے بیع یعنی خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَ أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرة: ٢٧٥) اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کی جتنی بھی جائز شکلیں ہیں ان تمام کو تمہارے لیے حلال قرار دیا، کیوں کہ ان میں تمہارے لیے برکت اور نفع ہے، لیکن سود کی جتنی بھی شکلیں ہیں ان کو حرام قرار دیا، کیوں کہ ان میں انسانیت کے لیے ہلاکت ونقصان ہے۔

سود کی ہلاکت:

سود کی تباہی کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا کہ: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ (البقرة: ٢٧٦) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے، سود سے منع کرتا اور صدقات کا حکم کرتا ہے، کیوں کہ سود میں غریبوں اور مجبوروں سے ناحق مال لے کر

امیروں اور مالداروں کو دیا جاتا ہے، اس لیے اس میں بظاہر وقتی اور عارضی طور پر امیروں کا ذاتی فائدہ ہوتا ہے، لیکن سماج کے غریبوں اور مجبوروں کا نقصان ہوتا ہے، جب کہ صدقات میں امیروں اور مالداروں سے مال لے کر غریبوں اور مجبوروں کو دیا جاتا ہے، اس لیے اس میں سماج کے غریبوں کا فائدہ ہے، لیکن امیروں کا نقصان بھی نہیں ہوتا، اس لیے سود کے مقابلہ میں صدقات والی شکل ہی بہتر ہے، پھر سود میں ہمدردی کا جذبہ ہی ختم ہوجاتا ہے، جب کہ صدقہ میں یہ جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ایک واقعہ:

اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہولینڈ میں ایک بوڑھا شخص اپنی بیٹی کے گھر آیا اور وہاں قیام کی خواہش ظاہر کی، تو بیٹی نے صاف انکار کردیا، جب باپ نے اصرار کیا تو بیٹی نے اسے مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا، لوگوں نے جب بیٹی کو ملامت کی تو اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے پیسوں کی سخت ضرورت پیش آئی، باپ سے مطالبہ کیا تو اس نے باقاعدہ شرحِ سود طے کر کے مجھے رقم دی، اور اصل مال کے ساتھ سود بھی وصول کیا، پھر میں اس کے ساتھ کیسے ہمدردی کروں؟ (کتابوں کی درس گاہ میں/ص:۱۱۱)

تو واقعہ یہی ہے کہ سود میں دینی، دنیوی اور اُخروی اعتبار سے ہلاکت ہے، جب کہ صدقات میں برکات ہیں، اس کا صحیح اندازہ اور حقیقی مشاہدہ تو مرنے کے بعد ہی ہوگا، جہاں تک تعلق ہے دنیوی زندگی کا، تو صرف ظاہر کی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو سود سے مال بڑھتا ہوا اور صدقات سے گھٹتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جن کو حقائق دیکھنے والی نگاہیں عطا فرمائی ہیں انہیں اس بات پر پورا یقین ہے کہ صدقات میں برکات اور سود میں ہلاکت ہے، بسا اوقات تو صدقہ کرنے والوں کے مال میں ایسی برکات ہوتی ہیں کہ وہ نسلوں تک باقی رہتی ہیں، اور ایسے لوگ آفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ رہتے ہیں، جب کہ سود خور اپنے مال میں اضافہ کر کے وقت کا قارون ہی کیوں نہ بن جائے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ اس حقیقی

راحت وعزت سے محروم رہتا ہے جو دولت کا اصل مقصد اور ثمرہ ہے، اس کے علاوہ بعض اوقات تو اس کی زندگی میں یا اس کے بعد کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جس سے سارا حساب برابر ہوجاتا ہے، اور کبھی کبھی تو وہ کروڑ پتی سے روڈ پتی بن جاتا ہے، اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الرِّبَا وَ إِنْ كَثُرَ فَإِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ إِلٰى قُلٍّ". (ابن ماجه، مسند أحمد، مشكوٰة: ٢٤٦)

سود سے حاصل ہونے والا مال خواہ کتنا ہی زیادہ ہوجائے، مگر اس کا مآل اور آخری انجام قلت اور ہلاکت ہے۔ بقولِ شاعر:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ☆ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

سود کی مذمت:

سود کی ان ہی تباہ کاریوں کے سبب ہر مہذب مذہب اور سماج نے ہمیشہ اس کی مذمت کی ہے، لیکن شریعت مطہرہ نے جس شدت کے ساتھ اس کی مذمت کی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب اور قانون میں نہیں ملتی، قرآنِ کریم کی کم از کم سات آیات اور چالیس سے زائد احادیثِ مبارکہ میں اس کی ممانعت ومذمت آئی ہے، بلکہ کفر وشرک کے بعد جس گناہ کی سب سے زیادہ مذمت بیان ہوئی وہ سود ہی ہے، مثلاً ایک حدیثِ پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ حَنْظَلَةَ غَسِيْلِ الْمَلاَئِكَةِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَ هُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَ ثَلاَثِيْنَ زِنْيَةً. (رواه أحمد، مشكوٰة: ٢٤٦)

جان بوجھ کر سود کا ایک درہم کھانا، مطلب یہ ہے کہ سود کی معمولی رقم بھی اپنے استعمال میں لانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ برا ہے، اور حدیثِ مذکور میں تو یہاں تک ارشاد ہوا کہ "الرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهٗ." سودخوری کی تباہ

کاریوں کے ستر درجے ہیں، ان میں سب سے ادنیٰ درجہ ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے، زنا کاری تو ویسے ہی دینی، دنیوی، سماجی اور اخروی اعتبار سے تباہ کاری کا ذریعہ ہے، پھر اگر کوئی نجس الفطرت اپنی حقیقی ماں کے ساتھ اس بدکاری کا ارتکاب کرے تو اس کی تباہ کاریوں کو سمجھا جا سکتا ہے، لیکن احادیثِ مبارکہ میں سود کی تباہ کاریوں کو اس سے زیادہ بتایا گیا، ایک اور حدیثِ پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَتَیْتُ لَیْلَةَ أُسْرِيَ بِیْ عَلٰی قَوْمٍ بُطُوْنُهُمْ كَالْبُیُوْتِ فِیْهَا الْحَیَّاتُ، تُرٰی مِنْ خَارِجِ بُطُوْنِهِمْ، فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ ؟ یَا جِبْرَئِیْلُ !قَالَ: هٰؤُلَاءِ أَكَلَةُ الرِّبَا. (مسند أحمد، ابن ماجه، مشكوٰة المصابيح : ٢٤٦)

شبِ معراج میں رحمت عالم ﷺ کو عالم غیب کی بہت سی چیزوں کا من جانب اللہ مشاہدہ کرایا گیا، اسی ضمن میں جنت اور دوزخ کے بعض مناظر بھی دکھائے گئے، تاکہ خود آپ ﷺ کو حق الیقین کے بعد عین الیقین کا مقام بھی حاصل ہو جائے، اور آپ ﷺ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر بھی لوگوں کو عذاب وثواب سے آگاہ کر سکیں، اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے ایک منظر یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگوں کے پیٹ گھروں کی طرح بڑے بڑے ہیں، اور ان میں سانپ بھرے پڑے ہیں، جو دیکھنے والوں کو باہر ہی سے نظر آرہے ہیں، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ سود خور ہیں، جو اس دردناک عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ سود کا ایک روپیہ جہنم کے ایک ایک سانپ کی طرح ہے، اور سود کا ایک روپیہ بھی اپنے استعمال میں لانا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا اپنے پیٹ میں جہنم کے سانپ کو ڈالنا اور پالنا۔

سود کی عمومیت:

لیکن افسوس......صد افسوس! سود کی اس قدر سخت مذمت کے باوجود آج مال کی

محبت نے بہت سے لوگوں کو اس قدر اندھا کر دیا کہ انہیں سود میں اپنا ذاتی، ظاہری اور عارضی فائدہ تو نظر آتا ہے، لیکن اس کی سماجی و دنیوی اور دینی واخروی دائمی تباہ کاریاں نظر نہیں آتیں، جس کی وجہ سے سود کا چلن عام ہو گیا، اس وقت پوری دنیا کی معیشت اور تجارت میں سود اتنی شدت اور عمومیت کے ساتھ سرایت کر گیا ہے کہ بقول محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ''کسی کاروباری سلسلہ کا اس سے محفوظ رہنا اتنا ہی مشکل ہو گیا جتنا جنگل کے کسی درخت کا ہوا سے محفوظ رہنا۔'' (معارف الحدیث: ۷/۱۱۶)

حدیثِ پاک میں اسی زمانہ کے متعلق فرمایا گیا:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَیَأْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی أَحَدٌ إِلَّا اٰكِلَ الرِّبَا، فَإِنْ لَمْ یَأْكُلْهُ أَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ، وَ یُرْوٰی "مِنْ غُبَارِهٖ." (أبو داوٗد، نسائی، ابن ماجه، مشكوٰة المصابيح : ٢٤٥)

ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں سود کھانے اور استعمال کرنے سے کوئی نہیں بچے گا، اگر وہ سود استعمال نہ بھی کرتا ہوگا تو اس کے بخارات واثرات سے تو ہرگز محفوظ نہ رہ سکے گا، اس کا غبار ضرور اس کو پہنچے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شریف آدمی خود تو سود استعمال نہیں کرے گا، مگر اس کی عمومیت کی وجہ سے کہیں نہ کہیں سودی معاملہ میں جانے انجانے میں مبتلا ہو جائے گا، حضور پاک ﷺ کے اسی ارشاد کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ حلال کمانے والوں کی تنخواہیں بھی سودی کاروبار کے اداروں اور بینکوں سے ہو کر یعنی حرام مال کے ساتھ مل کر آتی ہیں، صاحبو! یہی وجہ ہے کہ اب حلال اموال میں بھی وہ برکات نہیں ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں، دانائی ودینداری کا تقاضہ یہی ہے کہ سودی معاملات سے مکمل طور پر احتیاط کی جائے، کیوں کہ جو لوگ اس کی ان تباہ کاریوں کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ اللہ کی پناہ!

دو خطرناک گناہ:

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ (البقرة : ۲۷۹)

ترجمہ: (سود کی اتنی شدید مذمت سامنے آنے کے باوجود) پھر بھی تم اگر ایسا نہ کرو گے (سود سے باز نہ آؤ گے) تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔

علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ کفر اور شرک کے بعد دو گناہ اتنے خطرناک ہیں جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں ان کا ارتکاب کرنے والوں کو اعلانِ جنگ سناتا ہوں، ان میں سے ایک گناہ تو یہی سود خوری کا ہے، جس کے بارے میں آیتِ کریمہ میں اعلانِ جنگ کیا گیا، اور دوسرا گناہ اولیاء اللہ سے دشمنی کا ہے، جس کے بارے میں حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ "مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ."

(بخاری شریف، مشکوٰة المصابیح: ۱۹۷، حدیث قدسی نمبر : ۷)

جس شخص نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ بدقسمتی سے یہ دونوں گناہ امت میں بہت زیادہ رواج پا گئے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں امت سماجی و معاشی اور دینی و دنیوی تباہ کاریوں سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل اللہ سے صحیح تعلق قائم کیا جائے، تاکہ ان کی تربیت اور صحبت کی برکت سے جملہ معاصی سے ہم محفوظ رہ سکیں، یا کم از کم تائب ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور جملہ معاصی سے محفوظ فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۱۰/ رمضان المبارک/۱۴۳۶ھ

مطابق: ۱۲/ جون/ ۲۰۱۵ء، بزمِ صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۶)

شراب و دیگر منشیات کی مذمت اور نقصانات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا، فَمَاتَ وَ هُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَتُبْ، لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ. (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح : ۳۱۷، باب بيان الخمر و وعيد شاربها)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو چیز نشہ لائے وہ شراب ہے، اور ہر نشہ لانے والی چیز (خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ اور کھانے کی ہو یا پینے کی، بہر حال وہ) حرام ہے، اور جس شخص نے (دنیا میں) شراب پی، پھر (سچی پکی) توبہ کے بغیر مر گیا، تو وہ (جنت میں) شرابِ آخرت سے محروم رہے گا۔

شریعت میں شراب کی حرمت:

اللہ رب العزت نے انسان کو جن عظیم الشان اور خاص الخاص نعمتوں سے نوازا اُن میں ایک عقل ودانائی اور سمجھ داری بھی ہے، اسی عقل کے طفیل ایک انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قرآنِ پاک میں غور وفکر سے کام لے کر اس کو پہچان بھی سکتا ہے، قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور نشانیوں کا مقصد اس طرح بیان فرماتا ہے کہ:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرة: ۲۴۲)

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام (وآیات) کو وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، تاکہ تم عقل ودانائی اور سمجھ داری سے کام لو، عقل کے بغیر انسان نہ اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل کرسکتا ہے، نہ کائنات اور قرآن میں موجود اس کی نشانیوں میں غور وفکر سے کام لے سکتا ہے، نیز اسی عقل کے طفیل اللہ تعالیٰ نے انسان کے ضعیف البنیان ہونے کے باوجود اس کے لیے ساری کائنات کو مسخر کر رکھا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (لقمان: ۲۰)

ترجمہ: کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو مسخر کر دیا ہے، اور تم پر اپنی ظاہری وباطنی نعمتوں کا اتمام بھی کیا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی عقل اللہ تعالیٰ کا وہ خاص عطیہ اور انعام ہے جس پر بے شمار نعمتوں کا انحصار اور دارومدار ہے، اسی لیے اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، بلکہ علماءِ محققین نے احکامِ شریعت کے جو پانچ بنیادی مقاصد بیان فرمائے ہیں، ان میں (۱) ایمان کی حفاظت۔ (۲) جان کی حفاظت۔ (۳) آل کی حفاظت۔ (۴) مال کی حفاظت اور (۵) عقل کی حفاظت کرنا ہے۔ تو اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عقل کی حفاظت کرنا اور غور

وفکر کی قوت کو برقرار رکھنا اسلامی احکام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ہر اس چیز کی حرمت اور مذمت وارد ہوئی ہے جس سے نعمتِ عقل متاثر ہوجائے، اور انسان کے ہوش وحواس سلامت نہ رہیں، شریعت میں شراب اور دیگر منشیات کی حرمت اس لیے بھی ہے کہ اس کا اثر براہِ راست عقل انسانی پر ہوتا ہے، نشہ اور شراب کے بعد عموماً انسان پاگل کی طرح مکمل غافل، بے خبر اور بدمست ہوجاتا ہے، اس کے بعد وہ ہر ایسا کام اور کلام کر گذرتا ہے جو ایک انسان کے شایانِ شان نہیں، کیوں کہ عقل اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر برے کلام وکام کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن مئے ہے ☆ انسان کو خراب کرنے والی شئے ہے

شراب کی حرمت کا پہلا مرحلہ

جو چیزیں انسان کو حیوان سے بدتر بناتی ہیں ان میں سرِ فہرست شراب ہے، اس لیے کہ نشہ کے بعد انسان کسی بھی برائی کا ارتکاب کرسکتا ہے، اسی لیے حدیثِ پاک میں شراب کو بے حیائیوں اور برائیوں کی جڑ قرار دیا ہے، فرمایا: "فَإِنَّهٗ رَأْسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ" (مسند أحمد، مشكوٰة المصابيح: ۱۸/باب الكبائر)

اس سلسلہ میں ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک خوبصورت عورت نے اپنے پاس شراب اور بچہ رکھ کر کسی نیک آدمی کو مجبور کیا کہ وہ تین میں سے ایک برائی کم از کم ضرور کرے، یا تو وہ اس کے ساتھ بدکاری کرے، یا بچہ کو قتل کردے، یا پھر شراب پیئے، اس نے سوچا کہ شراب پینے میں دیگر دو گناہوں کے مقابلہ میں کمتر برائی ہے، لہٰذا اس نے شراب پی لی، بعد میں شراب کے نشہ میں بدمست ہوکر دوسرے دونوں گناہوں کا بھی ارتکاب کرلیا۔ (نسائی شریف: ۲/۲۸۲/ کتاب الاشربۃ/ باب تحریم الخمر)

معلوم ہوا کہ شراب صرف برائی نہیں؛ بلکہ برائیوں کی جڑ ہے، جیسے درخت سے

مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح شراب سے مختلف برائیاں وجود میں آتی ہیں۔

اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ شراب پہلے ہی مرحلہ میں حرام کردی جاتی؛ لیکن اسلام سے پہلے لوگ اس کے صدیوں سے بے حد عادی تھے، یہاں تک کہ مذہبی تقریبات بھی شراب سے خالی نہ ہوتی تھیں، اس لیے از راہِ حکمت اس کو مختلف مرحلوں میں حرام قرار دیا گیا، مثلاً سب سے پہلے سورۂ نحل میں فرمایا:

﴿ وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ﴾ (النحل: ٦٧)

ترجمہ: اور (اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے) کھجور اور انگور بھی ہیں، (تمہیں ان سے ایک مشروب یعنی پینے کی چیز عطا کرتے ہیں) جس سے تم شراب بھی بناتے ہو اور پاکیزہ رزق بھی۔

اس آیت کریمہ کے ذیل میں شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ ”یہ سورت مکی ہے، جب یہ نازل ہوئی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی؛ لیکن اسی آیت میں شراب کو پاکیزہ رزق کے مقابلہ میں ذکر فرما کر ایک لطیف اشارہ اس طرف کر دیا گیا تھا کہ شراب پاکیزہ رزق نہیں ہے۔ (آسان ترجمۂ قرآن: ۲/۸۳۴)

اس کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر چند صحابۂ کرامؓ کو اس کے مفاسد کا احساس ہوا، جس کی وجہ سے سیدنا فاروق اعظمؓ، سیدنا معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور! شراب اور قمار (جوا) انسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں اور مال بھی برباد کرتے ہیں، تو ان کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ اس پر وہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔“
(معارف القرآن: ۱/ ۴۶۶، از مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

فرمایا:

﴿ یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ

اِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ﴾ (البقرة: ٢١٩)

ترجمہ: لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

قرآن حقائق کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ آیتِ کریمہ میں اس حقیقت کو بتلایا کہ شراب اور جوے میں کچھ ظاہری فوائد ہیں، مثلاً محققِ اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ ”اس سے وہ نشاط اور سرور بھی حاصل کیا جاتا تھا جس کے لیے عموماً پینے والے اس کو پیتے ہیں، اس کے علاوہ اس ماحول میں شراب نوشی کو ایک اخلاقی عظمت وفضیلت کا مقام بھی حاصل تھا، وہاں کا عام رواج یہ تھا کہ دولت مند لوگ شراب پی کر نشہ کی حالت میں خوب دادودہش کرتے اور مال لٹاتے تھے، جس سے غریبوں کا بھلا ہوتا تھا، اور اسی وجہ سے شراب نہ پینا یا کم پینا بخل وکنجوسی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اور یہی حال جوے کا بھی تھا...... تو شراب اور جوے میں نافعیت کا غالباً یہی وہ خاص پہلو تھا جس کی طرف آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا۔“ (معارف الحدیث: ۶/ ۲۳۱)

مگر اس اظہارِ حقیقت کے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں، اور بقولِ فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم ”یہاں گو قرآن نے صراحۃً ”حرام“ نہیں کہا؛ لیکن جو لفظ استعمال کیا ہے وہ حرام کے لفظ سے بھی زیادہ تاکیدی ہے، ایک تو ”إثم“ کہا، جس کے معنی گناہ کے ہیں، اور قرآن میں شرک تک کو اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (النساء: ۴۸) پھر اس کی صفت ”کبیـــر“ لائی گئی، یعنی بڑا گناہ، گویا یہ حرام چیزوں میں بھی شدید درجہ کا حرام فعل ہے۔“ (آسان تفسیر: ۱۹۱)

اور اس طرح اس آیت کے ذریعہ گویا ذہنوں کو شراب کی حرمت کے لیے تیار کرلیا گیا تھا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو بہت سے لوگوں نے تو اسی وقت شراب سے توبہ کرلی۔

شراب کی حرمت کا دوسرا مرحلہ:

لیکن چوں کہ اب بھی قطعی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے بعض لوگ اس کے فائدے کے پہلو کو رخصت سمجھ کر مفاسد سے بچتے ہوئے پیتے تھے، حتیٰ کہ اس حالت میں نماز بھی ادا کرتے تھے، اسی دوران ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کچھ صحابہؓ کو مدعو کیا؛ چوں کہ اب تک شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے حسبِ معمول اس کا بھی انتظام کیا گیا، لوگ کھا- پی کر فارغ ہوئے تو مغرب کا وقت ہو گیا، حضرت علیؓ کو امامت کے لیے آگے بڑھایا گیا، تو ان سے سورۂ کافرون کی تلاوت میں ایسی غلطی ہو گئی جس سے معنیٰ بالکل ہی بدل گیا، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کے وقت شراب کی ممانعت آ گئی، چنانچہ فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء: ٤٣)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔ (ابوداود/ باب تحریم الخمر، حدیث نمبر: ۳۶۷۱)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بہت سے صحابہؓ نے شراب سے مکمل توبہ کر لی۔

شراب کی حرمت کا تیسرا مرحلہ:

مگر ابھی تک کلی طور پر حرمت کا حکم نہیں آیا تھا؛ اس لیے بعض لوگوں نے اپنے اوقات کو بدل دیا، کہ دن میں تو شراب پینے کا سلسلہ بالکل ہی موقوف کر دیا، کیوں کہ شراب پینے کے بعد نماز کے وقت تک ہوش آنا مشکل تھا، اور نماز تو کیا، جماعت تک چھوڑنا ان کے لیے محال تھا، البتہ عشاء کے بعد بعض حضرات اتنی مقدار پی لیتے تھے کہ فجر سے پہلے نشہ ختم ہو

جائے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آ گیا کہ حضرت عتبان بن مالکؓ نے چند صحابہؓ کی دعوت کی، جن میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد جب شراب کا دور چلا تو اسی میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر و شاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصارِ مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح و ثنا تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعدؓ کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم ہو گیا، خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر انہوں نے شکایت کی، تب آپ ﷺ نے دعا فرمائی: " اَللّٰهُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شَافِیًا" اے رب العالمین! شراب کے متعلق کوئی واضح حکم اور قانون عطا فرما دے، بس پھر کیا تھا، فوراً وہ آیت نازل ہوئی جس میں شراب کی مکمل حرمت ہی نہیں؛ بلکہ بہت ہی شدید مذمت بھی بیان کی گئی، چنانچہ فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدة: ٩٠)

ترجمہ: اے ایمان والو! شراب، جوا، مورتیاں اور فال نکالنے کے تیر یہ سب ناپاک اور شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

شراب کے نقصانات:

اس آیت کریمہ میں انداز بدل بدل کر کئی طرح شراب کی شناعت اور اس کے نقصانات کو بیان کیا گیا ہے، پھر نہایت تاکید کے ساتھ اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، اول تو شراب کی حرمت کو بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا، گویا یہ برائی شرک کے مماثل اور برابر قرار پائی، حدیثِ پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مُدْمِنُ الْخَمْرِ إِنْ مَاتَ لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالیٰ کَعَابِدِ وَثَنٍ. (مسند أحمد، مشکوٰۃ المصابیح: ٣١٨)

شراب کا عادی اگر بغیر توبہ کے مرجائے تو اللہ تعالیٰ سے بت پرست کی طرح ملاقات کرے گا، یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہؓ وصلحاء شراب نوشی کو بت پرستی کے برابر سمجھتے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس کا گناہ بھی شرک کی طرح بہت ہی خطرناک ہے۔

دوسرے: قرآن نے شراب کو ”حـرام“ کہنے کے بجائے ”رِجْـسٌ“ کہا ہے، اور ”رِجْـسٌ“ نجس اور خبیث چیز کو کہتے ہیں، جب جسم میں نجس، خبیث اور گندی چیز جاتی ہے تو جیسی غذا ویسا اثر، انسانی روح اور دل بھی اس سے گندہ ہو جاتا ہے، اس کے جذبات و خیالات گندے ہو جاتے ہیں، اور بسا اوقات باطن کا اثر ظاہر پر بھی ہوتا ہے، یہ اسی کا اثر ہے کہ بعض اوقات شراب کے عادی نہایت ذلت و رسوائی کے عالم میں گلی کوچوں بلکہ گندے نالوں کے کنارے کیڑوں، مکوڑوں اور جانوروں کی طرح پڑے ہوتے ہیں، انہیں نہ پاکی کا لحاظ ہوتا ہے، نہ صفائی کا خیال، تو یہ سب شراب کی خباثت کی نحوست ہوتی ہے۔

تیسرے: شراب کو شیطانی عمل قرار دیا، لہٰذا شراب کا عادی انسان بھی شیطان ہی کی طرح فسادی ہوا کرتا ہے، پھر شراب اور منشیات کا فساد ان افراد تک ہی محدود نہیں رہتا؛ بلکہ کبھی کبھی اس سے خاندان کے خاندان تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں، بڑی بڑی جائدادیں اس کی وجہ سے کوڑی کی قیمت بک جاتی ہیں، اسی طرح طلاق اور ایکسیڈینٹ کے واقعات کے علاوہ خطرناک حادثات اکثر شراب نوشی کی وجہ سے پیش آتے ہیں، جن کا خمیازہ خود پینے والے کو بھی بھگتنا پڑتا ہے اور دوسروں کو بھی، اس لیے کسی نے بالکل سچ کہا کہ:

جو عقل کھری تھی، کی کھوٹی اس نے
اچھے اچھوں سے چھینی روٹی اس نے
مستوں پہ شراب فاقہ مستی لائی
پتلون کو کر دیا لنگوٹی اس نے

عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ شراب سے سب کچھ خراب ہو جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سیلاب اور سمندر میں ڈوب کر اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے شراب کے جام اور گلاس میں ڈوب کر مرتے ہیں، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

گلاسوں میں جو ڈوبے، پھر نہ ابھرے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے اِن بوتلوں کے بند پانی میں

چوتھی بات یہ فرمائی کہ جب شراب کا فساد اور اس کے نقصانات کا دائرہ اتنا وسیع ہے تو عقل و شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے اجتناب کرو، ہر حال میں اس سے بچے رہو، اس سے بچنے کا مطلب فسادِ عظیم سے بچنا ہے، چنانچہ جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ ”اگر آدھے شراب خانے بند کر دیے جائیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفا خانے اور جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔“

(معارف القرآن: ۱/۵۷۳، مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

یہ واقعہ ہے کہ شراب سے بچے بغیر فساد اور نقصان سے بچنا ممکن نہیں، اس لیے پانچویں بات قرآنِ پاک نے یہ بیان فرمائی کہ اگر تم بچے رہو گے تو عین ممکن ہے کہ تم فلاح پا جاؤ، کیوں کہ شراب سے دور رہنے والا فساد اور نقصانات سے محفوظ اور دور رہتا ہے، اور فلاح کے قریب ہو جاتا ہے، پھر شراب سے سچی توبہ کرنے والا دارین میں فلاح یاب ہو جاتا ہے۔

شراب کا چھٹا نقصان اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ (المائدة: ۹۱)

”شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوے کے ذریعہ دشمنی، عداوت اور نفرت پیدا کر دے۔“ عموماً شراب اور منشیات کی بدمستی انسان سے ناکردنی کرا لیتی ہے، اور ناگفتنی کہلوا دیتی ہے، مثلاً گالی گلوچ اور فضول گوئی اور باعزت لوگوں کی توہین حتیٰ کہ عصمت ریزی اور ظلم و زیادتی وغیرہ، ظاہر ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ نفرت و عداوت ہی ہوتا ہے، ساتواں نقصان شراب کا اس طرح بیان کیا گیا:

﴿وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَ عَنِ الصَّلَاةِ﴾ (المائدة: ۹۱)

یعنی شیطان یہ بھی چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور نشہ کا عادی بنا کر اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیطان شرابی پر قابض اور مسلط ہو کر اسے اللہ کی یاد اور نماز وغیرہ سے غافل کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ شرابی اور جواری کو بہت کم مسجد میں پاتے ہیں، اگر وہ نماز کے پابند ہوتے تو یقیناً نماز انہیں برائیوں سے روک دیتی، یہ شراب اور نشہ کا بہت بڑا دینی نقصان ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہی ہے کہ شراب سے جسمانی، مالی، اخلاقی، سماجی، دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے طرح طرح کے نقصانات ہوتے ہیں، لہٰذا دانائی و سمجھ داری یہی ہے کہ اس سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا:﴿ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ ﴾ تو کیا تم باز آؤ گے؟

شراب کی حرمت اور صحابہؓ کی اطاعت:

جب شراب کی حرمت کا یہ آخری حکم نازل ہوا اور حضورِ پاک ﷺ نے اس کا قانوناً اعلان کروا دیا تو حضراتِ صحابہؓ کی اطاعت اور تعمیل حکم کا بے مثال جذبۂ صادقہ دیکھیے کہ کوئی تاویل اور قیل وقال نہیں کی، فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا، برسوں کی لگی عادت لمحوں میں چھوڑ دی، جن کے منہ تک شراب آ چکی تھی ان کے حلق تک نہیں پہنچی، سب نے اسی وقت شراب کے بھرے ہوئے مٹکے اور برتن توڑ دیے، مشکیزوں سے شراب نکال کر راستوں پر بہا دی، روایتوں میں آتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں اس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رَو کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصۂ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رنگ مٹی میں ظاہر ہو جاتا تھا۔

ایک واقعہ:

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک صحابیؓ جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور خیبر سے شراب لا کر مدینہ میں فروخت کرتے تھے، اتفاقاً نزولِ حرمت کے وقت وہ خیبر شراب لینے

گئے تھے، اور کافی مقدار میں مشکیزوں میں شراب لے کر واپس ہوئے، مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک صحابیؓ نے انہیں حرمتِ شراب کی خبر دی، تو یہ وہیں کھڑے ہو گئے، یہ گوارا نہ ہوا کہ حرمتِ شراب کی خبر سن کر ایک قدم بھی آگے بڑھائیں، اس لیے قریب کے ایک ٹیلے پر یہ شراب کے مشکیزے رکھ کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! مجھے خبر ملی ہے کہ شراب حرام ہو گئی، تو کیا یہ صحیح ہے؟ جب آپ ﷺ نے تصدیق فرمائی تو کہنے لگے کہ جس سے شراب خریدی ہے اسے واپس کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، کہا: کسی غیر مسلم محسن کو ہدیہ کر دوں؟ فرمایا نہیں، پھر عرض کیا: اس میں چند یتیموں کا بھی مال ہے، فرمایا: اس نقصان کی تلافی ہم بیت المال سے کر دیں گے، اس کے بعد فوراً یہ صحابیؓ واپس ہوئے اور ٹیلے پر جا کر مشکیزوں کے دہانے کھول دیے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/۹۶)

انسانی تاریخ میں تعمیل حکم کی ایسی مثالیں کہیں اور نہیں مل سکتیں، منشیات کا عادی تو مارنے مرنے پر تُل جاتا ہے، اس کے لیے یکدم نشہ چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، لیکن حضور ﷺ کی تعلیم و ہدایت اور تربیت کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابیؓ کے پیش نظر بس ایک ہی بات تھی: " أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ " اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو، خواہشاتِ نفسانی کو مرضیاتِ ربانی پر قربان کر دو، واقعی اس جذبۂ صادقہ کے بعد آج بھی منشیات اور تمام معاصی سے بچنا ہر کسی کے لیے آسان ہو سکتا ہے، اور الحمد للہ! آج بھی جو سچے مسلمان شراب اور منشیات سے بچتے ہیں تو وہ دنیوی قانون کی بنا پر نہیں؛ بلکہ خوفِ الٰہی اور حکمِ شرعی کی وجہ سے، حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ ایسے لوگ قیامت میں حوضِ کوثر کا پانی پلائے جائیں گے۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ: ۳۸۱)

بعض صحابہؓ کو خیال ہوا کہ ہمارے وہ رفقاء جو حرمتِ شراب سے قبل شراب پیتے تھے، اور اسی حال میں وہ دنیا سے چل بسے، تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا معاملہ ہوگا؟ حضور ﷺ سے جب اس سلسلہ میں سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں بعد والی آیت

نازل ہوئی، جس میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَ أَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (المائدة : ۹۳)

شراب اور جوے کی حرمت سے پہلے اگر کسی مومن نے نشہ آور چیزیں کھالیں تو اس پر کوئی گناہ نہیں؛ البتہ اب جب ان چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس سے ہر حالت میں بچنا ضروری ہے، اس میں تین دفعہ ''تقویٰ'' یعنی گناہ سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، تو اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شراب وغیرہ سے بچنا کس قدر تاکید کے ساتھ ضروری ہے۔

شرابی کے بارے میں وعیدیں:

اس کے باوجود بھی اگر کوئی اس سے نہیں بچتا تو پھر احادیثِ مبارکہ میں اس کے لیے دنیوی اور اخروی اعتبار سے بڑی سخت وعیدیں بھی آئی ہیں، ایک حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةً أَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا. (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح : ۳۱۷)

جو شخص ایک مرتبہ بھی شراب پی لیتا ہے (اور اس کے بعد توبہ نہیں کرتا) تو حق تعالیٰ اس کی چالیس دِن تک کی نمازیں قبول نہیں فرماتا۔

علماءِ محدثین فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شراب پینے کی نحوست کا باطنی اثر دِل پر چالیس دِن تک رہتا ہے، اس لیے حدیثِ پاک میں چالیس کی قید لگائی، اور نماز بدنی عبادات میں سب سے افضل ہے، جب وہ قبول نہ ہوئی تو دوسری عبادات بدرجۂ اولیٰ قبول نہ ہوں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (از مظاہر حق جدید: ۳/۷۲۶)

معلوم ہوا کہ شرابی کا کوئی عمل قبول نہیں، جب تک کہ وہ سچی توبہ نہ کرلے، ایک حدیثِ پاک میں ہے وارد ہے: "وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ" (متفق عليه، مشكوٰة: ۱۷) شرابی جس وقت شراب پیتا ہے وہ مومن نہیں ہوتا۔ (اس وقت اس کا ایمان یا نورِ ایمان دل سے نکل کر سایہ کی طرح اوپر ہو جاتا ہے، البتہ جب مومن بندہ اس برائی سے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر ایمان لوٹ آتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ شراب پینا ایک سچے مسلمان کا کام بالکل نہیں ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص اس حالت میں انتقال کر گیا تو بے ایمان ہو کر دنیا سے گیا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اور حدیثِ مذکور میں فرمایا:

"كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا، فَمَاتَ وَ هُوَ يُدْمِنُهَا، لَمْ يَتُبْ، لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۳۱۷)

جو چیز نشہ پیدا کر دے (یا جس چیز میں کسی وجہ سے نشہ پیدا ہو جائے) وہ شراب ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے، اب جو بھی دنیا میں شراب پئے گا پھر بغیر توبہ کے مرے گا، تو وہ دنیا کی ناپاک اور حرام شراب کی نحوست کی وجہ سے آخرت کی پاک اور حلال شراب سے محروم رہے گا، (مراد یہ ہے کہ جنت میں پہلے نجات پاکر داخل ہونے والوں کے ساتھ نہ رہے گا) واللہ اعلم۔ (از مظاہر حق جدید: ۳/۷۲۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ دنیا میں شراب پی کر بغیر توبہ کیے مرنے والے کو جہنم میں "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" پلایا جائے گا، حضرات صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! یہ "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "عَرَقُ أَهْلِ النَّارِ أَوْ عُصَارَةُ أَهْلِ النَّارِ" (مسلم، مشكوٰة المصابيح : ۳۱۷، عن جابرؓ)

یہ (طينة الخبال) جہنمیوں کے جسم سے بہنے والا پسینہ، یا لہو اور پیپ ہے۔ (اللّٰهم احفظنا منه)

ان روایات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شرابی کے بارے میں کتنی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

شراب نوشی اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی:

چوں کہ شراب اور دیگر منشیات کے نقصانات بے حد ہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس لیے حضور ﷺ نے اس پر سخت ترین وعیدیں بیان فرمائی ہیں، تاکہ امت کسی بھی طرح اس سے بچ جائے، لیکن افسوس صد افسوس! ان واضح احکامات اور سخت ترین نقصانات کے باوجود آج امت کا عیاش اور اوباش (دین سے آزاد) طبقہ تشویش ناک بلکہ خطرناک حد تک اس انتہائی نقصان دہ برائی میں مبتلا ہے، اس وقت نئی نسل تیزی سے شراب اور منشیات مختلف ناموں سے بکثرت استعمال کر رہی ہے، آپ ﷺ پر من جانب اللہ یہ بات منکشف ہوگئی تھی؛ اس لیے آپ ﷺ نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا:

عَنْ أَبِی مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهَ عَنْهُ أَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِيْ الْخَمْرَ، يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا. (رواه أبو داوٗد و ابن ماجه، معارف الحديث: ٦/٢٤٧)

میری امت کے بعض لوگ شراب پییں گے؛ لیکن اس کو شراب کا نام نہیں دیں گے۔ یعنی شراب اور دیگر منشیات کا استعمال نام بدل بدل کر کریں گے۔ آج دیکھ لیجیے کہ مارکیٹ میں شراب اور منشیات کے مختلف نام ہیں، کہیں وائن، تو کہیں فلائنگ، کہیں ہیروئن، تو کہیں چاکلیٹ، کہیں چرس گانجا، تو کہیں چیمپئن (CHAMPION) اور گولی کہتے ہیں، یاد رکھو! نام بدلنے سے نہ حقیقت بدلتی ہے، نہ حکمِ شریعت بدلتا ہے، حضور ﷺ نے بڑی جامعیت کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمادی کہ "كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ" ہر وہ چیز جس میں نشہ ہو وہ شراب ہے، اور ہر نشہ ور چیز حرام ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کا تعلق کھانے سے ہو یا پینے سے، اور پھونکنے سے ہو یا تھوکنے سے، ان تمام چیزوں سے

اپنے جسمانی و اخلاقی، دینی و دنیوی اور اُخروی نقصانات سے محفوظ رہنے کے لیے بچنا بہر حال لازم اور ضروری ہے۔

شراب سے بچنے کی تدابیر:

اس سے بچنے کی مختلف تدابیر ہیں، ایک یہ کہ لوگوں کو اس کے تمام نقصانات سے آگاہ اور باخبر کیا جائے، دوسرے اپنی بساط کی حد تک ان اسباب پر روک لگائی جائے جو شراب اور منشیات کے پھیلنے میں مدد و معاون ہیں، علاوہ ازیں ان دعوتوں اور پارٹیوں میں شرکت نہ کی جائے جہاں شراب پی جاتی ہو، ان دکانوں اور ہوٹلوں میں نہ جائیں جہاں شراب بیچی اور خریدی جاتی ہو، حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی کوئی تعلق نہ رکھیں جو کسی بھی درجہ میں شراب میں مبتلا ہوں؛ کیوں کہ حدیث میں حضور ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں کئی لوگوں پر اللہ کی لعنت فرمائی: (۱) شراب پر۔ (۲) اس کے پینے والے پر۔ (۳) اس کے پلانے والے پر۔ (۴) اس کے بیچنے والے پر۔ (۵) اس کے خریدنے والے پر۔ (۶) اس کے بنانے والے پر۔ (۷) اس کے بنوانے والے پر۔ (۸) اس کے مہیا کرنے والے پر۔ (۹) جس کے لیے مہیا کی گئی اس پر۔ (۱۰) اس کی قیمت لینے والے پر۔ (ابوداؤد:۱۶۱)

تیسرے اللہ سے سچی پکی توبہ کر کے آئندہ اس سے حفاظت کی خوب دعائیں کی جائیں۔ چوتھے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے؛ کیوں کہ یہ عادتِ بد اکثر صحبتِ بد کا نتیجہ ہوتی ہے، لہٰذا بری صحبت سے بچا جائے اور اچھی صحبت میں رہنے کا اہتمام کیا جائے۔ ان شاء اللہ ان تدابیر سے بڑی حد تک شراب اور دیگر منشیات سے نجات مل جائے گی۔

حق تعالیٰ اپنے کرم سے شراب و دیگر منشیات اور تمام معاصی سے ہماری اور ساری امت کی حفاظت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۳/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۶ھ/ بروز جمعہ مطابق: ۱۸/ جون/ ۲۰۱۵ء، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۷)

جوے بازی کی تباہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍوؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَا یَدۡخُلُ الۡجَنَّۃَ عَاقٌّ وَ لَا قَمَّارٌ وَ لَا مَنَّانٌ وَ لَا مُدۡمِنُ خَمۡرٍ. (راوہ الدارمی، مشکوٰۃ المصابیح : ۳۱۸ / باب بیان الخمر وَ وَعِیۡدِ شَارِبِھَا / الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”والدین کا (دائمی) نافرمان (یا شرعی عذر کے بغیر نافرمانی کرنے والا، یا پھر اپنے کسی قول وعمل سے انہیں تکلیف دینے والا) اور جوا کھیلنے والا، اور احسان جتلانے والا اور شراب کا عادی، یہ لوگ جنت میں (ابتداءً داخل ہونے والے نیک لوگوں کے ساتھ) داخل نہ ہوں گے۔

شریعتِ اسلامیہ میں جوے پر پابندی:

اللہ رب العزت نے یوں تو ساری کائنات ہی کو انسان کے نفع کے لیے پیدا فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:﴿ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا﴾ (البقرة : ۲۹)

وہی ہے جس نے تمہارے (نفع کے) واسطے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں اصل کے اعتبار سے وہ سب حلال ہیں اور ان سے نفع حاصل کرنا جائز ہے، البتہ اگر کسی چیز میں شریعتِ اسلامیہ کی جانب سے پابندی اور ممانعت ثابت ہوجائے تو پھر وہ چیز حرام ہوجائے گی اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، اور شریعتِ اسلامیہ نے نفع کے حصول کے لیے چند ضروری اصول کا انسان کو پابند بنایا، ان میں ایک یہ کہ اپنے نفع کے خاطر بلا کسی معقول وجہ کے دوسرے کا نقصان نہ کیا جائے، اس لیے کہ اپنے ذاتی نفع کے لیے خواہ مخواہ کسی دوسرے کا نقصان کرنا اور اپنی ساری صلاحیت کو اس خودغرضی پر صرف کردینا یہ انسانی نہیں؛ بلکہ حیوانی وشیطانی خصلت وعادت ہے، اسی اصول کے پیشِ نظر شریعتِ اسلامیہ میں جوئے اور اس کی جتنی بھی قسمیں ہیں خواہ وہ دورِ قدیم کی ہوں یا دورِ جدید کی، ان تمام کی ممانعت اور پابندی وارد ہوئی ہے کہ اس میں ایک کا نفع دوسرے کے نقصان پر موقوف ہوتا ہے۔

صاحبو! وہ نفع جو بلا وجہ اور معاوضہ کے محض دوسرے کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا جائے درحقیقت اس میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے، قرآنِ پاک میں اسی کو فرمایا گیا:

﴿ وَ اِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا﴾ (البقرة : ۲۱۹)

کہ شراب اور جوے کے نقصانات ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہیں، اس میں ایمانی و روحانی، جسمانی وظاہری دنیوی واخروی اعتبار سے نقصانات اور تباہی ہے۔

جوے کا ایمانی وروحانی نقصان:

جہاں تک ایمانی وروحانی نقصان کی بات ہے تو وجہ یہ ہے کہ بت پرستی اور شراب نوشی کی طرح جوا بازی بھی بڑا گناہ اور شیطانی عمل ہے، اس سے ایمان اور روحانیت کو نقصان ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَيۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (المائدة : ٩٠)

ترجمہ: اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور جوے کے تیر یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں۔

ثابت ہوگیا کہ جوابازی بھی گندہ اور شیطانی کام ہے، یہ انسان کے ایمان اور دل و جان کو ناپاک کر دیتا ہے؛ کیوں کہ جب جوے بازی کا حرام اور ناپاک مال بطن (پیٹ) میں جاتا ہے تو باطن کو بھی گندہ اور ناپاک کر دیتا ہے، دل کے خیالات و جذبات کو بھی گندہ کر دیتا ہے، جواری کے دلی خیالات و جذبات عموماً ناپاک ہی ہوتے ہیں، اور یہ دراصل اس حرام اور گندے مال کا اثر ہوتا ہے، اسی لیے اسے نیکی اور بھلائی کی توفیق بہت کم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں ظاہری اور باطنی اعتبار سے گندگی و ناپاکی ہو، ہمارے آقا ﷺ نے من جانب اللہ اسے حرام فرمادیا، ارشاد ہوا: ﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (الأعراف : ١٥٧) اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے گا۔ چوں کہ جوابازی بھی ایمانی و روحانی اعتبار سے گندی چیز ہے اس لیے ہمارے آقا ﷺ نے صاف طور پر اس کی ممانعت فرمادی، چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو ؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ. (أبو داوٗد، مشكوٰة المصابيح : ٣١٨)

پھر اسی کے ساتھ جوابازی شیطانی کام اور جال بھی ہے، اس شیطانی جال میں پھنسنے والا جواری اتنی آسانی سے نکل نہیں پاتا؛ بلکہ اس میں ترقی ہی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایمانی و روحانی تباہی کے علاوہ دنیوی اور ظاہری اعتبار سے بھی تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جوے کا دنیوی اور ظاہری نقصان:

چنانچہ قرآنِ پاک نے جوے کا دنیوی اور ظاہری نقصان بیان کرتے ہوئے ارشاد

فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ (المائدة : ٩١)

ترجمہ: شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض و نفرت پیدا کر دے۔

یہ جوے کا ظاہری و دنیوی لازمی نقصان ہے؛ کیوں کہ جوے میں جیتنے والا جب بیٹھے بیٹھے دوسرے کے مال پر ناجائز طور پر قابض ہو جاتا ہے تو اس سے اس میں بے کاری، مفت خوری اور حرام خوری پیدا ہو جاتی ہے، جب کہ اس میں ہارنے والے کی اچھی خاصی بھری ہوئی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں، اس کی وجہ سے اچھا خاصا مالدار شخص محتاج اور کروڑ پتی شخص روڈ پتی بن جاتا ہے، اس کی وجہ سے معزز اور باعزت لوگ ذلیل اور بے عزت ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات تو جواری کا سارا گھرانا اور خاندان تک اس جوابازی کی وجہ سے تباہ اور برباد ہو جاتا ہے، اور یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں؛ بلکہ آئے دِن اس طرح کے واقعات سامنے آتے ہی رہتے ہیں، مثلاً گورکھپور کی خبر ہے کہ سول سرجن آفس میں پانچ آدمی جوا کھیلتے ہوئے گرفتار ہوئے، انہوں نے بتایا کہ ہم نے اپنا خون بیچ کر جو رقم ہسپتال سے حاصل کی تھی اسی کو جوے میں لگایا، یعنی خون فروشی کی کمائی قمار بازی میں اُڑائی۔ (ادبی شہ پارے: ۲/۸۰۵)

جوے بازی سے تباہی کا عبرت ناک واقعہ:

نیز اس سلسلہ میں حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہٗ نے ایک نہایت عبرت ناک واقعہ اپنے مواعظ میں بیان فرمایا ہے کہ ’’ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اتنی زرعی زمین دی تھی کہ تین ریلوے اسٹیشن اس کی زمین میں بنے ہوئے تھے، وہ تو بڑی شان بان کے ساتھ زندگی گذار کر دنیا سے چل بسا؛ لیکن ایک بیٹا پیچھے چھوڑ گیا، اب نوعمر بیٹے کے ہاتھ

جب باپ کمائی والا کروڑوں کا سرمایہ آیا، تو غلط صحبت کے نتیجہ میں وہ شراب و شباب میں مبتلا ہو گیا، اور اسی میں جوانی کے ساتھ دولت کو بھی پانی کی طرح برباد کرتا رہا، مزید برآں اسے جوابازی کا شوق لگ گیا، اس کے لیے کسی نے اسے اپنے گاؤں سے شہر میں بنے نئے جوے کے کلب کا راستہ دکھایا، پھر جوابازی کے اس شیطانی جال میں پھنس کر شہر کے کلب سے وہ بیرون میں خاص جوا کھیلنے کے لیے جانے لگا، یہ شوق اب اس کی عادت بن گئی، اور ہوتے ہوتے کروڑوں روپئے داؤ پر لگ گئے، پھر زمینیں بکنا شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ ساری زمینیں بکنے کے بعد ذاتی مکان بھی بیچنا پڑا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس جگہ اس کا باپ مجلس لگا کر متکبرانہ شان سے بیٹھا کرتا تھا، اس کا بیٹا جوے بازی کی تباہی کی وجہ سے اسی جگہ کھڑا ہو کر لوگوں سے بھیک مانگنے لگا، اور اسی میں بالآخر ہلاک و برباد ہو گیا۔ العیاذ باللہ العظیم۔ (مستفاد از: ''اہلِ دِل کے تڑپا دینے والے واقعات'' /ص:۶۱۹)

جب جوے بازی میں ہارنے والا کسی نقصان سے دوچار ہوتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہارنے والے کو جیتنے والے پر سخت غصہ آتا ہے، اس کی طرف سے دِل میں کینہ اور بغض وعداوت پیدا ہو جاتی ہے، پھر بعض اوقات فتنہ، فساد اور قتل وقتال تک معاملہ پہنچ جاتا ہے، جوے بازی کا یہی وہ دنیوی اور ظاہری نقصان ہے جس سے قرآنِ پاک نے ہمیں متنبہ کیا:

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ (المائدة : ۹۱)

ترجمہ: یقیناً شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے۔

اس سے آپس میں بغض وعداوت اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور یہ چیز سماج کے لیے سخت مہلک اور خطرناک ہے۔

جوے بازی کا دینی واُخروی نقصان:

آگے جوے کا دینی اور اُخروی نقصان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ﴾ (المائدة : ۹۱) شراب نوشی کی طرح جوابازی بھی وہ بدترین برائی ہے کہ اس میں بدمست ہو کر جواری اللہ کی یاد اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور یہ بات دینی واُخروی اعتبار سے بہت نقصان دہ ہے۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جیسے شراب میں ظاہری نشہ ہے تو جوے میں معنوی نشہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے شراب اور جوے کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا، یہ دونوں ایسے نشے ہیں جو انسان کو اللہ کے ذکر اور آخرت کے فکر سے غافل کر دیتے ہیں، اور نتیجۃً دنیا کے ساتھ اس کی عقبیٰ بھی تباہ ہو جاتی ہے، قرآن جوے کے یہ تمام ایمانی وروحانی، دنیوی اور ظاہری اور دینی واُخروی نقصانات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے کہ: ﴿ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ﴾ (المائدة : ۹۱) یہ ساری خرابیاں اور برائیاں تمہارے علم میں آ گئیں، اب دانائی یہی ہے کہ اس سے بچا جائے۔

جوابازی اور جنت سے محرومی:

ان سارے حقائق کے باوجود اگر کوئی شخص جوے بازی کی اس تباہ کن برائی سے نہ بچے تو اس کی محرومی اور ناکامی میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ حدیثِ پاک میں ایسے شخص کے لیے اللہ کی رضا ورحمت اور جنت سے محرومی کی وعید آئی ہے، چنانچہ فرمایا: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَاقٌّ وَ لَا قَمَّارٌ وَ لَا مَنَّانٌ وَ لَا مُدْمِنُ خَمْرٍ'' والدین کا دائمی نافرمان یا انہیں تکلیف دینے والا، جواری، احسان جتلانے والا اور شراب کا عادی، یہ سب وہ بدبخت ہیں جو اگر توبہ کیے بغیر مر گئے تو جنت سے محروم رہیں گے۔ (جب تک کہ ان برائیوں کی سزا نہ بھگت لیں) ظاہر ہے کہ اس سے بڑی محرومی اور تباہی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہماری اور ہماری نسلوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

۵/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۶ھ   مطابق: ۲۳/ جون/ ۲۰۱۵ء   بروز: منگل، بزمِ صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۸)

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے فضائل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ سَهۡلِ بۡنِ سَعۡدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا وَ كَافِلُ الۡيَتِيۡمِ فِي الۡجَنَّةِ هٰكَذَا"، وَ أَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَ الۡوُسۡطٰى، وَ فَرَّجَ بَيۡنَهُمَا شَيۡئًا. (بخاری: ۴۳۶/۱، مشکوٰۃ: ۴۲۲/باب الشفقة والرحمة على الخلق)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں اور یتیم کی (دینی، دنیوی، تعلیمی، تربیتی اور کسی بھی طرح کی ضروریاتِ زندگی کا انتظام اور) کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔'' یہ ارشاد فرماتے وقت حضور ﷺ نے شہادت والی اور بیچ والی انگلیوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے اشارہ فرمایا۔

تین مظلوم طبقے:

اللہ کے رسول ﷺ جس زمانے وعلاقے میں مبعوث ہوئے اس میں جہالت، ضلالت اور غفلت کے سبب انسانی معاشرہ میں تین طبقے عاجز، بے بس اور کمزور ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ مظلوم اور ظلم وستم کا شکار تھے: (۱) غلام (قیدی)۔ (۲) خواتین (بالخصوص بیوہ اور مطلقہ)۔ (۳) یتیم۔ دورِ جاہلیت میں ان تینوں کمزور طبقوں کے ساتھ ہر طرح کی زیادتی اور حق تلفی کا معاملہ کیا جاتا تھا، ویسے بھی سماج میں جو کمزور ہوتے ہیں وہ عموماً آج بھی مظلوم ہوتے ہیں، رب العالمین نے ہمارے آقا ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا، اس لیے یوں تو آپ ﷺ سبھی کے ساتھ نہایت شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے، لیکن سماج کے کمزوروں، عاجزوں اور بے بسوں کے لیے تو آپ ﷺ انتہائی شفیق اور مہربان تھے، آپ ﷺ ہمیشہ ان کے ساتھ اداءِ حقوق بلکہ حسنِ سلوک، خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ فرماتے، اور لوگوں کو بھی اس کی تاکید فرما کر ان کے ساتھ کسی بھی طرح کی بدسلوکی وبداخلاقی سے منع فرماتے۔

یتیم کی حقیقت اور فضیلت:

پھر ان میں سب سے زیادہ عاجز، بے بس، بے سہارا اور کمزور وہ معصوم اور قابل رحم بچے ہیں جن کے سر سے بچپن ہی میں باپ کا سایۂ شفقت اٹھ چکا ہوتا ہے، اصطلاحِ شریعت میں انہیں یتیم کہتے ہیں، اور اگر کوئی معصوم ایسا ہے کہ دونوں کی شفقت ومحبت سے دورِ بچپن ہی میں محروم ہو جائے تو اسے یتیم الطرفین کہتے ہیں۔ (الأربعين للطالبين: ۲۲۹)

لیکن اگر کوئی معصوم بچہ صرف ماں سے بچپن میں محروم ہو جائے تو اسے "لَطِيۡمٌ" (طمانچہ مارا ہوا) کہتے ہیں۔

بچوں کا دِل تو ویسے ہی بڑا نازک ہوتا ہے، ذرا ذرا بات پر ٹوٹ جاتا ہے، جس کی

وجہ سے وہ بچہ اپنے والدین وغیرہ سے روٹھ جاتا ہے، ایسی صورت میں جس بچے کے سر سے والد، والدہ یا دونوں کا سایہ اٹھ جاتا ہے اور بظاہر اس کا کوئی قریبی سہارا باقی نہیں رہتا اس وقت اس کا نازک دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، اور تب اس کے معصوم دِل پر جو گذرتی ہے اس کا صحیح اندازہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں لگا سکتا، ہمارے آقا ﷺ نے چوں کہ داغِ یتیمی کو سہا ہے اس لیے آپ ﷺ کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔

اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ یتیموں کی تسلی اور فضیلت کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا اور ان کے ساتھ دنیا کو حسنِ سلوک کی ترغیب بلکہ تاکید کرنے والا نبی خود یتیم ہو کر ہی دنیا میں آیا، آپ ﷺ کی یتیمی بھی کس غضب کی! کہ والد کی شکل سرے سے دیکھی ہی نہیں، رہیں والدہ، تو ان کا بھی پانچ سال سے زیادہ ساتھ نہ رہ سکا، رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو یتیم جو پیدا فرمایا تو اس کی پہلی وجہ یہ تھی، تاکہ دنیا جان لے کہ یتیم اگرچہ بظاہر بے سہارا اور باپ کی شفقت و تربیت سے محروم ہوتا ہے؛ لیکن میرے محبوب ﷺ کا تو سب سے بڑا سہارا اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ میں خود ہوں، میرے بعد اب اسے کسی اور کی قطعاً ضرورت ہے ہی نہیں، اسی لیے ہمارے آقا ﷺ نے دنیا میں کسی سے پڑھا تو نہیں؛ لیکن ساری دنیا کو پڑھا دیا، اس حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے یوں بیان فرمایا کہ:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست　　کتب خانۂ چند ملت بشست

آپ ﷺ کے یتیم ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اب آپ ﷺ کے بعد دنیا کسی بھی یتیم کو حقیر نہیں؛ بلکہ عزیز سمجھے، کیوں کہ یتیموں کی صف میں سب سے آگے عبداللہ اور آمنہ کا دریتیم ہے۔ ﷺ۔ فرمانِ شاہی نازل ہوا:

﴿ وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى﴾ (النساء: ۳۶)

حکم ہوتا ہے: پیارے! آپ بھی یتیموں کے لیے ہمارا یہ محبت بھرا پیغام دنیائے انسانیت کے نام عام کر دو، فرمایا:

﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ (البقرة: ۲۲)

یتیموں کے ساتھ بھلائی، خیر خواہی اور حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا بہت بڑی نیکی اور خوبی کی بات ہے۔

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا اعلیٰ درجہ اور اس کی فضیلت:

اور یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے یوں تو مختلف درجات ہیں؛ لیکن اس کا سب سے اعلیٰ درجہ کسی بھی یتیم کی دینی، دنیوی، تعلیمی، تربیتی اور تمام ضروریاتِ زندگی کی مکمل کفالت اپنے ذمہ لینا ہے، اس کے بعد اگر وہ یتیم کوئی عزیز قریب رشتہ دار ہے تو اسے اپنے گھر رکھ کر اس کی کفالت کے فرائض کو انجام دینا بہتر ہے، بشرطیکہ آسانی ہو، اور اس بات کا اعتماد اور اطمینان ہو کہ گھر میں اس کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کی جائے گی، بلکہ ہمیشہ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے گا، کیوں کہ حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُحْسَنُ إِلَيْهِ، وَ شَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُسَآءُ إِلَيْهِ." (ابن ماجه: ۲۷۰، مشكوٰة المصابيح: ۴۲۳/باب الشفقة والرحمة)

"مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کی پرورش ہو رہی ہو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جاتا ہو، اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو؛ لیکن اس کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ کیا جاتا ہو۔" اور بدسلوکی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا جائے، یا اسے ناحق مارے ڈانٹے، البتہ تعلیم و تربیت اور حسنِ ادب کے پیشِ نظر مناسب انداز میں تنبیہ کرے تو یہ بدسلوکی نہیں؛ بلکہ حسنِ سلوک ہی میں داخل ہے۔

لیکن اگر کسی وجہ سے یتیم کو اپنے گھر رکھ کر اس کی کفالت کی ذمہ داری ادا کرنا آسان نہ ہو، تو پھر اپنی نگرانی میں رکھتے ہوئے تعلیم وتربیت کے کسی اچھے سے اچھے ادارے میں ایڈمیشن دلا کر اس کا مکمل خرچ برداشت کرنا بھی یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کے اعلیٰ درجہ میں داخل ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ تو مبارک ہیں ہی، ان کا یہ مال بھی مبارک ہے جو کسی یتیم کی کفالت اور حسنِ سلوک میں خرچ ہو رہا ہے، قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے فضولیات میں مال خرچ کرنے والوں کو ضروریات کے مواقع بتلائے کہ اللہ کے دیے ہوئے مال کو خرچ کرنے کا صحیح اور بہترین مصرف جانتے ہو کیا ہے؟ فرمایا:

﴿ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴾ (البلد : ۱۳ تا ۱۶)

کسی کی گردن (قیدِ غلامی یا قرض وغیرہ سے) چھڑا دینا، یا پھر کسی فاقہ زدہ بھوکے کو کھانا کھلا دینا، یا کسی رشتہ دار یتیم (کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا) یا خاک نشین مسکین کی ضرورت میں مال خرچ کرنا، یہ مال خرچ کرنے کے بہترین اور عظیم ترین اجر کے مصارف ہیں، جن میں یتیم کی کفالت بھی داخل ہے۔

صاحبو! کفالتِ یتیم کا اس سے بڑا اجر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو شخص دنیا میں کسی یتیم کو اپنے قریب رکھے گا وہ جنت میں خود حضور ﷺ کے قریب رہے گا، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں ارشاد ہے کہ "أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ فِى الْجَنَّةِ هٰكَذَا" میں اور یتیم کا کفیل جنت میں اتنے قریب ہوں گے جتنا شہادت کی انگلی اور اس کے بعد والی انگلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جنت کے اعلیٰ درجات میں ہوگا، اسی طرح کی فضیلت اُن بیوہ عورتوں کے لیے بھی ہے جنہوں نے یتیم بچوں کی پرورش کے خاطر اپنے حسن وجمال کے باوجود شادی نہ کی۔ (ابوداؤد، مشکوۃ:۴۲۳)

اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ اس قسم کی روایات میں یتیم کے کفیل کے لیے حسنِ خاتمہ کا بھی

اشارہ ملتا ہے، کیوں کہ جب اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا تبھی تو یتیم کے یہ کفیل جنت میں حضور ﷺ کے قریب (درجاتِ عالیہ میں) ہوں گے، معلوم ہوا کہ یہ بہت مبارک اور اجرِ عظیم والا عمل بلکہ حضور ﷺ کا طریقہ ہے۔

حضور ﷺ کا یتیم کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حسنِ سلوک:

چنانچہ ایک (ضعیف) روایت میں ہے کہ غزوۂ اُحد سے واپسی پر ایک کم عمر صحابیؓ حضرت بشیر بن عقربہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کرنے لگے: حضور! آپ تو مع اصحاب کے واپس تشریف لے آئے؛ لیکن ابھی تک میرے ابو نہیں آئے، وہ کہاں ہیں؟ کیوں کہ ان کے والد غزوۂ اُحد میں شہید ہو چکے تھے اور یہ اب یتیم ہو چکے تھے؛ اس لیے اس سوال پر حضور ﷺ کی آنکھیں نم ہو گئیں، فرمایا: بیٹا! تمہارے ابو شہید ہو گئے، یہ سننا تھا کہ وہ تڑپ اٹھے اور بے اختیار رونے لگے، سارے مجمع پر رقت طاری ہو گئی، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سر پر شفقت کے ساتھ دستِ مبارک پھیرا، پھر اپنے ساتھ گھر لے گئے اور فرمایا: بیٹا بشیر! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں تمہارے والد کی جگہ ہوں، اور عائشہ تمہاری ماں کے درجہ میں ہوں؟ کہنے لگے: حضور! میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے! آپ کی ولایت اور کفالت سے بڑھ کر اور کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔
(مجمع الزوائد: ۸/۱۶۱، از ندائے شاہی)

معلوم ہوا کہ یتیم کی مکمل کفالت کرنا جو اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا اعلیٰ درجہ ہے یہ بھی حضور کا ﷺ اسوہ، طریقہ اور پسندیدہ عمل ہے۔

اسی لیے خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے فرمایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا درمیانی درجہ اور اس کی فضیلت:

الغرض اللہ اگر کسی باتوفیق بندے کو یتیم کی مکمل کفالت کا موقع دے دے تو یہ بڑی سعادت اور فضیلت کی بات ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی یتیم کی مکمل کفالت نہیں کرسکتا جو حسنِ سلوک کا اعلیٰ درجہ ہے، تو جس قدر انتظام کرسکتا ہو اس کی کوشش کرے، مثلاً اس کے کھانے پینے اور کپڑے کا انتظام کردے، یا اس کی طرف کسی مخلص صاحبِ خیر کو توجہ دلا کر اس کا انتظام کرادے، تو یہ یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کا درمیانی درجہ ہے، قرآن و حدیث میں اس کے بھی بڑے فضائل ہیں، چنانچہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے جنتیوں کے انعامات اور مشروبات کا تذکرہ فرمانے کے بعد ان کی صفات کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ أَسِيْرًا﴾ (الدهر: ٨)

’’وہ اللہ کی محبت کے خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔‘‘ اس سے ثابت ہوا کہ یتیموں کو کھلانا جنتیوں کی پاکیزہ صفات میں سے ہے، اور حدیثِ پاک میں ہے کہ یتیموں کو کھلانے والا جنت میں ضرور جائے گا، بشرطیکہ وہ مشرک اور ناقابلِ معافی جرم کا مرتکب نہ ہو۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ قَبَضَ يَتِيْمًا مِنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِيْنَ إِلٰى طَعَامِهٖ وَ شَرَابِهٖ، أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ، إِلَّا أَنْ يَعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ.

(ترمذی: ۲/ ۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۲۳)

ایک روایت میں ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ کھانے پر یتیم بیٹھا ہو، شیطان ان کے قریب بھی نہیں آتا۔ (الترغیب: ۳/ ۳۴۷)

اِن فضائل کے حصول کے لیے ہمیں چاہیے کہ اپنی بساط کے مطابق یتیموں کی کفالت اور ضرورت کا انتظام کریں، یا کسی اور سے کرائیں۔

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ادنیٰ درجہ اور اس کی فضیلت:

اگر کوئی شخص یتیموں کے ساتھ اس درجہ کا حسنِ سلوک بھی نہیں کرسکتا تو کم از کم اتنا ہی کرلے کہ انہیں محبت کی نظر سے دیکھے، ان کی عزت کرے، تحقیر اور تذلیل نہ کرے، ان کے حق میں دعائیں کرے، اور حسبِ موقع ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرے، تو یہ یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ادنیٰ درجہ ہے، اور حدیث میں اس کے بھی بڑے فضائل ہیں، چنانچہ ایک حدیثِ پاک میں ہے:

﴿عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيْمٍ، لَمْ يَمْسَحْهُ إِلَّا لِلّٰهِ، كَانَ لَهٗ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهٗ حَسَنَاتٌ."

(ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۲۳)

جس نے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے محض کسی یتیم کے سر پر شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیر دیا، تو اس کے ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے بدلے اُسے نیکیاں ملیں گی۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یتیم کے سر پر شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیرنے والے کا دل نرم ہوگا، دل کی سختی نرمی سے بدل جائے گی، حضور ﷺ نے قساوتِ قلبی کو دور کرنے کا ایک انتہائی مؤثر علاج یہ بتلایا، جب ایک شخص نے حضور ﷺ سے یہ شکایت کی کہ میرا دل سخت ہوگیا، (وعظ و نصیحت کے اثر کو قبول نہیں کرتا، اللہ کے خوف اور ملاقات کے شوق میں رونا نہیں آتا، مناظرِ عبرت کو دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں ہوتی، جو قساوتِ قلبی کی علامات ہیں) اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِمْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ، وَ أَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ" (مسند أحمد، مشکوٰۃ: ۴۲۵) یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریئے اور کسی مسکین کو کھانا کھلایئے، ان شاء اللہ اس سے دل کی سختی نرمی سے بدل جائے گی۔

یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کی مذمت:

یہ تو یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کے فضائل کا کچھ بیان تھا، لیکن یتیموں کے

ساتھ حسنِ سلوک کی اس قدر اہمیت اور فضیلت کے باوجود اگر کوئی شخص ان سے غفلت برتتا ہے؛ بلکہ ان کے ساتھ بدسلوکی وحق تلفی کا معاملہ کرتا ہے، تو یہ کسی سچے پکے مومن کے شایانِ شان ہے ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کفار و منافقین کے جن بعض برے اعمال کا تذکرہ کرنے کے بعد انہیں جہنم کی وعید سنائی تو اس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کرنا بھی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿أَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ﴾ (الماعون: ۱-۲)

کیا تم نے اسے دیکھا جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے، وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ (اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔)

اسی طرح ایک اور مقام پر رب العالمین نے کفار کی چند برائیوں پر جو تنبیہ فرمائی ان میں ایک برائی یتیموں کا اکرام نہ کرنا بھی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ﴾ (الفجر: ۱۷) ہرگز ایسا نہیں؛ بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کام کسی مومن کا نہیں ہے، بے ایمان ہی کا ہوسکتا ہے، دنیا والوں کو اپنے محبوب کے ذریعہ حکم دیا کہ ﴿فَأَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (الضحیٰ: ۹) اب جو بھی یتیم ہے تم اس پر سختی نہ کرنا، ان کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہ کرنا، یہ لوگ سختی کے نہیں؛ شفقت کے لائق ہیں، اگر ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ان ہدایات کو قبول کرلیں اور یتیموں اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کریں تو اس میں ہمارا فائدہ دینی اعتبار سے تو یہ ہوگا کہ اجرِ عظیم اور ربِ کریم کی رضا نصیب ہوگی، لیکن خود ان یتیموں اور کمزوروں کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں احساسِ کمتری ختم ہوکر انہیں جینے کا حوصلہ ملے گا، اور یہ بھی سماج کے بہترین افراد میں شامل ہوسکیں گے، جس سے سماج کو بھی فائدہ ہوگا۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیقِ عمل سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین۔

یکم مئی/ ۲۰۱۵ء مطابق: ۱۱/ رجب المرجب/ ۱۴۳۶ھ

قبل الجمعہ، چلڈرن ویلیج، انجار، کچھ، گجرات، بموقع اجلاسِ سالانہ

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۱۹)

مومن کے لیے فضائلِ اعمال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ، فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا، حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ." (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ۱۶/ كتاب الإيمان / الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تم (اہل ایمان) میں سے جب کوئی شخص اپنے اسلام (اعمال) کو اچھا بنالیتا ہے، تو پھر وہ جو بھی نیک عمل کرتا ہے تو اس کے ہر عمل کا اجر دس سے لے کر سات سو گنا تک بڑھا کر لکھا جاتا ہے، (اس کے برخلاف جب کوئی شخص شیطانی بہکاوے اور بشری تقاضے کے تحت) اگر کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس برائی کے بقدر (یعنی ایک ہی گنا) لکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے (موت کے بعد یا قیامت کے دِن) ملاقات کرے۔

مومن کے حسنِ عمل کی قدر:

اللہ رب العزت نے دنیا کو دار العمل اور انسان کو سہولت پسند بنایا ہے، غالباً یہ اسی کا

نتیجہ ہے کہ دنیا کا ہر نیک و بد انسان عمل تو کرتا ہی ہے، خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی، لیکن ہر کسی کی چاہت عمل کے سلسلہ میں یہی ہوتی ہے کہ اس کا عمل تو کم ہو؛ مگر اجر زیادہ ہو، کام تو کم ہو؛ مگر نفع، نام اور دام زیادہ ہو، بالخصوص آج کی دنیا میں تقریباً ہر کسی کی یہ چاہت اور خواہش ہوتی ہے کہ اسے کم وقت میں کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ اس کا نفع حاصل ہو جائے، بلکہ آج کل جرائم کی جو کثرت ہے اس میں کسی حد تک یہی کام چوری اور نفع خوری کا جذبہ کارفرما ہے کہ کم سے کم کام کا بھی پورا پورا نفع حاصل ہو، واقعہ یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے یہ چاہت کسی کی مکمل طور پر پوری ہو یا نہ ہو، مگر دینی اور اخروی اعتبار سے ہر مومن کی یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے کہ اسے کم وقت میں کم سے کم کام پر زیادہ سے زیادہ نفع ملے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے "الشکور" قرآنِ پاک میں فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ شَكُورٌ﴾ (الشوریٰ: ۲۲) محدثین نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "اَلَّذِیْ یُعْطِی الْأَجْرَ الْجَزِیْلَ عَلَی الْعَمَلِ الْقَلِیْلِ" (حاشیۂ مشکوٰۃ) یعنی "شکور" کے معنیٰ قدر کرنے والا، اور حق تعالیٰ شکور ہیں، اس لیے وہ عمل قلیل پر بھی اجرِ عظیم عطا کرتا ہے، نیز اس صفت کو حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے، اور یوں تو وہ دنیا میں سب ہی کے اعمال کی قدر کرتا ہے، مگر اپنے مطیع اور مومن بندوں کے اعمال کی تو بہت ہی زیادہ قدر کرتا ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث میں ہر مومن کے لیے اعمال پر موجود بشارتوں اور وعدوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے، اس لیے بندۂ مومن جب اپنے عمل میں حسن پیدا کر لیتا ہے تو پھر اس کے چھوٹے اور تھوڑے عمل کی بھی قدر فرما کر اسے اجرِ عظیم دیا جاتا ہے۔

عمل میں حسن تین چیزوں سے پیدا ہوگا:

اس مضمون کو حدیثِ مذکور میں بھی بڑی جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ" ...... یہاں پہلی بات یہ ہے کہ خطاب اہل ایمان سے ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم نے ایمان ہی پر اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے، ارشاد ہے: ﴿وَ إِنْ تُؤْمِنُوْا وَ

تَتَّقُوْا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۱۷۹) اگر تم ایمان لاؤ، پھر تقویٰ اور پرہیزگاری والی زندگی اختیار کر لو، تو تمہارے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے، لہٰذا حدیثِ پاک میں حضور ﷺ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ جب تم اپنے اسلام میں حسن پیدا کر لو، لہٰذا اسلام سے مراد یہاں اعمال ہیں۔ (اشرف المشکوٰۃ: ۱/۲۲۴) تو اعمال کو اسلام سے تعبیر کیوں کیا؟ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل رہنمائی کے بعد مسلمانوں سے حسنِ اعمال ہی کا تقاضا اور مطالبہ کرتا ہے، گویا اسلام حسنِ اعمال ہی کا نام ہے، اس لیے یہاں اعمال کو اسلام فرمایا گیا۔ واللہ اعلم۔

ارشاد ہے: "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ" جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال میں حسن پیدا کر لے، جو زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔

نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک: ۲)

اور حسنِ اعمال کے بغیر زندگی بے مقصد اور شرمندگی ہے۔ بقولِ شاعر:

اگر چہ مال و زر ہو؛ مگر ایماں سے محرومی ☆ مجھے وہ زندگی شرمندگی معلوم ہوتی ہے

لہٰذا زندگی حسنِ اعمال والی ہونی چاہیے، اور زندگی بھر ہر عمل میں حسن پیدا کرنا ضروری ہے، اب سوال یہ ہے کہ عمل میں حسن کیسے پیدا ہو؟ تو اس کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: (۱) اخلاصِ نیت۔ (۲) اتباعِ سنت۔ (۳) استقامت۔ جس عمل کو بندۂ مومن ان تین چیزوں کے اہتمام کے ساتھ کرتا ہے اس کا وہ عمل خواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو؛ مگر عند اللہ وہ حسین اور بہترین ہے، جس کا نقد انعام حیاتِ طیبہ کی شکل میں ملتا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل: ۹۷)

آج دنیا والے لائف اسٹائل اچھی بنانے کے لیے عمل چھوڑتے ہیں، حق تعالیٰ

وعدہ فرماتے ہیں کہ تم اپنا عمل اچھا کرلو، ہم تمہاری زندگی اچھی بنادیں گے۔

ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہ حضرت قاضی ابوبکر انصاری بزازؒ بڑے اہلِ علم میں گذرے ہیں، آپ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، غربت وافلاس کی وجہ سے فاقہ کی سنت پر عمل کرنے کی بار بار ضرورت پیش آتی، ایک دِن اسی حالت میں گھر سے باہر نکلے کہ شاید کھانے کا کوئی انتظام ہو سکے، مگر کوئی چیز میسر نہ آئی، البتہ ایک ریشمی تھیلی ملی، جس میں ہیرے کا ایک قیمتی ہار تھا، تھوڑی دیر میں ایک بوڑھے کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا کہ جس نے میری اس کیفیت کی تھیلی پائی ہو اور وہ اسے لاکر دے تو میں اسے پانچ سو دینار انعام میں دوں گا، (پانچ سو دینار یعنی چھ سو گرام سے زائد سونا، جو آدھے کلو سے بھی زائد ہوتا ہے) یہ اسی تھیلی کا اعلان تھا، اس لیے آپ نے تھیلی بوڑھے کے حوالہ کردی، مگر انعام لینے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اس کی جزا میں اللہ تعالیٰ ہی سے لے سکتا ہوں، اس واقعہ کے کچھ دِنوں کے بعد آپ ایک دِن سمندر سے کہیں سفر کررہے تھے کہ کشتی طوفان میں پھنس کر ٹوٹ گئی، اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ آپ ایک ٹوٹے ہوئے تختہ کو پکڑے رہے اور رفتہ رفتہ ایک جزیرہ پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، وہاں مسجد میں گئے اور شکر کے طور پر نماز ادا کی، پھر دعا ومناجات کے بعد تلاوت میں مشغول ہوگئے، نماز کے وقت لوگ مسجد میں آئے تو آپ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی، کیوں کہ اتفاق سے امامِ مسجد کا انتقال ہو چکا تھا، آپ نے بہترین انداز میں نماز پڑھائی، لوگوں کو تلاوت بہت پسند آئی، آپ سے وہیں قیام فرمانے کی درخواست کی گئی، تو شیخ نے اسے من جانب اللہ سمجھ کر قبول کرلیا، پھر جزیرہ کے لوگ آپ سے دین اور قرآن سیکھنے لگے اور اس طرح آپ جزیرہ کے شیخ بن گئے، کچھ عرصہ بعد لوگوں کو خیال ہوا کہ شیخ کا قیام عارضی نہ ہو، بلکہ دائمی ہو جائے، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسی جزیرہ میں شیخ کی شادی کرادی جائے، چناں چہ مرحوم امام کی لڑکی کا رشتہ پیش کیا گیا، جس کو بالآخر قبول کرلیا

گیا، نکاح کے بعد جب لڑکی کے رشتہ دار شیخ کی بیوی کو لے کر آئے تو شیخ نے جوں ہی لڑکی کو دیکھا تو حیران ہوگئے، کیوں کہ اس کے گلے میں وہی ہار تھا جو انہیں مکہ میں ملا تھا، اور انہوں نے بلا معاوضہ اس کے مالک کو سپرد کردیا تھا، اس لیے شیخ کی نظر ہار پر رُک گئی، لوگوں کو یہ انداز پسند نہ آیا کہ ''ہاروالی کے بجائے ہار پر نظر؟'' جب وجہ دریافت کی تو آپ نے ہار سے متعلق پورا واقعہ بیان فرمایا، سنتے ہی لوگ از راہِ تعجب ''اللہ اکبر'' اور ''سبحان اللہ'' پکارنے لگے، اب کی بار جب شیخ نے وجہ دریافت کی تو لوگوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ ہار جس شخص کا تھا وہ اسی لڑکی (جو آپ کی بیوی ہے) کا باپ تھا، وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مکہ میں جس نوجوان نے مجھے ہار لوٹایا ہے میں نے ساری دنیا میں اتنا امانت دار انسان نہیں دیکھا، اس لیے اے اللہ! تو اس سے میری ملاقات کرادے، میں اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ یہ عجیب بات ہے کہ اس کا انتقال ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی جگہ بھیج دیا، اگرچہ اضطراری حالت ہی میں سہی، اور بعد میں تمہارا نکاح اس کی بیٹی سے کرادیا، اس طرح ایک طرف تو اس کی دعا قبول ہوئی اور دوسری طرف تمہیں بھی تمہاری امانت داری کی جزا ملی۔ (القصص والاخبار: ۳۹، ماخوذ از: ''الشارق'': ۴۹/ بابت ماہ: مئی- جون ۲۰۱۵ء)

پھر یہ تو حسنِ عمل کا نقد نفع ہے، جب کہ اُخروی انعام اور فضیلت اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

حسنِ عمل کا کم از کم اجر دس گنا ہے:

حدیثِ پاک کے مطابق اس کی ادنیٰ فضیلت یہ ہے کہ حسنِ عمل کا کم از کم اجر دس گنا دیا جائے گا، اُسی کو رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ۱۶۰) جو شخص کوئی نیک عمل لے کر آئے گا (اپنے عمل میں حسن پیدا کرے گا) اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اس عمومی وعدے اور ضابطے کے مطابق ہم اور آپ روزانہ جو

پانچ نمازیں پڑھتے ہیں (جن کے مستقل فضائل ہیں) یہ پڑھنے کے اعتبار سے تو پانچ ہیں، مگر اجر وثواب کے اعتبار سے پچاس ہیں۔ اسی طرح سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے فرض روزے رکھنا اجر وثواب کے اعتبار سے دس مہینوں کے برابر ہے، جیسا کہ ایک حدیثِ پاک میں ہے:

" مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ."
(مسلم، مشکوٰۃ المصابیح : ۱۷۹)

جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر اس کے بعد شوال کے چھ دِن روزے رکھے، تو اسے ساری زندگی روزہ رکھنے کا ثواب دیا جائے گا۔

قرآنِ کریم کی تلاوت کے تعلق سے مروی ہے:

" مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ، فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ، وَ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، لَا أَقُولُ: الٓمٓ حَرْفٌ ؛ وَلٰكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ، وَ لَامٌ حَرْفٌ، وَ مِيمٌ حَرْفٌ." (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح : ۱۸۶)

تلاوتِ قرآن کے ہر ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں، اور "الٓمٓ" پڑھنے پر تیس نیکیاں دی جاتی ہیں۔

علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات کی تعداد چھ ہزار چھ سو سولہ ہے، اور حروف کی تعداد تین لاکھ تینتیس ہزار چھ سو اکہتر ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن، از: قرآنِ کریم کے حیرت انگیز اثرات وبرکات: ۶۰) اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ پورے قرآن کی تلاوت پر کتنا اجر ملتا ہے۔

نیز تسبیح کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص روزانہ سو مرتبہ "سبحان اللّٰہ و بحمدہ" پڑھتا ہے، حق تعالیٰ اس کو (اپنے قانونِ فضل کے مطابق دس گنا بڑھا کر) ہزار نیکیوں کا ثواب عطا فرماتے ہیں، اور ہزار گناہ (صغیرہ) معاف فرماتے ہیں۔ (مسلم

شریف، مشکوٰۃ: ۲۰۰)

پھر یہ تو چند مثالیں ہیں جن کا سرسری تذکرہ کیا گیا، ورنہ وعدہ یہی ہے کہ مومن کو اس کے ہر اچھے عمل پر کم از کم دس گنا بڑھا کر اجر دیا جائے گا، اور بعض اعمال پر سات سو گنا بڑھا کر اجر دیا جائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ﴾ (البقرة : ۲۶۱)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے سات سو گنا ثواب ملتا ہے، علاوہ ازیں جس شخص کے عمل میں جتنا زیادہ حسن ہوگا میزانِ عمل میں اس کا وزن اور اجر اتنا ہی زیادہ ہوگا، اور اگر کسی خوش نصیب کو حرمِ مقدس میں حسنِ عمل کا موقع مل جائے تو اس کے اجر وثواب کا تو پوچھنا ہی کیا، ہر نیکی اور حسنِ عمل پر ایک لاکھ تک اجر دیا جائے گا، فرمایا:
﴿وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرة : ۲۶۱)

ایک واقعہ:

بلکہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفت "الشکور" کا غلبہ ہوتا ہے تب تو بندہ کے چھوٹے اور تھوڑے سے عمل کو قبول فرما کر ساری زندگی کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ مرقاۃ میں اللہ رب العزت کے اسی صفتی نام کے تحت منقول ہے کہ ایک شخص کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھا گیا، تو اس سے دریافت کیا گیا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے میرا حساب وکتاب فرمایا تو میرے نیک اعمال کا پلڑا بلند ہو گیا، اور برے اعمال کا پلڑا جھک گیا، میں بڑا فکرمند تھا، اتنے میں اچانک میرے نیک اعمال کے پلڑے میں ایک تھیلی آکر گری، جس سے وہ پلڑا جھک گیا۔ (اور وعدۂ الٰہی ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (الأعراف : ۸) (جن کی ترازو کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔) کے مطابق میں فلاح پا گیا۔ جب میں

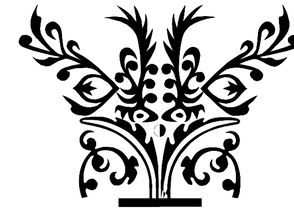
نے پوچھا کہ یہ تھیلی کیسی ہے؟ تو مجھ سے کہا گیا: ”کَفُّ تُرَابٍ أَلْقَيْتَهُ فِي قَبْرِ مُسْلِمٍ“ یہ ایک مشت بھر مٹی ہے، جو تم نے اپنے مسلمان بھائی کو قبر میں دفن کرتے وقت اس کی قبر پر ڈالی تھی۔ (اللہ نے تمہارے اس چھوٹے اور تھوڑے سے عمل کو قبول فرما کر تمہاری نجات کا فیصلہ فرمایا۔) (از مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ۵/ ۸۵)

صاحبو! یقیناً وہ بڑا قدرداں ہے، بس ضرورت ہے کہ ہم بھی اس کی اس صفت کی قدر و قیمت کو جانیں اور حسنِ عمل کا اہتمام کریں؛ بلکہ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرۃ: ١٤٨) پر عمل کرتے ہوئے نیک اعمال میں سبقت کریں، جیسا کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول تھا۔

حق تعالیٰ ہمیں حسنِ عمل کی توفیق عطا فرما کر شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۲۰)

لباس اور شرعی ہدایات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ”اِلْبَسُوْا الثِّيَابَ الْبِيْضَ، فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَ أَطْيَبُ، وَ كَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ.“ (رواہ أحمد والترمذی والنسائی وابن ماجه، مشکوٰۃ: ٣٧٤ / کتاب اللباس / الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سفید کپڑے پہنا کرو، کیوں کہ وہ صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے بہتر ہوتے ہیں، اور ان ہی میں اپنے مُردوں کو کفنایا کرو۔“

لباس کی قسمیں:

اللہ رب العزت کی ہر نعمت سے مخلوق کی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے، لہٰذا ہر نعمت ہماری ضرورت ہے، لباس بھی ایک نعمت ہے، جس سے سترِ عورت اور جسم کی حفاظت جیسی بنیادی ضرورت پوری ہونے کے علاوہ زینت بھی حاصل ہوتی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی کسی بھی مخلوق کو بے لباس نہیں رکھا، ہر ایک کے لیے کسی نہ کسی لباس کا

انتظام فرمایا، فرق یہ ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کے لیے تو پیدائشی طور پر قدرتی لباس کا انتظام فرما دیا، جب کہ انسان کو خاص حکمت کے تحت بے لباس پیدا فرما کر خارجی اور خصوصی لباس کا محتاج بنایا، اس طرح من جانب اللہ لباس کی دو قسمیں ہیں: (۱) قدرتی۔ (۲) خارجی و مصنوعی۔

اب جہاں تک تعلق ہے قدرتی لباس کا، تو نباتات کے لیے ان کی چھال ہی قدرتی لباس ہے، اور حیوانات کے لیے ان کی کھال اور بال ہی قدرتی لباس ہیں، اور چوں کہ نعمتِ لباس کا بنیادی مقصد سترِ عورت اور جسم کی حفاظت ہے، تو جو جانور سرد علاقوں میں ہوتے ہیں ان کی کھال اسی قدر موٹی اور بال والی ہوتی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سردی وغیرہ سے ان کے جسم کی حفاظت ہو، اور جو جانور گرم علاقوں میں ہوتے ہیں ان کی کھال پر بال کم ہوتے ہیں، پھر قدرتی طور پر ان میں گرمی برداشت کرنے اور گرم زمین پر چلنے کی صلاحیت ودیعت ہوتی ہے، اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر جو کھال رکھی ہے وہ نرم ہونے کے علاوہ بیرونی اثرات کو زیادہ قبول کرتی ہے، اور عام طور پر گھنے بالوں سے خالی ہوتی ہے، پھر اس کو نعمتِ عقل سے نواز کر طہارت و نظافت اور زیب و زینت کا فطری ذوق بھی عطا فرمایا، اس لیے انسان کو دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں خارجی اور مصنوعی لباس کا محتاج بنایا، تاکہ وہ اپنی فطری ضرورت، سترِ عورت اور حفاظت و زینت کے مطابق شرعی ہدایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہتر سے بہتر لباس پہن کر ''احسنِ تقویم'' کا نمونہ پیش کر سکے۔

لباس کے مقاصد:

اس سارے مضمون کو قرآنِ پاک نے بڑی جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا:

﴿ یٰبَنِیٓ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ ﴾ (الأعراف: ۲۶)

اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے (نعمتِ) لباس کو نازل کیا ہے، (تاکہ) تمہارے جسم کے ان حصوں کو چھپا سکے جن کا کھولنا برا ہے، (نعمتِ لباس سے تمہاری بنیادی ضرورت سترِ عورت پوری ہو سکے) اور جو تمہاری خوشنمائی کا بھی ذریعہ ہے (یعنی اسی نعمتِ لباس سے تمہیں زیب و زینت بھی حاصل ہوگی؛ لیکن یاد رکھو!) لباسِ تقویٰ ہی سب سے بہتر لباس ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں نعمتِ لباس کے تین بنیادی مقاصد کو بیان فرمایا، جن میں پہلا مقصد ہے سترِ عورت، جسے ''یُوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ'' میں بیان کیا، اور دوسرا مقصد ہے اظہارِ زینت، جس کو ''وَ رِیۡشًا'' کے ذریعہ بیان کیا، اور تیسرا مقصد ہے تقویٰ و طہارت، جیسا کہ ''وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی'' میں ارشاد ہوا، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

نعمتِ لباس کا پہلا مقصد سترِ عورت:

یہاں لباس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے سترِ عورت کو اس لیے بیان کیا کہ وہ انسان کی پہلی اور بنیادی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ بچہ ابھی تو پیدا بھی نہیں ہوتا؛ مگر اس کے لباس کا انتظام اس سے بھی پہلے کیا جاتا ہے، نیز ساری زندگی کوئی شریف اور سنجیدہ انسان برہنہ اور بے لباس رہنا پسند نہیں کرتا، چنانچہ انسانِ اول حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ شجرۂ ممنوعہ کے چکھنے کے بعد جب لباسِ جنت ان سے اُتر گیا، تو اسی وقت حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے جنتی درخت کے پتوں سے اپنی عریانی کو دور کرنے کی کوشش فرمائی:

﴿ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ﴾ (الأعراف: ۲۲)

ترجمہ: جب دونوں نے وہ درخت چکھا، تو ان دونوں کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے پر کھل گئیں، (لباسِ جنت اُتر گیا اور وہ دونوں بے لباس اور برہنہ ہو گئے، تو فوراً ہی)

وہ جنت کے کچھ پتے جوڑ جوڑ کر اپنے بدن پر چپکانے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سترِ عورت اور عریانی سے حفاظت انسانی فطرت میں داخل ہے، لہٰذا حق تعالیٰ نے فطرتِ انسانی کی رعایت کرتے ہوئے نعمتِ لباس ہی کو سترِ عورت کا ذریعہ بنا دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ يَـٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ ﴾ اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے نعمتِ لباس کو اس لیے نازل کیا تاکہ تم اس کے ذریعہ اپنے قابلِ ستر اعضاء کو چھپا سکو۔ ثابت ہو گیا کہ لباس کا پہلا بنیادی مقصد سترِ عورت ہے۔

سترِ عورت کی تکمیل کے لیے تین ہدایات:

اس مقصد کی تکمیل کے لیے شریعت نے بنیادی طور پر تین ہدایات دی ہیں: پہلی یہ کہ لباس مکمل ہو، ادھورا نہ ہو، اگر لباس اتنا چھوٹا اور نامکمل ہو کہ اس سے ستر کا حصہ کھلا رہ جائے، تو ظاہر ہے کہ اس سے لباس کا جو اصل مقصد ہے سترِ عورت، وہ فوت ہو جائے گا، اس لیے شریعت میں مرد و زن کے لیے ہر ایسے لباس کی ممانعت ہے جس سے کسی بھی طرح کی بے پردگی ہوتی ہو یا جسم کا چھپانے کے قابل حصہ کھلا رہتا ہو۔ آج کی طرح دورِ جاہلیت میں بھی بعض عورتیں ایسا مختصر لباس پہنتی تھیں جس سے جسم کا قابلِ ستر حصہ کھلا رہتا تھا، تو چوں کہ ایسا لباس فتنہ کا ذریعہ ہے، اس لیے شریعت میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

مقصدِ لباس ”سترِ عورت“ کے پیشِ نظر دوسری ہدایت یہ ہے کہ لباس موٹا ہو، باریک نہ ہو، کیوں کہ بعض اوقات لباس مکمل تو ہوتا ہے؛ لیکن اتنا باریک ہوتا ہے کہ اس سے بدن کے اندر والا حصہ جھلکتا ہے، تو اس سے بھی مقصدِ لباس پورا نہیں ہوتا، لہٰذا ہر ایسے باریک لباس کی بھی ممانعت ہے جس سے ستر نظر آتا ہو۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے تیسری ہدایت یہ ہے کہ لباس چست نہ ہو، کیوں کہ چست اور ٹائٹ لباس اوّل تو صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے، دوسرا یہ کہ اس سے بدن کا

ابھار اور نشیب و فراز نظر آتا ہے، تو یہ بھی مقصدِ لباس ”سترِ عورت“ کے خلاف ہے، غرض! ہر ایسا لباس جس سے مقصد فوت ہو جائے شریعت میں اس کی ممانعت آئی ہے، بلکہ ایسا بے مقصد لباس پہننے والوں کے لیے حدیثِ پاک میں سخت وعید آئی ہے، فرمایا: ”كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ“ (مسلم: ۳۸۳/کتاب اللباس/باب النساء الکاسیات، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۰۶)

ایسی عورتیں لباس پہن کر بھی بے لباس ہوتی ہیں، کیوں کہ ان کا لباس نامکمل، یا باریک یا چست ہونے کی وجہ سے مقصدِ لباس یعنی سترِ عورت کا فائدہ نہیں دیتا، پھر یہ نعمتِ لباس کی ناشکری کے علاوہ بے حیائی کا بھی سبب ہے، اس لیے ایسے لباس پہننے پر جنت اور اس کی خوشبو تک سے محرومی کی وعید ہے، جب تک وہ اپنے جرم کی سزا نہ بھگتیں یا پھر فضلِ کریم سے بخشی نہ جائیں۔

نعمتِ لباس کا دوسرا مقصد ”اظہارِ زینت“:

آیتِ کریمہ میں حق تعالیٰ نے نعمتِ لباس کا دوسرا مقصد ”اظہارِ زینت“ کو لفظ ”وَرِيشًا“ کے ذریعہ بیان فرمایا، ”رِيش“ دراصل پرندے کے پروں کو کہتے ہیں، جیسے پرندوں کی زینت پروں سے ہوتی ہے، اسی طرح انسانوں کی زینت کپڑوں سے ہے، چنانچہ ارشادِ باری: ﴿ يَـٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ ﴾ (الأعراف: ۳۱) میں ”زینت“ سے مراد لباس ہے، لباس کو ”زینت“ اس لیے فرمایا کہ اس سے بھی انسان زینت حاصل کرتا ہے، خصوصاً آج کی دنیا میں تو زینت کے لیے ہی مختلف قسم کے لباس استعمال کیے جاتے ہیں۔

لیکن ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ لباسِ زینت میں تین کپڑے داخل ہیں: (۱) پاؤں کا کپڑا، خواہ پاجامہ یا شلوار یا اور کوئی کپڑا۔ (۲) تن پوش، یعنی وہ کپڑا جو پورے بدن کو ڈھانک لے، خواہ وہ کرتا ہو یا اور کوئی کپڑا۔ (۳) سر پوش، یعنی سر ڈھانکنے کا کپڑا۔ مردوں کے لیے اس کا اعلیٰ درجہ عمامہ ہے، پھر ٹوپی، اور عورتوں کے لیے دوپٹہ اور رومالی وغیرہ ہے۔

ان تین کپڑوں کے ذریعہ انسان ضرورت پوری کرنے کے علاوہ زینت بھی حاصل کرسکتا ہے، اس لیے یہ بہترین لباس ہے، البتہ شریعت نے اس میں بھی سترِ عورت کی طرح اظہارِ زینت کی تکمیل کے لیے تین بنیادی ہدایات دی ہیں: (۱) طہارت۔ (۲) نظافت۔ (۳) جاذبیت۔ طہارت کا مطلب یہ ہے کہ لباس پاک ہو، کیوں کہ ناپاکی سے ہر انسان کو ویسے بھی فطری اور طبعی طور پر کراہت ہوتی ہے، اس لیے بھی ناپاک لباس زینت کا ذریعہ نہیں بن سکتا، پھر اسلام میں پاکی کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، جس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خود آپ ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (المدثر: ٤) اور اتنا ہی کافی نہیں کہ لباس پاک ہو؛ بلکہ اسی کے ساتھ دوسری ہدایت یہ ہے کہ لباس صاف بھی ہو، گندہ نہ ہو، کیوں کہ اگر لباس پاک تو ہو، مگر گندہ اور میلا ہو، تو بھی اظہارِ زینت کا سبب نہیں بن سکتا۔ غالبًا اسی مقصد کی تکمیل کے لیے حدیثِ مذکور میں سفید لباس پہننے کی ترغیب دی گئی، فرمایا: ”اِلْبَسُوا الثِّيَابَ الْبِيضَ، فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَ أَطْيَبُ“ سفید لباس پہنا کرو، کیوں کہ وہ پاکیزگی اور صفائی کے اعتبار سے بہتر ہے، حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مردوں کے لیے سفید رنگ کے کپڑوں کو پسند فرمایا، اگرچہ دوسرے رنگ کے کپڑے پہننا ناجائز نہیں؛ بلکہ خود حضور ﷺ نے بعض اوقات سرخ دھاری دار اور سبز رنگ کا لباس زیبِ تن فرمایا ہے، لیکن آپ ﷺ کا عام معمول سفید کپڑے پہننے کا تھا، اسی لیے آپ ﷺ نے مردوں کے لیے اسے دوسرے رنگوں پر ترجیح دی، وجہ یہ ہے کہ اس میں میل کچیل جلدی نمایاں ہوتا ہے، خوب صاف ستھرا رہتا ہے، لہٰذا اس لباس کو پہننے والا زیادہ پاک صاف رہنے کی کوشش کرتا ہے، جو اظہارِ زینت کا ذریعہ ہے۔

تیسری ہدایت یہ ہے کہ لباس پاک وصاف ہونے کے ساتھ ذرا عمدہ بھی ہو، بالکل ہی سادہ اور بے ڈھنگا نہ ہو، ورنہ اظہارِ زینت کا مقصد پورا نہ ہوگا، کیوں کہ زینت کے ایک معنٰی تو پراگندگی اور وحشت کو دور کرنے کے ہیں، اسی کو جمال بھی کہتے ہیں، یہ اگر فخر کے بجائے شکر کے طور پر ہو تو کمالِ نفس اور بزرگی کی علامت ہے، البتہ زینت کے دوسرے معنٰی

ہیں بناؤ سنگار اور حسن کی نمائش کرنا، یہ نفس کی کمزوری کی علامت ہے، اس سے عموماً شکر کے بجائے فخر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، (میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے تو بناؤ سنگار کرسکتے ہیں، اس کے علاوہ) جو زینت جمال کے ضمن میں ہو وہ شرعاً پسندیدہ ہے، اگرچہ حضور ﷺ کی زندگی کا اکثر حصہ سادگی کے ساتھ گذرا ہے، لباس کے متعلق بھی آپ ﷺ کا عموماً معمول یہی رہا کہ وہ نہایت پاک صاف اور سادہ ہوا کرتا تھا، لیکن کبھی کبھی نہایت عمدہ اور قیمتی لباس بھی آپ ﷺ نے زیبِ تن فرمایا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک ایسا جبہ زیبِ تن فرمایا جس کی قیمت دو ہزار دینار تھی۔ (اصلاحی خطبات: ۵/ ۲۶۹)

عاجز کے خیالِ ناقص میں وجہ اس کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ہر عمل امت کے ہر طبقہ کے لیے نمونہ ہے، سادہ لباس اس لیے زیبِ تن فرمایا تاکہ غریب اور سادہ لوگوں کے لیے نمونہ بن جائے، اور عمدہ وقیمتی لباس اس لیے زیبِ تن فرمایا تاکہ مالدار لوگوں کے لیے نمونہ جائے اور ان کے لیے بھی اس کی گنجائش نکل آئے۔

اس لیے ہمارے علماء نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس مالی وسعت ہو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی خوشی کے لیے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے قیمتی سے قیمتی لباس بھی اگر پہنے تو اس کی اجازت ہے، بشرطیکہ بڑائی اور غریبوں کی دل شکنی مقصود نہ ہو، اور وسعت کے باوجود نہایت سادہ اور بے ڈھنگا لباس پہننا منع ہے، چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو ان کے جسم پر نہایت بد ہیئت اور بے ڈھنگا لباس تھا، حضور ﷺ نے فرمایا: ”أَلَكَ مَالٌ؟“ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”مِنْ أَيِّ الْمَالِ؟“ کس قسم کا مال ہے؟ جواب دیا: حضور! اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کا مال عطا فرمایا ہے، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”فَإِذَا آتَاكَ اللّٰهُ مَالًا، فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ كَرَامَتِهِ.“ (أبو داؤد، مشكوٰة المصابيح)

جب اللہ نے تمہیں مال دیا ہے، تو اس کے انعام کا اثر تمہارے (لباس کے) اندر

بھی نظر آنا چاہیے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہیں پرانے اور نہایت سادہ لباس میں دیکھ کر غریب وفقیر سمجھنے لگیں، یہ بھی ایک طرح نعمتِ لباس کی ناشکری ہے، لہٰذا اللہ کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عمدہ لباس پہنو، تاکہ اس کی نعمت کے ساتھ تمہاری زینت کا بھی اظہار ہو کہ نعمتِ لباس کا دوسرا مقصد اظہارِ زینت ہے، اور حضور ﷺ کپڑے پہننے کے بعد جو دعا پڑھتے تھے اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے، دعا یہ ہے کہ ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ مَا أُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتِیْ وَ أَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَیَاتِیْ“ (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح)

اسی وجہ سے بعض بزرگوں کے متعلق منقول ہے کہ وہ نہایت عمدہ اور اچھا لباس زیب تن فرماتے، مثلاً امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ آپؒ ہر روز ایک نیا جوڑا پہنا کرتے تھے، پھر جو لباس ایک مرتبہ زیب تن فرما لیا، دوسری مرتبہ نہ پہنتے، بلکہ کسی غریب کو دے دیتے۔ (اصلاحی خطبات: ۲۵۳/۵) تو یہ اسی مقصد کے تحت تھا۔

لباسِ تقویٰ کا مطلب:

آیتِ لباس کا آخری جز ہے: ﴿وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ﴾ اور تقوی کا لباس سب سے بہتر ہے، یہ اللہ کی نشانیوں (اور نعمتوں) میں سے ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اس میں لباسِ تقوی کو سب سے بہترین لباس قرار دیا گیا، تو تقوی اللہ سے ڈرنے، اس کے حکموں پر چلنے اور اس کی نافرمانیوں (گناہوں) سے بچنے کا نام ہے، جب کسی شخص کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے بعد یہ ساری چیزیں آسان ہو جاتی ہیں، اور یہی گویا باطنی لباس ہے، لہٰذا اب لباسِ تقوی کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس طرح کپڑے کا ظاہری لباس ضروری ہے، اسی طرح تقوی کا باطنی لباس بھی ضروری ہے، کیوں کہ کپڑے کے ظاہری لباس سے جسم گرمی وسردی وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے، تو تقوی کے باطنی لباس سے انسان گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور کپڑے کے ظاہری لباس سے جسم مزین ہوتا ہے، تو تقوی کے باطنی لباس سے دِل مزین ہوتا ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى

ذٰلِكَ خَیْرٌ﴾ تقوی والا لباس کپڑے والے لباس سے بہتر ہے۔

لیکن اس جملہ کا دوسرا مطلب بھی بعض علماءِ مفسرین نے بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ یہاں لباسِ تقویٰ کا مطلب ہے: ”وَ لِبَاسُ الْمُتَّقِیْنَ“ (حاشیۂ جلالین/ص:۱۳۱) یعنی متقیوں والا لباس عام لوگوں کے لباس کے مقابلہ میں بہتر ہے، اگر چہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عام لوگوں کی طرح لباس پہننا بھی جائز تو ہے؛ لیکن ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ﴾ متقیوں کی طرح لباس پہننا زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ کو عام لوگوں کے بالمقابل متقیوں کا لباس زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جو جادوگر میدان میں اترے تھے؛ انہوں نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا لباس پہنا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس لباس کی برکت سے ان کو دولتِ ایمان سے نواز دیا۔

(مستفاد از: تحفۃ القاری: ۱۷۸/۲، مفتی سعید احمد پالن پوری)

صاحبو! پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ لباس بھی اپنا خاص اثر رکھتا ہے، جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے، کہ ایک مہینہ صالحین اور متقین کا لباس پہنے اور اس کے نیک اثرات دیکھے، اور ایک مہینہ فاسقین کا لباس پہنے، اس سے ضرور دل میں تبدیلی محسوس ہوگی، یہی وجہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں جہاں مردوں وعورتوں کو ایک دوسرے کے لباس پہننے سے منع فرمایا، وہیں خاص غیروں کی مشابہت والا لباس پہننے سے بھی منع فرمایا، کیوں کہ جیسا لباس ویسا اثر، فاسقین کا لباس پہننے سے فسق وفجور اور عجب وغرور کا احساس ہوگا، جب کہ صالحین کے لباس سے نیکی وعاجزی کا جذبہ پیدا ہوگا، اس لیے فرمایا: ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ﴾ متقیوں کا والا لباس ہی بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)

حق تعالیٰ ہمیں لباسِ تقویٰ پہننے اور اہل تقویٰ کے اوصاف اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۲۴/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۶ھ/ قبل الجمعہ مطابق: ۱۲/ جون/ ۲۰۱۵ء، بزم صدیقی بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۲۱)

مکاتب کی افادیت وضرورت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُثۡمَانَ بۡنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "خَیۡرُکُمۡ مَنۡ تَعَلَّمَ الۡقُرۡآنَ وَ عَلَّمَهٗ." (رواه البخاری، مشکوٰۃ: ۱۸۳/ کتاب فضائل القرآن/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس نے (اللہ پاک کی رضا کے لیے) قرآنِ کریم کو سیکھا اور دوسرے کو سکھایا۔" (جیسے سیکھنے سکھانے کا حق ہے، مراد احکامِ قرآنی ومعانی اوران کے حقائق ودقائق ہیں)

مکاتب دینی تعلیم کے مراکز ہیں:

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت سے بعض چیزیں ایسی بھی پیدا فرمائی ہیں جو اپنی ظاہری جسامت وضخامت کے اعتبار سے تو بہت چھوٹی ومعمولی ہوتی ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کی افادیت ونافعیت کا دائرہ نہایت وسیع ہوتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ برگد (بڑ) کا تخم (بیج) اپنے حجم (جسامت وضخامت) میں رائی اور خشخاش کے دانے کے

برابر یعنی بہت ہی معمولی اور چھوٹا ہوتا ہے، لیکن جب وہ قدرت کی کرشمہ سازی کے بعد زمین سے اُگ کر نشوونما پاتا ہے، تو اتنا قوی ہیکل اور گھنا درخت بن جاتا ہے کہ بیک وقت سینکڑوں انسان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس کے سایہ تلے راحت کا دم لیتے ہیں، بالکل یہی مثال ہمارے دینی مکاتب کی بھی ہے، کہ بظاہر تو یہ چھوٹے اور معمولی مدارس ہیں، لیکن ان کی افادیت کا دائرہ وسیع ہے کہ ان کے سایہ تلے افراد ہی کو نہیں؛ بلکہ قوموں کو ایمانی وروحانی راحت ملتی ہے، اس لیے کہ مکاتب دراصل ایمان وقرآن کی بنیادی وضروری تعلیم کے مراکز ہیں، اگر ان دینی مکاتب کو اسلام کے شجرۂ طیبہ کا بنیادی تخم اور بیج کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، اس لیے کہ ان مکاتب میں امت کے نونہالوں کو دین کی بنیادی اور ضروری تعلیم دے کر گویا ان کے دل کی زمین پر دین وایمان کا بیج بویا جاتا ہے، مکاتب کی یہی بنیادی اور ضروری تعلیم امت میں دین وایمان کی بقاوحفاظت کا بڑی حد تک ذریعہ ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مکاتب کا قیام کب اور کیوں؟

ہمارے اکابر نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکاتب کا نظام اسی غرض سے قائم فرمایا تاکہ اس سے ایمان وقرآن کی بقاوحفاظت ہوسکے، کیوں کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب غیر منقسم ہندوستان میں فرنگی (انگریز) قابض ہو گئے، تو ہمارے اکابر نے اسلام اور مسلمانوں کی بقاوحفاظت کے لیے تحریکِ جہاد شروع کی، لیکن بدقسمتی سے اس میں کامیابی نہ مل سکی، تب اسلام اور مسلمانوں کی بقاوحفاظت کے لیے مکاتب کا قیام عمل میں لایا گیا، جس میں بڑی حد تک بحمد اللہ کامیابی ملی، نظامِ مکاتب کا یہ الہامی اور تجدیدی کارنامہ بنیادی طور پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اپنے کسی عمل پر اعتماد نہیں؛ البتہ ہم نے پورے ہندوستان میں مکاتب کی جو داغ بیل ڈالی ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اس کو ہماری نجات کا ذریعہ بنائے گا۔ (شمائمِ امدادیہ)

غور کیجیے! حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے نہ جانے کتنے عظیم الشان کارنامے ہیں، لیکن آپؒ نے انہیں نظر انداز فرما کر اپنی نجات کا ذریعہ فقط قیامِ مکاتب میں منحصر فرما دیا، تو اس سے بھی مکاتب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مکاتب میں مقاصد کی تعلیم دی جاتی ہے:

علاوہ ازیں ان مکاتب میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ معمولی نہیں ہے؛ بلکہ مقاصدِ دین کی یعنی ایمان اور قرآن کی نہایت بنیادی اور ضروری تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ مکاتب کے نصاب میں بنیادی طور پر تین چیزیں داخل ہیں: (۱) کلمات۔ (۲) کتابیں۔ (۳) قرآنِ کریم۔

سب سے پہلے بچوں کو کلمات اور روز مرہ کی ضروری دعائیں ترجموں کے ساتھ سکھائی جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس کی اہمیت مسلم ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بچپن میں مکتب کی تعلیم سے محروم رہتے ہیں عموماً انہیں کلمات اور روز مرہ کی ضروری دعائیں بھی نہیں آتیں، جب کہ مکتب کی برکت سے یہ چیزیں بچپن ہی سے ایک بچہ سیکھ لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق بنیادی عقائد و ہدایات کی تعلیم پر مشتمل کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جن سے ایک بچہ بڑی حد تک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق بنیادی تعلیمات و ہدایات حاصل کر کے مقاصدِ زندگی کو سمجھ سکتا ہے، اس کے بعد قاعدہ میں بچہ کو حروفِ قرآنی کی شناخت اور صحیح ادائیگی کے مراحل سے گذار کر قرآنِ کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ اگر ہمارے مکاتب میں زندگی کے ان مقاصد کی بنیادی تعلیم کے بجائے صرف قرآن ہی کو سیکھا سکھایا جاتا تو مکاتب کی افادیت کے لیے اتنا بھی کافی تھا، کیوں کہ قرآنِ کریم کو سیکھنے سکھانے؛ بلکہ کسی بھی طرح سیکھنے سکھانے کا ذریعہ بن جانے کے بھی بہت ہی زبردست فضائل وارد ہوئے ہیں۔

قرآنی تعلیم و تعلّم کے فضائل:

چنانچہ حدیثِ مذکور میں معلم اعظم رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ“، تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کریم سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ علماءِ محدثین کے اقوال کے مطابق یہاں ”خَيْرُكُمْ“ سے مراد امتِ مسلمہ ہے، اور اس میں حصر نہیں، مطلب یہ ہے کہ اے امتِ مسلمہ! تمہارے وہ لوگ جو نیک نیتی سے دیگر بہت سے نافع علوم سیکھتے سکھاتے ہیں، بہتر تو وہ بھی ہیں، لیکن ان میں عظیم ترین اور بہترین وہی ہیں جو قرآنِ کریم سیکھتے سکھاتے ہیں؛ کیوں کہ قرآن کی یہ تعلیم اتنا عظیم الشان کام ہے کہ خود حق تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی، ارشاد ہے:

﴿ الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ﴾ (الرحمٰن: ۱-۲)

وہ رحمٰن ہی ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی۔

دوسری جگہ یہ تفصیل ہے کہ رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو براہِ راست قرآن کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴾ (القیامۃ: ۱۶)

غالباً تعلیمِ قرآن کی اسی لیے اتنی زبردست فضیلت ہے، پھر قرآنِ کریم کو سیکھنے سکھانے کا ابتدائی درجہ اس کے الفاظ و حروف کی شناخت و صحیح ادائیگی کا ہے، لیکن اس کا اعلیٰ درجہ قرآن کے علوم و معارف اور حقائق کو سیکھنے سکھانے کا ہے۔

حدیثِ پاک کے پہلے جز میں قرآنِ کریم کے سیکھنے والوں کی عظمت و فضیلت بیان فرمائی، تو دوسرے جز میں سکھانے والوں کی، اور قرآن کے سیکھنے سکھانے والوں کی یہ عظمت و فضیلت کسی اور نے نہیں؛ بلکہ خود صاحبِ قرآن ﷺ نے بیان فرمائی۔

اور صاحبو! جب خیر الکلام کلام اللہ ہے، تو حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد خیر الناس وہی لوگ ہیں جو کلام اللہ کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں، ان ہی کے متعلق ایک

حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ایک موقع پر اپنے بہت محبوب شاگرد سیدنا ابوہریرہؓ کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! تَعَلَّمِ الْقُرْآنَ وَ عَلِّمْهُ، وَ لَا تَزَالُ كَذٰلِكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْمَوْتُ، فَإِنْ أَتَاكَ الْمَوْتُ، وَ أَنْتَ كَذٰلِكَ، حَجَّتِ الْمَلَائِكَةُ إِلٰى قَبْرِكَ، كَمَا تَحُجُّ الْمُؤْمِنُوْنَ إِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ الْحَرَامِ." (مسند الفردوس، رقم: ۸۳۸۵)

یعنی اے ابوہریرہ! قرآن سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ! یہاں تک کہ اسی مشغولی میں تمہاری موت آجائے، کیوں کہ اگر اس مشغلہ میں تمہاری موت آگئی، تو فرشتے تمہاری قبر کی اس طرح زیارت کے لیے آئیں گے جس طرح اہل ایمان بیت اللہ الحرام کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ (رزقنا اللہ بمنہ و فضلہ...... آمین)

یہ رتبہ ہر کسی کو میسر نہیں ہوتا، اسی لیے تو کہتے ہیں:

یہ رُتبۂ بلند ملا، جس کو کہ مل گیا ☆ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

یقیناً ہمارے مکاتب کے وہ طلبہ اور علماء جو نیک نیتی کے ساتھ قرآنِ کریم کو سیکھنے سکھانے میں مشغول ہیں وہ ان فضائل کے حقدار ہیں، لہٰذا انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں؛ بلکہ انہیں خوش ہونا چاہیے کہ صاحبِ قرآن ﷺ نے انہیں امت کے بہترین افراد بتلا کر اس میں ساری زندگی مشغول رہنے کی ترغیب دی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات علماء اپنے وقت کے شیخ الکل ہونے کے باوجود معلم القرآن اور معلم الصبیان بن گئے۔

ایک واقعہ:

مثلاً حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ مشہور تابعی ہیں، آپؒ تفسیر وحدیث اور دیگر علومِ دینیہ میں بڑے اونچے مرتبہ کے حامل تھے، لیکن اس کے باوجود ساری عمر کوفہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر قرآنِ کریم پڑھانے میں گذار دی، کسی نے وجہ پوچھی، تو فرمایا کہ (ہمارے

استاذ) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ہمیں حضور ﷺ کا یہ ارشاد سنایا تھا کہ "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ"، تو اس ارشاد نے ہمیں یہاں بٹھادیا۔ (النشر فی القراءات العشر لابن الجزریؒ: ۱/۳، از: "تراشے"/ص: ۱۰۷)

مکاتب کے علماء کا مقام:

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مکاتب کے ان علماء کا مرتبہ اور مقام بھی بہت بڑا ہے، یہ حضرات معلم القرآن والصبیان ہونے کی وجہ سے بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں، کیوں کہ مکاتب کے یہ بچے بالکل سادہ دل ہوتے ہیں، اور بلاشبہ ایسی سادہ لوحِ قلب (دل کی تختی) پر نقشِ اوّل جمانا (انہیں ابتدائی تعلیم دینا) بڑی صبر آزما محنت کا نام ہے، کیوں کہ مدتوں تک جگر کا پانی کرنا پڑتا ہے، اور یہ چیز عموماً معلم القرآن والصبیان میں اخلاص اور انکساری پیدا کر دیتی ہے۔

اسی لیے بعض بزرگوں نے عجیب بات ارشاد فرمائی کہ حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ (بخاری: ۲/۸۲۰/مشکوٰۃ: ۲۵۷/کتاب الاطعمہ/ باب الاجارۃ) تو اس میں حق تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں تھیں، منجملہ ان کے ایک یہ کہ بکریاں پھرتیلی طبیعت کی ہوتی ہیں، اِدھر اُدھر دوڑتی رہتی ہیں، چرواہے کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ کوئی بکری گلّہ سے علیٰحدہ رہ جائے، بے چارہ چرواہا صبح سے شام تک اسی فکر میں حیران و پریشان رہتا ہے اور تھک کر نیم مردہ ہوجاتا ہے، یہ شُبّانی یعنی بکریوں کا چرانا اُسے صبر وحلم کا عادی بنادیتا ہے، حضراتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کو اگرچہ من جانب اللہ طبعی اور فطری طور پر اعلیٰ ترین انسانی اور بلند پایہ اخلاق وصفات سے نوازا جاتا ہے، مگر صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا جاتا، بلکہ باقاعدہ اس کی عملی مشق بھی کروائی جاتی ہے، تاکہ وہ انتقام و غصہ اور جھنجھلاہٹ کے موقعوں پر صبر وحلم اور حوصلہ وہمت سے کام لیں، اور عام انسانوں کی طرح جوش وجذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی اقدام کرنے کے بجائے ہوش وخرد کی روشنی میں حلم

وتدبر کے ساتھ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کریں۔

اب ہمارے ان معلم القرآن والصبیان حضرات کی کارکردگی پر غور کیا جائے تو ان کا حال بھی بکریوں کے چرواہے سے کچھ کم نہیں، اگر بالفعل ان کو یہ سنت ادا کرنے کی سعادت نہ ملی تو گویا انہیں مکتب کے بچے دے دیے گئے ہیں، جو صبح سے شام تک ان کا دماغ چاٹ لیتے ہیں، اور جیسے بکریاں چرواہے کی روک ٹوک کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیتیں، مکاتب کے ان بچوں کا حال بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے، پھر جس طرح بکریاں اپنے چرواہے کی بھلائی برائی بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، یہ بچے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں، اُن سے بھی کوئی توقع نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اُستاذ کی تعریف کے پل باندھیں گے، اس لیے جیسے بے کس چرواہے میں عاجزی و انکساری پیدا ہوجاتی ہے ایسے ہی ان مکاتب کے معلمین میں بھی عاجزی و انکساری پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے مکاتب کے ان معلمین کو (اضطراراً ہی سہی) بکریاں چرانے کی سنت کا نعم البدل عطا فرمادیا ہے۔

غالبًا اسی لیے حضرت مفتی احمد بیمات صاحبؒ کے بقول شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رائے کے مطابق علماءِ رَبَّانیین سے مراد یہی مکاتب کے علماء ہیں۔
(دینی تعلیم: مسائل اور ذمہ داریاں/ص:۲۷)

قرآنی تعلیم وتعلّم کا ذریعہ بننے کی فضیلت:

الغرض! مکاتب کا یہی نفع کیا کم ہے کہ ان میں قرآنِ کریم سیکھا اور سکھایا جاتا ہے، اور قرآن ایسی مقدس کتاب ہے کہ اس کو سیکھنے سکھانے کی فضیلت تو ہے ہی، جیسا کہ ابھی تفصیل گذری، اگر کوئی خوش نصیب والی یا متولی اور منتظم کسی بھی طرح قرآنِ کریم کی تعلیم و تعلّم کا ذریعہ بن جائے وہ بھی ان شاء اللہ محروم نہیں رہے گا، جیسا کہ ایک حدیثِ پاک میں اس کا اشارہ ملتا ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ عَلَّمَ ابْنَهُ الْقُرْآنَ نَظَرًا، غُفِرَ لَهُ مَا

تَقَدَّمَ وَ مَا تَأَخَّرَ." (کذا فی الخصال المکفرة للذنوب المتقدمة والمتأخرة، لابن حجر العسقلانیؒ: ۱۰۲، والطبرانی فی الأوسط: ۲/۵۵۷، از: گلدستۂ مغفرت/ص:۶۷، مولانا یونس صاحب پالن پوریؒ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس شخص نے اپنے بیٹے کو (محض) ناظرہ قرآن پڑھایا، تو اس کے اگلے پچھلے (صغیرہ) گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

یہاں گناہوں سے مراد اگرچہ صغیرہ ہیں؛ لیکن اگر اللہ تعالیٰ صغائر کے علاوہ کبیرہ گناہ بھی معاف فرمادیں تو یہ اُن کے فضل سے کیا بعید ہے؛ بلکہ ایک واقعہ سے اس کی ایک حد تک تائید بھی ہوتی ہے۔

مکتب میں بچے کو پڑھانے سے باپ کی مغفرت کا واقعہ:

علامہ رازیؒ نے تفسیر کبیر میں "بسم اللہ" کی تاثیر کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر ایک قبر پر ہوا، جس میں میت کو عذاب دیا جارہا تھا، کچھ وقت کے بعد جب دوبارہ آپ کا وہاں سے گذر ہوا تو (اللہ تعالیٰ کی جانب سے کشف کے ذریعہ) بتایا گیا کہ قبر میں رحمت کے فرشتے ہیں، عذاب کی تاریکی کے بجائے وہاں اب مغفرت کا نور ہے، آپ علیہ السلام کو تعجب ہوا، اللہ تعالیٰ سے اس عقدہ کے حل کی دعا کی، تو حق تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی جس میں فرمایا گیا کہ "یہ بندہ گنہگار تھا، جس کی وجہ سے مبتلائے عذاب تھا، مرتے وقت اس کی بیوی اُمید سے تھی، اس کا بچہ پیدا ہوا، وہ بچہ (جب پڑھنے کی عمر کا ہوا تو) مکتب میں داخل کردیا گیا، جب اُستاذ نے اُسے پہلے دِن "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھایا، تب مجھے اپنے اس قبر میں مبتلائے عذاب بندے سے حیا آئی کہ جس کا بیٹا زمین کے اوپر میرا نام لیتا ہے، مجھے رحمٰن ورحیم کہتا ہے، زمین کے نیچے میں اُسے عذاب دوں؟ (بس فوراً عذاب ہٹالیا گیا) (تفسیر کبیر: ۱/۱۷۲، از: "کتابوں کی درس گاہ میں"/ص:۸۱)

مساجد کی آبادی مکاتب کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

ان حقائق سے مکاتب کا امت مسلمہ، اس کے بچوں، معلموں اور کسی بھی طرح واسطہ بننے والوں کے حق میں مفید ہونا ثابت ہوتا ہے، لہٰذا مکاتب کی اس اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر ضرورت ہے کہ جگہ جگہ مکاتب قائم کیے جائیں، اور جس طرح ہمارے عوام اپنی مساجد پر للہ مال خرچ کرتے ہیں؛ ان مکاتب و مدارس پر بھی للہ مال خرچ کیا جائے، اور اس کے لیے بہترین اور ماہر مدرسین کا انتظام کیا جائے، تاکہ رسمی تعلیم کے بجائے صحیح تعلیم کو فروغ ملے۔

مفکر ملت حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے تھے کہ ہمارا کام اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوگا جب تک مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کو ان کی غذا اور دوا سے زیادہ اہم نہیں سمجھیں گے اور دینی مدارس و مکاتب کو اسی ذوق وشوق سے قائم نہیں کریں گے جس سنجیدگی اور ذوق وشوق سے وہ مساجد کی تعمیر کرتے ہیں، اس لیے کہ ان مساجد کی آبادی ان مکاتب کے بغیر نہیں ہوسکتی، جب تک ہم اس راہ کے مصارف کو اپنا اہم ترین اور مقدس ترین فریضہ نہ سمجھیں گے اور اس میں صدیقی ذوق کے ساتھ حصہ نہ لیں گے اور جب تک ہم اس راہ کی کوشش کو عبادت کا درجہ نہ دیں گے اس وقت تک ہمارا کام قابل اطمینان نہ ہوگا۔ (تکبیر مسلسل:۱۸۴)

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۷/ جمادیٰ الاولی/ ۱۴۳۶ھ

مطابق: ۲۷/ فروری/ ۲۰۱۵ء، قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

119

(۲۲)

صلہ رحمی کی اہمیت وفضیلت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمنِ بْنِ عَوْفٍؓ قَالَ: سَعِمْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: قَالَ اللّٰہُ تَبَارَكَ وَتَعَالیٰ: أَنَا اللّٰہُ، وَأَنَا الرَّحمنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَھَا مِنَ اسْمِی، فَمَنْ وَصَلَھَا وَصَلْتُہٗ، وَمَنْ قَطَعَھَا بَتَتُّہٗ“.

(رواہ أبوداوٗد، مشکوٰۃ المصابیح : ٤٢٠ أبواب البر والصلة)

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ میں نے رحمتِ عالم ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ: حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: میں ہی اللہ (جل جلالہٗ) ہوں، اور میں ہی الرحمٰن ہوں، میں نے رحم (قرابت) کو پیدا کیا ہے، اور اپنے نام الرحمٰن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے، پس جو اسے جوڑے گا (صلہ رحمی کرے گا) میں اسے (اپنی رحمت سے) جوڑوں گا، اور جو اُسے توڑے گا (قطع رحمی کرے گا) میں اسے اپنی رحمت سے توڑ دوں گا۔ (حدیث قدسی نمبر:۸)

صلہ رحمی کی حقیقت اور حکم:

حق تعالیٰ سبحانہ وتقدس نے اپنی قدرت، حکمت ومشیت سے انسان کی پیدائش کا

نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنی پیدائش کے وقت ہی سے مختلف رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے، مثلاً ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، بہن، بھائی، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں اور دیگر اعزہ واقارب، یہ رشتے ایسے ہیں جو اکثر وبیشتر پیدائشی طور پر ایک انسان کے ساتھ متعلق اور جڑے ہوتے ہیں، اسی لیے دنیا کا ہر باشندہ پیدائشی وفطری طور پر معاشرت پسند واقع ہوا ہے، اوراس کی فطرت وطبیعت اُسے اپنے ہم جنسوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور ان کے ساتھ اجتماعی، خاندانی وسماجی زندگی بسر کرنے پر گویا مجبور کرتی ہے، کیوں کہ اس دنیوی زندگی کی استواری وخوشگواری کا انحصار اور دارومدار ایک حد تک اسی پر ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے اور ان تعلقات کو بحسن وخوبی قائم ودائم رکھے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اس سلسلہ کے تعلقات کو اچھی طرح نبھانے اور جوڑے رکھنے کا نام صلہ رحمی ہے، جو واجب اور ضروری ہے۔ اور تعلقات توڑ دینے کا نام قطع رحمی ہے جو حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، قرآن وحدیث میں کئی مقامات پر صلہ رحمی کی ترغیب وتاکید اور قطع رحمی کی شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

صلہ رحمی کے لیے خوفِ الٰہی ضروری ہے:

مثلاً کلامِ الٰہی میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ﴾ (النساء:۱) اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سے تم سوال کرتے ہو آپس میں، اور خبردار رہو قرابت والوں (رشتہ داروں) سے۔ آیت کریمہ میں حق تعالیٰ کے فرمان کا حاصل یہ ہے کہ جسے اللہ کا ڈر نہیں وہ آپسی تعلقات کو کما حقہ نہ نبھا سکتا ہے، نہ رشتہ داروں کے ساتھ کما حقہ حسن سلوک کرسکتا ہے اس لیے یہاں صلہ رحمی سے پہلے خوفِ الٰہی کا حکم دیا گیا، آگے ارشاد فرمایا: ”وَالْاَرْحَامَ“...... لفظ ”أرحام“ رحم کی جمع ہے، عربی میں ”رحم“ بچہ دانی کو بھی کہتے ہیں، جس کے اندر ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، اس لیے ”ارحام“ پیٹ

کے جتنے بھی رشتے ہیں ان سبھی کے لیے استعمال ہوتا ہے، پھر یہ کلمہ مطلقاً رشتہ داری کے تمام تعلقات کے لیے استعمال ہونے لگا، اس طرح لفظِ ”أرحام“ میں کافی وسعت پیدا ہوگئی، سارے عزیز وقریب، رشتہ دار اور خاندان والے (خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں) اس کے تحت آجاتے ہیں۔ اب آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرو اور رشتہ داریوں سے بھی ڈرو کہ کہیں رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ادائے حقوق میں تم سے کوئی کمی اور کوتاہی ہوجائے اور تم رحمتِ الٰہی سے دور اور محروم ہوجاؤ۔

صلہ رحمی کی فضیلت اور قطع رحمی کی مذمت:

اس لیے کہ رحم (رشتہ داری) کا یہ لفظ مذکورہ حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پاک نام ”الرحمن“ سے نکالا گیا، گویا لفظ رحم (رشتہ داری) رحمٰن کے درخت سے نکلی ہوئی ایک نورانی ڈالی اور سنہری شاخ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ان رشتوں کو کسی اور نے نہیں بنایا؛ بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے بنایا، اور اسی نے جوڑا ہے، اس لیے فرمایا: ”فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ“ اب جو بھی ان رشتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت حاصل کرنے اور اس کے غضب وغصہ سے بچنے کے لیے جوڑے گا، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جڑ جائے گا، غور کیجیے صلہ رحمی کی اس سے زیادہ فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے۔ جب کہ دیگر احادیث میں اس کے اور بھی فضائل وارد ہوئے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ”مَنْ أَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَأَلَهٗ فِيْ أَثَرِهٖ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ.“ (بخاری ومسلم، مشکوۃ المصابیح /ص:۴۱۹)

ترجمہ: جو یہ چاہے کہ اس کی روزی میں فراخی وکشادگی اور عمر میں زیادتی نصیب ہو، تو وہ صلہ رحمی کا اہتمام کرے۔

معلوم ہوا کہ اس سے رزق میں وسعت اور عمر میں برکت ہوتی ہے، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے جو متعین روزی ملتی ہے وہ مقدمات، فضولیات اور معاصی میں ضائع نہیں ہوتی، اور دوسروں کے جو کام لاکھوں میں نہیں ہوتے وہ اس کے ہزاروں میں ہو جاتے ہیں، اور متعین ومحدود عمر میں بھی وہ شخص ایسے نمایاں اور نفع بخش کام انجام دیتا ہے کہ جن کے لیے طویل اور لمبی عمر نا کافی ہوتی ہے، یہ سب صلہ رحمی کی برکت ہے۔

اس کے برعکس جب کوئی شخص قطع رحمی کرتا ہے تو اس سے خاندانی جھگڑے اور خانگی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے انسان دلی پریشانی اور ایک اندورنی کڑھن وگھٹن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ قطع رحمی کا گناہ اتنا خطرناک ہے کہ قطع رحمی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معافی، مغفرت اور جنت سے محروم ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے: ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ“ (متفق علیہ، مشکوۃ/ص:۴۱۹) اس گناہ کی گندگی کے ساتھ کوئی جنت میں نہیں جا سکے گا کہ قطع رحمی راہِ جنت میں رکاوٹ کا سبب ہے، لہٰذا شرعاً وعقلاً ہر اعتبار سے ضروری ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی یعنی اچھا سلوک کیا جائے اور قطع رحمی سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے۔

صلہ رحمی کرنے اور قطع رحمی سے بچنے کے دو بہترین نسخے:

اس کے لیے دو چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، ایک یہ کہ جن رشتہ داروں کے جو حقوق ہیں سب سے پہلے ان کی طرف توجہ دی جائے اور ان کو ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ حق تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (بنی إسرا ئیل : ٢٦) یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ جب تمام رشتہ دار ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے تو اس سے ہر ایک دوسرے سے خوش ہوگا اور کسی کو کسی سے شکایت کا موقع نہ ملے گا، اور اس طرح پورے خاندان؛ بلکہ پورے سماج میں محبت کی ایک خوش گوار فضا قائم ہو کر دنیا کی یہ عارضی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے گی، اسی لیے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا کہ ”فَاِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِيْ الْاَ هْلِ.“ (مشکوٰۃ : ٤٢٠) صلہ رحمی کا ایک دنیوی فائدہ یہ ہوگا کہ اس

سے اہل وعیال اور اعزہ واقارب اور خاندان میں محبت کی خوش گوار فضا قائم ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس خاندان اور سماج میں صلہ رحمی کا رواج نہیں اس خاندان، سماج اور سوسائٹی کے افراد زندگی کے حقیقی لطف ومحبت سے محروم ہوتے ہیں، چنانچہ مغربی ویورپی ممالک میں خاندان کی تباہی کا یہی بنیادی راز ہے کہ وہاں تقریباً صلہ رحمی کا رواج ہی نہیں ہے۔

اِس سلسلہ کا ایک عبرتناک واقعہ ہے کہ پولینڈ میں ایک بوڑھا اپنی بیٹی کے گھر آیا اور اس سے وہاں رہنے کی خواہش ظاہر کی، تو بیٹی نے صاف انکار کر دیا، جب باپ نے اصرار کیا اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا، تو بیٹی نے ڈنڈے سے مار کر اپنے باپ کو گھر سے نکال دیا، اس ہماہمی میں جب شور ہوا؛ تو کچھ لوگ جمع ہو گئے، صورتِ حال دیکھ کر نوجوان لڑکی سے پوچھا، تو اس نے کہا کہ کچھ عرصہ قبل مجھے پیسے کی بہت سخت ضرورت تھی، اپنے اس باپ کے سامنے جب میں نے تقاضا کیا تو اس نے باقاعدہ شرح سود طے کر کے مجھے رقم دی، اور پھر اصل رقم کے ساتھ میرے باپ نے مجھ سے پوری رقم سود کے ساتھ وصول کی، اس کے اس رویّہ کے بعد اب میں اسے اپنے گھر میں کیوں ٹھہراتی؟ (ماخوذ از: ”کتابوں کی درسگاہ میں“)

سچ ہے: اللہ رحم کرتا نہیں اس بشر پر ☆ نہ ہو درد محبت کی چوٹ جس کے جگر پر

عام طور پر ہر قطع رحمی اور رشتہ داروں کی باہم ناراضگی کی جو وجوہات ہیں ان میں بنیادی وجہ ان کے حقوق ادا نہ کرنا ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے قطع رحمی سے بچنے کے جو بہترین نسخے بیان فرمائے اُن میں سے پہلا نسخہ یہ ہے: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (بنی إسرا ئیل : ٢٦) رشتہ داروں کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں انہیں ادا کرنے کا اہتمام کرو۔

اس کے بعد دوسرا نسخہ ہے حسنِ سلوک کا، یعنی اپنی وسعت کے مطابق مالی یا جسمانی خدمت اور نصرت کے ذریعہ ان کے ساتھ سلوک کیا جائے، یہ چیز بھی رشتہ داری کو مضبوط کرتی ہے، پھر یہ صلہ رحمی کا تقاضا ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى﴾ (البقرۃ:۱۷۷) یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنا مال

رشتہ داروں پر خرچ کرے۔ (اگر وہ حاجت مند ہوں) اس سے معلوم ہوا کہ اقارب (رشتہ دار) اجانب (غیر رشتہ دار) پر مقدم ہیں، اِسی لیے کہتے ہیں کہ ”اوّل خویش، بعدہٗ درویش“۔

مگر افسوس کہ

غریب سے قریب کا رشتہ بھی چھپاتے ہیں لوگ
امیر سے دور کا رشتہ بھی نبھاتے ہیں لوگ

مفسرِ قرآن علامہ عبد الماجد دریا بادیؒ آیتِ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں کہ ”مصارفِ خیر کی اسلام نے یہ کتنی حکیمانہ اور مناسب ترتیب قرار دی ہے، آیت کے اس جز میں امت کا پورا نظامِ معاش ایک خلاصہ کی شکل میں آ گیا ہے کہ مالی اعانت سب سے پہلے اپنے عزیزوں، قریبوں کی کرنی چاہیے، یہ نہ ہو کہ بھائی کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہوں اور بہن جھونپڑی کو ترس رہی ہے، چچا کے پاس موٹریں ہوں اور بھتیجے کے پاس یکہ (یعنی گھوڑے کی رتھ نما گاڑی اور معمولی سائیکل) کے پیسے بھی نہ ہوں، ہر مالدار کو خبر گیری سب سے پہلے اپنے نادار عزیزوں، کنبہ والوں، بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے قریبوں کی کرنی چاہیے، اس کے بعد نمبر بستی اور شہر کے ان یتیم بچوں اور بچیوں کا آتا ہے جن کا والی، وارث اور سرپرست باقی نہیں رہا ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ امت کے عام مفلسوں، محتاجوں اور پھر ان مسافروں اور راہ گیروں کا آتا ہے جو زادِ راہ سے محروم ہیں، اور اس لیے اپنے ضروری سفر سے محروم رہ جاتے ہیں، یا بستی میں کہیں باہر سے وارد ہوئے ہیں اور کوئی ان کے ٹھہرانے اور کھلانے پلانے کا روادار نہیں ہو رہا ہے، اور پھر آخر میں اہلِ حاجت سوالی رہ جاتے ہیں۔ اس پورے معاشی پروگرام پر اگر قاعدہ سے عمل ہونے لگے تو امت میں کہیں مفلسی و تنگدستی سے معاشی بے روزگاری کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ (تفسیر ماجدی: ۱/ ۳۰۶)

صلہ رحمی کا اجر وثواب:

غرض آیتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ (اہلِ حاجت) رشتہ داروں کا حق دوسروں

پر مقدم ہے، اور حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کی مدد کرنا افضل ہے اور اس کا اجر بھی زیادہ ہے۔ ایک حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الصَّدَقَةُ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ.“ (رواه أحمد والترمذی والنسائی وابن ماجه والدارمی، مشکوٰۃ/ص: ۱۷۱/باب أفضل الصدقة)

مطلب یہ ہے کہ ایک صدقہ وہ ہے جو کسی عام مسکین اور غریب کو دیا جائے، دوسرا صدقہ وہ ہے جو کسی ضرورت مند اور مستحق رشتہ دار کو دیا جائے، تو جو صدقہ رشتہ دار کو دیا ہے اس میں ثواب دوگنا ہے، ایک صدقہ کا، دوسرا صلہ رحمی کا، لہٰذا یہ سوچ ہی غلط ہے کہ صدقہ سے تو ثواب ملتا ہے؛ مگر رشتہ دار کو دینے سے ثواب نہیں ملتا، بلکہ رشتہ داروں کو دینے کا اجر وثواب دوسروں کو دینے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، حتیٰ کہ روایاتِ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کا اجر وثواب کسی غلام کو آزاد کرنے سے بھی زیادہ ہے، جب کہ غلام آزاد کرنے کی فضیلت یہ ہے کہ جو شخص کسی غلام (اور قیدی) کو آزاد کرائے تو اس کے ہر ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کا ہر عضو قیامت کے دن آزاد کیا جائے گا۔

مگر صلہ رحمی کا اجر وثواب غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باندی کو آزاد کیا، جب اس کا علم حضور ﷺ کو ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”لَوْ أَعْطَيْتِهَا أَخْوَالَكِ، كَانَ أَعْظَمَ لِأَجْرِكِ.“ (متفق علیه، مشکوٰۃ/ ص: ۱۷۱ باب أفضل الصدقة)

اگر تم اپنے ننہالی (غریب مستحق) رشتہ داروں کو دے دیتیں تو اس صلہ رحمی کا ثواب (غلام آزاد کرنے سے) زیادہ ملتا۔

اس لیے مستحق رشتہ داروں کو ہرگز محروم نہ کیا جائے؛ بلکہ حسب استطاعت ان پر

صرف کیا جائے، خواہ وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں یا نہ کریں، یہی صلہ رحمی کا اعلیٰ درجہ ہے۔

صلہ رحمی کے درجات اور ان کے فضائل:

ویسے کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارے علماء نے مجموعی طور پر ہر صلہ رحمی کے دو درجات بیان فرمائے ہیں: (۱) اعلیٰ۔ (۲) ادنیٰ۔ صلہ رحمی کا اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ جو رشتہ دار تمہارے ساتھ قطع رحمی کرے، اس سے بھی صلہ رحمی کی جائے اور اصل صلہ رحمی بھی یہی ہے، حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي، وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِي إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ، وَصَلَهَا."

(بخاری، مشکوٰۃ/ص:۴۱۹)

صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو بدلہ کے طور پر صلہ رحمی کرتا ہو، اصل تو صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کیا جائے، تب بھی وہ صلہ رحمی کا معاملہ کرے، قرآن کریم کے بقول یہ اہل فضل وکمال کی خصلت ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ لَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ أَنْ يُّؤْتُوْا أُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (النور:۲۲)

ترجمہ: اور تم میں سے جو اہل فضل وکمال ہیں، انہیں اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور مہاجر فی سبیل اللہ کو نہ دینے کی قسم نہ کھانی چاہیے؛ بلکہ معاف کر دینا چاہیے، درگذر کر دینا چاہیے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ جل شانہٗ تمہارا قصور معاف کر دے، اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ معاف کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی تھی، آپ کے

ایک خالہ زاد بھائی حضرت مسطح رضی اللہ عنہ فقراءِ مہاجرین میں ہونے کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زیر کفالت تھے، مگر واقعۂ اِفک میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی مبتلا ہوگئے؛ جس کا سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ اور غصہ تھا، اس لیے نزولِ برأت کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ مسطح کے ساتھ کسی طرح کا کوئی سلوک نہیں کریں گے، کیوں کہ یہ بات صلہ رحمی کے اعلیٰ درجہ کے خلاف اور خود آپ رضی اللہ عنہ کے مقامِ صدیقیت کے بھی شایانِ شان نہ تھی، اس لیے حق تعالیٰ کو پسند نہ آئی۔ اُس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی؛ جس میں حق تعالیٰ نے بڑے پیارے انداز میں گویا صلہ رحمی کے اعلیٰ درجہ کی طرف متوجہ فرمایا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

تو برائے وصل کردن آمدی ☆ نے برائے فصل کردن آمدی

حق تعالیٰ کا اندازِ بیاں اتنا مؤثر تھا کہ اسے سنتے ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بے ساختہ پکار اُٹھے: ''کیوں نہیں اے ربِ کریم! ہم ضرور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف کردیں۔'' اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم کا کفارہ (دس مسکینوں کو کھلانا، یا کپڑا پہنانا یا تین روزہ رکھنا) ادا کر کے حسبِ سابق حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی کفالت اور سرپرستی شروع فرمادی۔ (ابن کثیر)

قطع رحمی کا جواب صلہ رحمی سے دینے کا نتیجہ:

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ جب جواب کے طور پر قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے گا تو اس سے مسئلہ حل نہ ہوگا؛ بلکہ خاندان اور سماج میں برائی وبگاڑ مزید بڑھنے کا سبب بنے گا، جب ہم بھی اپنی راہوں میں کانٹے بچھانے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھائیں گے تو ساری دنیا خار دار ہو جائے گی، لیکن اگر ہم کانٹوں کا جواب پھول سے دیں گے اور قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ بھی صلہ رحمی کریں گے جو کہ اعلیٰ درجہ ہے، تو فضل الٰہی اور فطرتِ انسانی سے قوی امید ہے کہ دیر سویر ان کی اصلاح ہوگی اور معاشرہ میں صلہ رحمی

کوفروغ ہوگا۔

لیکن اگر- العیاذ باللہ العظیم- قرآن وحدیث میں بیان کردہ صلہ رحمی کے اس اعلیٰ درجہ کی مقدس تعلیم وترغیب پرعمل کرنے کا حوصلہ وجذبہ ابھی تک پیدا نہیں ہوا تو کم ازکم صلہ رحمی کے ادنیٰ درجہ پر ضرور عمل کیا جائے اور صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کبھی کسی وجہ سے دنیوی معاملہ میں کوئی رنجش پیش آجائے، تو خود اپنی طرف سے بات چیت بند نہ کریں، اگر چہ ہم بے قصور ہوں؛ پھر بھی رضائے الٰہی کے خاطر بات چیت جاری رکھیں، خواہ سلام ہی سے ہو، یہ صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے، ممکن ہے کہ اس پرعمل کرنے سے نفس پر بوجھ پڑے؛ مگر اپنے نفس کو سمجھا کر اور قطع رحمی کی وعید سے ڈرا کر جب ہم سلام میں پہل کریں گے، تو ان شاء اللہ اس سے دارین کی عزتیں ونعمتیں نصیب ہوں گی۔ کہتے ہیں نا کہ!

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

حدیثِ پاک میں ہے، سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتے دار ہیں، جن کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ میں تو ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہوں؛ مگر وہ قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہوں؛ جب کہ وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں، لیکن وہ جہالت برتتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا اے اللہ کے رسول! کہ کیا کیا جائے؟ اس موقع پر رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَادُمْتَ عَلٰى ذَالِكَ.“ (رواہ مسلم، مشکوۃ/ص: ۴۱۹)

اگر بات وہی ہے جو تم کہتے ہو، تو گویا تم ان کو گرم راکھ پھنکاتے ہو، مطلب یہ ہے کہ جب وہ تمہارے ادائے حقوق اور حسنِ سلوک کی قدر نہیں کرتے، تو ان کا یہ معاملہ قیامت

کے دِن ان کا منہ کالا کردے گا، جیسا کہ گرم راکھ کسی کے چہرہ کو جلا کر سیاہ کردیتی ہے۔ (مظاہر حق جدید ج: ۵/ص: ۵۱۰) اور جب تک تمہاری یہ حالت رہے گی اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی، جس سے تم ان اقارب جو عقارب (بچھو) کے مانند تمہیں ایذا پہچانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی ایذا سے محفوظ ومامون رہوگے۔

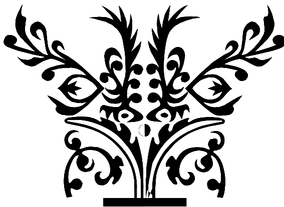
بہر حال! صلہ رحمی انسانی فطرت کا تقاضا اور شریعت کی تعلیم ہے، اس پر عمل کرنے سے دارین کا نفع ہے اور قطع رحمی سے دارین کا نقصان ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں صلہ رحمی کی توفیق عطا فرمائے اور قطع رحمی سے بچائے۔ آمین۔

(۶/محرم الحرام/قبل الجمعہ/ ۱۴۳۳ھ/ ڈسمبر ۲۰۱۱ء (بزم صدیقی))

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۲۴)

حسن ظن کی اہمیت
اورسوءِ ظن کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "حُسۡنُ الظَّنِّ مِنۡ حُسۡنِ الۡعِبَادَةِ." (رواه أحمد وأبوداوٗد، مشكوٰة/ص:٤٢٩/ باب ماينهى عنه من المهاجرة والتقاطع واتباع العورات/ الفصل الثانى)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ’’حسن ظن حسن عبادت (بہترین عبادت) سے ہے۔‘‘

غلطیوں سے جدا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں — دونوں انسان ہیں، خدا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں
تو مجھے اور میں تجھے الزام دیتے ہیں، مگر — اپنے اندر جھانکتا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں
غلط فہمیوں نے کر دیں دونوں میں دوریاں — ورنہ فطرت کا برا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں

(علامہ اقبالؒ)

حسنِ ظن بہترین عبادت ہے:

کسی بات یا خبر کے واقع ہونے اور نہ ہونے یا اس کے سچ اور جھوٹ ہونے کے بارے میں تین صورتیں پیش آتی ہیں، ایک صورت یہ کہ اس بات یا خبر کے سچ ہونے اور اس کے خلاف ہونے یعنی جھوٹ ہونے کا دل میں پورا اعتماد اور اطمینان ہو۔ اس صورت کو عرف واصطلاح میں یقین کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بات یا خبر کے سچ اور جھوٹ ہونے کے بارے میں برابر اور مساوی درجہ کا دل میں رجحان ہو، اسے شک کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک پہلو کا دل میں غالب گمان ہو، اور دوسرے کا کسی قدر احتمال اور خیال ہو، تو جس بات یا خبر کے واقع اور سچ ہونے کا غالب گمان ہو اسے ’’ظن‘‘ اور اس کے مقابلہ میں معمولی درجہ کے احتمال وخیال کو وہم کہتے ہیں۔ (مستفاد از: قاموس الفقہ ۵/ ۳۲۵)

ظاہر ہے کہ یہ ’’ظن‘‘ یعنی گمان کبھی اچھا ہوتا ہے تو کبھی برا، کبھی محمود ہوتا ہے تو کبھی مذموم، حسن ظن آدمی کو آدمی سے جوڑتا ہے اور معاشرہ پر اچھے اثرات ڈالتا ہے، جب کہ سوءِ ظن سے انتشار اور معاشرہ میں منفی اثرات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے شریعت مطہرہ کی مقدس تعلیم یہ ہے کہ بلا کسی وجہ کسی کے ساتھ بھی بدگمانی نہ کرے اور ہر ایک کے ساتھ حسن ظن کا معاملہ کرے؛ کیوں کہ جن اعمال کو عبادات کہا جاتا ہے ان میں سے ایک بہترین اور آسان ترین عبادت حسنِ ظن بھی ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں فرمایا گیا ہے: ”حُسۡنُ الظَّنِّ مِنۡ حُسۡنِ الۡعِبَادَةِ“. پھر یہ حسن ظن ایک ایسی قلبی عبادت ہے کہ اس میں بندہ کو کسی طرح کی محنت ومشقت ہوتی ہے، نہ کسی دلیل کی ضرورت، بلکہ مفت میں ثواب ملتا ہے، نیز یہ کسی بھی انسان کے نیک خصلت ہونے کی بڑی علامت بھی ہے۔

سوءِ ظن گناہ کبیرہ ہے:

جب کہ بلا کسی قوی دلیل اور تحقیق کے کسی کے ساتھ بدگمانی کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ

ہے؛ جس پر قیامت کے دن مؤاخذہ ہوگا، یہ سوءِ ظن ایک قسم کا جھوٹ اور وہم ہے، جو شخص اس برائی اور دل کی روحانی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جس کسی سے بھی اس کا ذرا سا اختلاف اور اَن بَن ہو جائے، پھر یہ اس کے ہر کام کو بری نظر اور بدنیتی سے دیکھتا ہے، رفتہ رفتہ اسی وہم اور بدگمانی کے نتیجہ میں وہ اس کی طرف بہت سی اَن ہونی اور ناکردہ باتیں منسوب کرکے رائی کو پہاڑ بنانے کی کوشش کرتا ہے، جس کا اثر ظاہری برتاؤ پر بھی پڑتا ہے، اور بہت سی ظاہری و باطنی خرابیاں وجود میں آتی ہیں، اس لیے قرآن وحدیث میں اس کی ممانعت و مذمت وارد ہوئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" (الحجرات:۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو، اس لیے کہ بعض گمان (غلط اور) گناہ ہوتے ہیں۔

ظن کی چار قسمیں اور ان کی تفصیلات:

اس سے معلوم ہوا کہ ظن کی مختلف قسمیں ہیں، اور ان میں سے بعض حرام اور گناہ ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں، مذکورہ بالا آیت کریمہ کے تحت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے فرمایا کہ "ظن" کی چار قسمیں ہیں: ایک: حرام اور گناہ، دوسری: مامور بہ اور واجب، تیسری: مستحب اور مندوب، چوتھی: مباح اور جائز۔ ظن حرام تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے، مثلاً یہ کہ وہ مجھے عذاب ہی دے گا، یا مصیبت ہی میں رکھے گا، یاد رکھو! اللہ جل شانہ کے ساتھ اس طرح کا گمان رکھنا حرام ہے، اور حسنِ ظن رکھنا فرض ہے، لیکن حسنِ ظن کا مطلب یہ نہیں کہ بغیر ایمان و اعمال کے اس کی رحمت اور مغفرت کی آس لگائے بیٹھا رہے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ و عباداتِ حسنہ اور احکامِ شرعیہ کی ادائیگی یا سچی پکی توبہ کے بعد اللہ پاک سے قبولیت اور اس کی رحمت و مغفرت کا گمان رکھے، یہ حسن ظن فرض ہے، اور اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ سے بدگمانی حرام ہے، نیز اس کے بندوں

میں جس کسی میں خیر کے آثار غالب اور ظاہر ہوں ان کے متعلق بلا کسی قوی دلیل اور تحقیق کے بدگمانی کرکے یقین کر لینا سوءِ ظن کہلاتا ہے، جو حرام ہے، جس کی طرف اشارہ آیت کریمہ: ﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ میں فرمایا گیا۔ اور حدیثِ پاک میں وارد ہے:

"عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ." (مشكوٰة المصابيح: ٤٢٧، بحواله بخاری)

علماء محدثین فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں "إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ" سے سوءِ ظن مراد ہے، عموماً اختلافات اور جھگڑے بھی اسی بدگمانی کے نتیجہ میں ہوتے ہیں، اس لیے حدیث میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اِحْتَرِسُوْا مِنَ النَّاسِ بِسُوْءِ الظَّنِّ."

(الكامل لابن عدی، والمعجم الأوسط للطبرانی، بحوالهٔ مرقاةالمفاتيح/ ج:٩ / ص:٢٤٩)

لوگوں کے بارے میں بدگمانی سے پرہیز کرو، اس سے بہت سا فساد اور بعض اوقات زبردست فتنہ برپا ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں محمد بن جریر بن یزید طبری کی مثال بہت واضح ہے، جو ایک ممتاز عالم اور مفسر گذرے ہیں، اتفاق سے ان ہی کے دور میں ایران میں اس نام کے ایک اور شیعہ عالم بھی تھے، بدقسمتی سے نام کے اشتراک کے سبب لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ امام طبریؒ بھی شیعہ ہیں، اور ان ہی کے نظریات کے حامل ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ جب بغداد میں ان کا انتقال ہوا تو اس زمانہ کے (بعض) حنبلی علماء نے آپؒ کو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی مخالفت کی۔ مجبوراً آپؒ کو اپنے ہی مکان کے ایک حصہ میں دفن کرنا پڑا۔ (دعوتِ دین/ص:۵)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

بگذر از ظنِ خطا اے بدگماں! "إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ" را بخواں

اے بدگمان! سوءِ ظن سے باز آجا، بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں، اس کو بھی پڑھ (اور

سمجھ لے) حضرت امام ربانی محبوبِ سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے تھے کہ لوگوں کے ساتھ تو حسن ظن کا معاملہ رکھو، مگر اپنے نفس کے ساتھ سوءِ ظن رکھو، کیوں کہ ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾

بہر کیف! حق تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا فرض اور سوءِ ظن حرام ہے۔ نیز بلا کسی قوی دلیل کے کسی مومن کے ساتھ بدگمانی کرنا بھی حرام ہے۔ اور ظنِ واجب یہ ہے کہ جو احکام ایسے ہیں کہ ان کی کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے، لیکن اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں، جیسے باہمی منازعات ومقدمات میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کرنا، اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا، اسی طرح جہاں سمتِ قبلہ معلوم نہیں، اور کسی سے معلوم کرنا ممکن نہ ہو وہاں اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا مامور بہ اور واجب ہے۔ اور ظنِ مباح وجائز یہ ہے کہ مثلاً نماز کی رکعتوں میں شک ہو جائے کہ تین پڑھیں یا چار، ایسی صورت میں اپنے ظنِ غالب پر عمل کرنا مباح اور جائز ہے۔ (البتہ اگر وہ ظنِ غالب کو چھوڑ کر امرِ یقینی پر عمل کرے۔ یعنی تین رکعت قرار دے کر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے)۔ اور ظن مستحب ومندوب یہ ہے کہ بلا کسی فاسد غرض کے ہر کلمہ گو مسلمان کے ساتھ حسنِ ظن رکھے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ "إِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءَ الظَّنِّ" یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر ایک سے بدگمانی رکھے، تو اس کا تعلق معاملات سے ہے، مطلب یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے بلا تحقیق کسی پر مکمل اعتماد واطمینان کر کے کوئی معاملہ نہ کرے، یہ مطلب نہیں کہ ہر کسی کے ساتھ دین وعمل کے بارے میں بدگمانی کرے، یہ ممنوع ہے۔

بہر حال حکم یہی ہے کہ "ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا" مطلب یہ ہے کہ مومن کے ساتھ حسنِ ظن رکھو۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی کے اچھا ہونے کے لیے اتنا بھی کافی ہے کہ اس کی اچھائیاں برائیوں سے زیادہ ہوں، لہٰذا جہاں تک ہو سکے ہر ایک میں نیکی اور اچھائی تلاش کرے، اور ہر ایک کے قول وعمل کی اچھی تاویل کرنے کی کوشش

کرے، ان شاء اللہ اس سے بہت سے جھگڑوں اور فتنوں کا سدِ باب ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ کا حسن ظن:

اس سلسلہ میں امامنا العلام الاعظم ابوحنیفہ النعمانؒ کا ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ اُس شخص کے ایمان کے متعلق آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ (۱) جو بن دیکھے گواہی دیتا ہے۔ (۲) یہود ونصاریٰ کی تصدیق کرتا ہے۔ (۳) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھاگتا ہے۔ (۴) مردار کھاتا ہے۔ (۵) اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی طرف بلایا اس کی پرواہ نہیں کرتا اور جس سے ڈرایا اس سے ڈرتا نہیں۔ (۶) اور فتنے سے محبت رکھتا ہے۔ حضرتؒ نے جواب میں فرمایا: ''وہ شخص مومن ہے۔'' سائل کو بڑا تعجب ہوا، پوچھا: ''وہ کیسے؟'' فرمایا کہ ''دیکھو! بن دیکھے گواہی دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ مومن شخص اپنے رب کو، اس کے فرشتوں کو، جنت وجہنم کو دیکھتا نہیں؛ مگر بن دیکھے گواہی دیتا ہے۔ یہود ونصاریٰ کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں وارد ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ (البقرۃ:۱۱۳)

ظاہر ہے کہ قرآن میں یہود ونصاریٰ کا یہ قول ہے، مومن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے دور بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بارش سے بھاگتا ہے، کیوں کہ بارش بھی تو اللہ کی رحمت ہے، لیکن بندہ اس سے بھاگتا ہے کہ کہیں کپڑے بھیگ نہ جائیں۔ اور مردار کھانے کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مچھلی کھاتا ہے جو مردار ہوتی ہے، مگر ہر شخص بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ جہاں تک پانچویں سوال کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی طرف بلایا وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا اور جس سے ڈرایا وہ اس سے ڈرتا نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جنت کی طرف بلاتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا إِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (یونس: ۲۵) مگر اس اللہ کے بندے میں رضائے الٰہی کی اتنی طلب ہے کہ اُسے جنت کی بھی پرواہ نہیں، اسے جنت اس لیے مطلوب نہیں کہ وہاں نعمتیں، راحتیں اور لذتیں ہیں؛ بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہاں

اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔اور یہی حال جہنم کے بارے میں ہے، اُسے اصل ڈر جہنم کا نہیں، خالق جہنم اوراس کے غضب وغصہ کا ہے۔ رہی بات فتنہ سے محبت کی، تو قرآن نے مال واولاد کوفتنہ کہا:﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (التغابن: ۱۵) حالانکہ مال واولاد کی محبت بھی فطری چیز ہے، اس لیے ہر کوئی اس سے محبت کرتا ہے، اس میں اس بے چارے کا کیا قصور! لہٰذا وہ شخص مومن ہے۔(از:''اسلاف کے حیرت انگیز واقعات''ص:۲۶)

نیک نے تو نیک جانا، بد نے بد جانا مجھے
ہر کسی نے اپنے پیمانہ سے پہچانا مجھے

حسن ظن قائم کرنے کا طریقہ:

الغرض اس سلسلہ میں اسلامی ہدایات وتعلیمات یہ ہیں کہ اولاً تو اپنے آپ کو اُن باتوں سے بچائے جن سے کسی کو بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے، دوسرے یہ کہ آپس میں حسنِ ظن کی خوش گوار فضا قائم کرنے کی کوشش کرے، جس کا ایک آسان اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم جب اپنے سے کسی بڑی عمر والے کو دیکھیں تو اس کی تعظیم کریں، اس خیال سے کہ یہ ہم سے سابق بالإیمان والاعمال ہے، کیوں کہ اس کی عمر ہم سے زیادہ ہے، لہٰذا عمل میں بھی ہم سے زیادہ ہی ہوگا، اور جب کسی کم عمر والے کو دیکھیں تو اس کے ساتھ اس طرح حسنِ ظن کا معاملہ کریں کہ وہ عمر میں ہم سے کم ہے، اس لیے اس کے گناہ بھی کم ہیں، اور ہم دنیا میں اس سے پہلے آئے، اس لیے ہم نے گناہ اس سے زیادہ کیے، اس طرح اپنے سے ہر چھوٹے بڑے سے حسنِ ظن پیدا کیا جاسکتا ہے۔

صاحبو! حق تعالیٰ کے یہاں قیامت کے دن سوءِ ظن پر تو مؤاخذہ اور پکڑ ہوگی، حسنِ ظن پر نہیں، لہٰذا سمجھداری کی بات یہی ہے کہ ہر ایک سے حسنِ ظن رکھیں، اور خواہ مخواہ کسی سے بدگمانی نہ کریں، نہ کسی کی ٹوہ میں لگیں، حتیٰ کہ اگر کوئی ہم سے کسی کے بارے میں تحقیق کرے، تو بدگمانی سے بچنے کے لیے عمومی حالات میں یہ کہہ دیں کہ ''ہم اس کے ظاہر کو اچھا

جانتے ہیں، اس کے باطن کا علم ہمیں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔'' اس طرح ہر ایک سے حسن ظن رکھیں، خصوصاً اہل اللہ اور علماء کے متعلق بدگمانی ہرگز نہ کریں۔ حضرت محی السنۃ مولانا ابرارالحق صاحبؒ فرماتے تھے کہ سورج میں بہت روشنی ہوتی ہے، مگر جب بادل آجاتا ہے تو اس کا فیض کم ہو جاتا ہے، اسی طرح اہل اللہ کے فیوض میں تو کوئی شک نہیں، مگر بدگمانی کے بادل جب چھاجاتے ہیں تو ان کے فیض سے آدمی محروم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ان کی لغزشوں کی بات ہے تو حضراتِ صوفیاء کا قول ہے کہ "زَلَّاتُ الْمُقَرَّبِينَ رِفْعَةٌ لِمَقَامِهِمْ" (مقربین کی لغزش ان کے رفع کے لیے ہوتی ہے۔) یعنی جب ان سے کوئی لغزش ہوتی ہے، تو وہ بے حد ندامت کے ساتھ توبہ کا اہتمام کرکے بلند درجات حاصل کرلیتے ہیں۔

بدگمانی کا علاج:

اس لیے جب کسی سے کوئی بات صادر ہو جائے یا بے اختیار دِل میں کوئی بدگمانی آجائے، تو اس پر یقین نہ کریں۔ اس کی تصدیق کرکے خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے تکذیب کریں یا تاویل کریں، اور اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے لیے ذکر اللہ کا التزام کریں، البتہ اگر کسی کا فسق وفجور بہت مشہور ہو جائے، یا پورے یقین اور پختہ ثبوتوں کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ وہ حسنِ ظن کا مستحق نہیں، تو اس صورت میں بھی وہی رائے قائم کی جائے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ مبالغہ کی گنجائش اس وقت بھی نہیں؛ بلکہ ایسی صورت میں اس کی اور اپنی اصلاح کی فکر کریں اور بدگمانی کی چنگاری شعلہ بن کر فساد برپا کرے اس سے پہلے بدگمانی کا علاج کریں۔

حضرت تھانویؒ سے کسی نے بدگمانی کا علاج دریافت کیا، تو فرمایا: ''جب کسی کے بارے میں برا گمان دل میں آئے تو اولاً خلوت میں بیٹھ کر یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے بدگمانی سے منع فرمایا ہے، تو یہ گناہ ہوا، اور گناہ سے عذاب کا اندیشہ ہے، تو اپنا نفس اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کرے گا؟ یہ سوچ کر توبہ کرے اور دعا کرے کہ اے اللہ! میرے دل کو

پاک صاف کردے، پھر جس پر بدگمانی ہو اس کے حق میں دعاءِ خیر کرے کہ یا اللہ! اس کو دونوں جہاں کی نعمتیں عطا فرما۔ دن رات میں کم از کم ایک مرتبہ ایسا کرے، اگر پھر بھی اثر نہ ہو تو دوسرے تیسرے دن بھی ایسا ہی کرے، اگر اس سے بھی اثر نہ ہو تو پھر اس شخص سے مل کر کہے کہ بھائی! مجھ کو تم سے بدگمانی ہوگئی، لہٰذا معاف کردیجئے، اور میرے حق میں اس مرض کے دور ہونے کی دعا کیجئے! (کمالاتِ اشرفیہ: ۲۶۷۲) ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے بدگمانی ختم ہو جائے گی۔

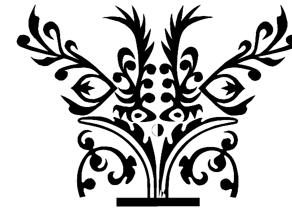
حق تعالیٰ ہمیں حسنِ ظن کی نعمت سے مالا مال فرما کر سوءِ ظن سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۲۰/محرم الحرام/۱۴۳۶ھ

مطابق: ۱۱/دسمبر/۲۰۱۵ء/شبِ جمعہ

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۲۴)

اخلاقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ لِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْأَفْعَالِ" (رواه فی شرح السنة، مشکوٰة/ص: ٥١٤/ باب فضائل سید المرسلین ﷺ/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جناب رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ حق تعالیٰ نے مجھے اخلاقِ عالیہ کی تتمیم اور افعالِ حسنہ کی تکمیل کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔''

حضور ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد:

اللہ جل جلالہٗ نے جیسے اس عالمِ اسباب میں انسانی زندگی کی بقا اور تحفظ کے لیے اسباب کا انتظام کرنے کے بعد انہیں اختیار کرنے کا حکم فرمایا، ایسے ہی انسانیت کی بقا و تحفظ کے لیے ایمان کے ساتھ عمدہ اخلاق یعنی تمام برائیوں سے اجتناب اور اچھی صفات سے متصف ہونے کا بھی حکم فرمایا۔ اس لیے کہ ایمان و اخلاق سے انسان حیوانِ ناطق سے انسانِ کامل بن جاتا ہے، اور اس کے بغیر انسان سے انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ حیوان سے

بدتر بن جاتا ہے، پھر ایسے انسان سے انسانیت کو اتنا نقصان پہنچتا ہے جتنا جنگل کے درندوں سے بھی نہیں پہنچتا، جس کا تجربہ دنیا کو جاہلیت قدیمہ میں بھی ہو چکا اور آج جاہلیتِ جدیدہ میں بھی ہو رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے انسانیت پر رحم فرما کر اس کی بقا و تحفظ کے لیے ایمان و اخلاق سے متصف ہونے کا صرف حکم ہی نہیں دیا؛ بلکہ اس کا بہترین انتظام بھی فرمایا، اس طرح کہ اپنے آخری رسول سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذات میں تمام اخلاقی خوبیوں اور اچھی صفتوں کو جمع فرمایا، جس کو قرآنِ پاک نے یوں بیان کیا:

﴿ وَ إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم : ٤)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معلمِ اخلاق بنا کر مبعوث فرمایا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا، مثلاً فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ (البقرہ: ١٤٩، آل عمران: ١٦٤) اور اسی کو مذکور حدیث میں اس طرح فرمایا:

”إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي لِتَمَامِ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَكَمَالِ مَحَاسِنِ الْأَفْعَالِ“

حق تعالیٰ نے مجھے اخلاقِ عالیہ کی تتمیم اور افعالِ حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے۔

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد اخلاق کی اصلاح اور انسانیت کو اس کی تعلیم دینا ہے، دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ بعثت کے بعد ساری زندگی آپ ﷺ نے اسی کی تعلیم اور تبلیغ میں صرف فرمائی۔ اور احادیثِ مبارکہ میں اس کی بے شمار مثالیں بھی موجود ہیں جیسے ابوسفیان سے جب قیصرِ روم ہرقل نے دربارِ شاہی میں آپ ﷺ کے متعلق پوچھا، تو باوجودیکہ ابھی وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے؛ مگر انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ ایمان کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ سچ بولیں، پاکدامنی اختیار کریں، رشتہ داری کا خیال رکھیں، وغیرہ۔ (صحیح بخاری/ ج:۱/ص:۵/مشکوٰۃ:۵۲۶)

اسی طرح آپ ﷺ کے نبوت سے سرفراز ہونے کے دو چار دِن بعد جس وقت حضرت ابوذر غفاریؓ کو آپ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی، تو انہوں نے اپنے بڑے بھائی

انیس کو آپ ﷺ کے حالات کی تحقیق وتفتیش کے لیے مکہ بھیجا، بھائی نے واپس آ کر جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے:

”رَأَيْتُ رَجُلًا يَأْمُرُ بِالْخَيْرِ، وَيَنْهٰى عَنِ الشَّرِّ، رَأَيْتُهٗ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ.“ (مسلم/ ج: ٢/ص:٣٤٩/ باب مناقب أبي ذرؓ)

میں نے انہیں لوگوں کو خیر اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہوئے دیکھا، اور اسی کے ساتھ عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے پایا، آپ ﷺ کی ایمانی واخلاقی تعلیم سے متاثر ہو کر دونوں بھائی بعد میں حاضرِ خدمت ہوئے اور مشرف باسلام ہو گئے۔

اخلاق کی قسمیں:

پھر آپ ﷺ نے بعثت کے مقصد کے مطابق ساری انسانیت کو صرف اخلاقِ عالیہ کی تعلیم ہی نہیں دی؛ بلکہ ان تعلیمات اور ہدایات کے مطابق عمل کر کے بھی دکھایا، اور یہی آپ ﷺ کی دعوتی کامیابی کا اصل راز تھا، کیوں کہ اکثر ناکامیوں کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کے قول وعمل میں تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے، بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ واعظ و داعی گفتگو تو بہت اونچی اور عمدہ کرتا ہے؛ مگر عمل میں نہایت گھٹیا اور بہت نیچی سطح پر ہوتا ہے، جس کے سبب اس کی وعظ ونصیحت اور دعوت عموماً بے اثر ہو جاتی ہے، جب کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو دیکھا جائے تو آپ ﷺ کی زندگی میں کہیں بھی قول وعمل کا تضاد اور اختلاف نہیں پایا جاتا، آپ ﷺ نے انسانیت کو جن اخلاقی تعلیمات وہدایات کی دعوت دی پہلے خود ان پر عمل کر کے نمونہ پیش فرمایا، جس کی گواہی خود اللہ جل جلالہٗ نے دی، چنانچہ فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم : ٤) بلاشبہ آپ بلند اخلاق کی اعلیٰ ترین سطح پر فائز ہیں۔ اور وہ ہے خُلُقِ عظیم، جس کی تفصیل میں علماء نے فرمایا کہ اخلاق کی تین قسمیں ہیں: (۱) اخلاقِ حسنہ۔ (۲) اخلاقِ کریمہ۔ (۳) اخلاقِ عظیمہ۔ اخلاق حسنہ عدلِ کامل کو کہتے

ہیں، یعنی ہر ایک کے ساتھ عدل واعتدال کا معاملہ کرنا، اور کسی پر کسی طرح کا ظلم نہ کرنا یہ خلقِ حسن کہلاتا ہے، اور یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے، اس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو دی تھی، جس کی طرف قرآنِ کریم نے یوں اشارہ فرمایا:

﴿ وَ كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ وَ الۡعَيۡنَ بِالۡعَيۡنِ وَ الۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَ الۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ﴾ (المائدة: ٤٥)

''اور ہم نے ان پر تورات میں لکھ دیا کہ جان کے بدلہ جان اور آنکھ کے بدلہ آنکھ اور ناک کے بدلہ ناک اور کان کے بدلہ کان اور دانت کے بدلہ دانت اور زخموں کا بدلہ بھی اسی طرح ہے۔'' یہ ہے عدلِ کامل، اس کا حاصل یہ ہے کہ معاملہ اَدَل بدل کا ہو، اور انصاف کے مطابق ہو، ایک شخص نے جس طرح کا معاملہ ہمارے ساتھ کیا، ہم اسی طرح کا معاملہ اس کے ساتھ کریں، تو یہ خلقِ حسن ہے۔

اور اخلاق کی دوسری قسم، خلقِ کریم ہے، اس میں اَدَل بدل کا معاملہ نہیں ہوتا؛ بلکہ عفو سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً کسی نے ہمیں تکلیف پہنچائی، تو ہمیں بھی اسی کے بقدر تکلیف پہنچانے کا حق ہے، لیکن ہم نے اسے معاف کر دیا، تو یہ ہے خلقِ کریم، قرآن نے اس کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الشورىٰ: ٤٠)

''برائی کا بدلہ برائی تو ہے، لیکن وہ شخص جس نے معاف کر دیا اور صلح کر لی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔'' یہ اخلاق کا درمیانی درجہ ہے، جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو دی تھی۔

لیکن اخلاق کی سب سے اعلیٰ قسم خلقِ عظیم ہے، اس میں صرف عدل وعفو ہی کا نہیں؛ بلکہ احسان کا معاملہ کیا جاتا ہے، اسی کا حکم حق تعالیٰ نے ہمارے آقا ﷺ کو دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِيۡ هِيَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِيۡ بَيۡنَكَ وَ بَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيۡمٌ﴾ (حم السجدة: ٣٤)

ترجمہ: محبوبم! آپ عمدہ اخلاق کے ساتھ برائی کا بدلہ بھلائی کے ذریعہ دیں، تب ہی وہ شخص جس کے اور آپ کے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا غم خوار دوست ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿خُذِ الۡعَفۡوَ وَ اۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ﴾ (الأعراف: ٩٩)

ترجمہ: معاف کیجئے، بھلائی کا حکم دیا کیجئے اور جہالت برتنے والوں کی طرف دھیان نہ دیجئے۔

یہ ہیں وہ مکارمِ اخلاق جن کی تعلیم رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو دی، اور رحمۃ للعالمین ﷺ نے یہی تعلیم اپنی امت کو دیتے ہوئے فرمایا:

''صِلْ مَنْ قَطَعَكَ، وَ أَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ، وَ أَعْرِضْ عَمَّنْ ظَلَمَكَ.''
(الترغيب: ٣/٣٤٢)

''جو تم سے تعلق توڑے ان سے تعلق جوڑو، جو تم کو محروم کرے تم ان کو عطا کرو، جو تم پر ظلم کرے تم ان کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کرو۔''

اس تعلیم کے مطابق خود آپ ﷺ نے بھی پوری زندگی اس پر عمل کیا، اور اپنے وفاداروں کو بھی اس کی ترغیب دی، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کے جانی دشمن جاں نثار بن گئے۔

اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ کا ایک بے مثال واقعہ:

سیرۃ النبی میں آپ ﷺ کے خلقِ عظیم سے متاثر ہونے والوں کی بہت سی مثالیں

پائی جاتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مثال صفوان ابن امیہ کی بھی ہے۔ اسلام اور رحمت عالم ﷺ کے بدترین دشمنوں میں صفوان بن امیہ کا نام بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، فتح مکہ کے بعد جب رؤساءِ قریش کا شیرازہ بکھر گیا، اور ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہ رہ گئی، تو ان میں سے اکثر تو رحمت دو عالم ﷺ کے خلقِ عظیم اور لطف وکرم کو دیکھ کر مشرف باسلام ہو گئے؛ مگر بعضوں نے اپنے گذشتہ کرتوت کے خوف یا ضلالت اور عداوت کی وجہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ صفوان بن امیہ نے بھی جدہ کا راستہ لیا، ان کے ایک عزیز اور قدیم رفیق حضرت عمرو بن وہب ؓ تھے، انہوں نے دربارِ رسالت میں عرض کیا کہ ”حضور! ہمارے خاندان کے سردار صفوان ابن امیہ ہماری فتح وکامیابی کو دیکھ کر مارے خوف کے بھاگ گئے ہیں، میری درخواست یہ ہے کہ آپ انہیں معافی وامن دے دیں۔“ آپ ﷺ نے فوراً یمنی چادر جو فتح مکہ کے موقع پر بطورِ عمامہ سر مبارک پر باندھی تھی دشمن کے اطمینان کے لیے دے دی اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ صفوان کو امن کی علامت کے طور پر یہ چادر دکھا کر اسلام کی دعوت دیں، اگر وہ قبول کرلیں تو فبہا، ورنہ انہیں غور وفکر کے لیے دو مہینہ کی مہلت دی جائے، یہ ہیں خلق عظیم کہ صرف عدل وعفو ہی نہیں؛ بلکہ احسان کا معاملہ کیا جارہا ہے۔

کسی کہنے والے نے سچ کہا ہے:

جو عاصی کو کملی میں اپنی چھپائے ☆ جو دشمن کو زخم کھا کر بھی دعا دے
اسے اور کیا نام دے گا زمانہ ☆ وہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

حضرت عمروؓ رحمت والی چادر لے کر اپنے خاندان کے سردار اور عزیز دوست صفوان کی تلاش میں نکلے، ایک گھاٹی میں انہیں پالیا اور امن کا پیغام سنا کر ردائے مبارک دکھا کر اپنے ساتھ واپس لے آئے، جب وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو خود پہل کر کے مجمع عام میں بلند آواز سے کہنے لگے کہ ”یہ عمرو بن وہب نے مجھے آپ کی چادر دکھا کر کہا کہ آپ نے مجھے بلایا ہے اور مجھے اختیار دیا ہے کہ اگر میں پسند کروں تو اسلام قبول کرلوں، ورنہ دو مہینہ کی مہلت

ہے، کیا یہ سچ ہے؟ آپ ﷺ نے صفوان کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا: ”ابو وہب! سواری سے اترو۔“ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھے، اس لیے کہنے لگے: ”لَا، وَاللّٰہِ! حَتّٰی تُبَیِّنَ لِیْ.“ ”جب تک آپ مجھے صاف صاف نہ بتائیں گے میں سواری سے نہ اتروں گا“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دو کے بجائے چار ماہ کی تمہیں مہلت ہے“ اس عفو واحسان سے وہ متاثر ہو گئے، مگر اس کے بعد بھی صفوان تو اپنے مذہب پر قائم رہے، حتیٰ کہ اسی حالت میں ایک عرصہ گذر گیا، بالآخر جب غزوۂ حنین سے واپسی ہوئی تو حضور ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے انہیں سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ صفوان حضور ﷺ کے عفو وکرم کو تو پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے تھے، اب یہ شاہانہ جود وسخا کا انداز دیکھا تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گئے۔ (سیرۃ الصحابہ: ۷/۱۰۰)

یہ ہے اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ کا ایک نمونہ، آپ ﷺ کے اسی خلقِ عظیم نے دشمنوں کو دوست اور ہرجائیوں کو اپنا بنادیا تھا۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے:

نبی کے خلقِ عظیم تر نے سبھی کو اپنا بنا کر چھوڑا
جو بھولے بھٹکے تھے مسافر انہی کو رہبر بنا کر چھوڑا

اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ: سیرۃ النبی کا سب سے روشن باب:

صاحبو! یوں تو سیرۃ النبی ﷺ کے تمام ابواب اور اس کا ہر ہر پہلو نہایت صاف اور روشن ہے؛ لیکن اس کا سب سے وسیع اور روشن باب اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ کا ہے، یہی وجہ ہے کہ اظہارِ نبوت سے قبل بھی سارے عرب میں اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ کا خوب شہرہ اور چرچا تھا، اور اسی کے سبب مریم اسلام سیدہ خدیجہ ؓ سے آپ ﷺ کا نکاح ہوا، حضرت خدیجہ ؓ عرب کے شریف خاندان کی بڑی مالدار عورت تھیں، ان کی شرافتِ نسبی اور عفت وپاکدامنی کی وجہ سے دورِ جاہلیت اور عہد نبوت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، اسی لیے جب آپ رضی اللہ عنہا اپنے پہلے شوہر ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی اور ان کے انتقال کے بعد دوسرے

شوہر عتیق بن عائذ مخزومی کے انتقال پر دو مرتبہ بیوہ ہوگئیں، تب بھی قریشِ مکہ کا ہر شریف آدمی ان سے نکاح کا متمنی اور خواہش مند تھا، لیکن سیدہ خدیجہؓ نے سب کے پیغامات رد فرما دیے اور حضور ﷺ کی طرف راغب ہوئیں، آپ ﷺ کو اختیار کرنے کی وجہ خود بیان فرماتی ہیں کہ "إِنِّیْ رَغِبْتُ فِیْكَ لِحُسْنِ خُلُقِكَ وَ صِدْقِ حَدِیْثِكَ." (اصح السیر /ص:۱۱) آپ کے اخلاق دیکھ کر میرے دل میں آپ سے نکاح کی رغبت اور شدید داعیہ پیدا ہوا۔ حضور ﷺ کے سفرِ شام سے واپسی کے دو مہینے اور پچیس دن کے بعد نفیسہ بنت منیہ کے ذریعہ خود انہوں نے آپ ﷺ کو پیغامِ نکاح دیا، تو آپ ﷺ نے اپنے چچا خواجہ ابو طالب کے مشورہ سے اسے قبول فرمایا۔ تاریخِ معین پر آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب، حضرت حمزہؓ اور دیگر روساءِ خاندان کی معیت میں حضرت خدیجہؓ کے یہاں تشریف لائے، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو درہم (بیس اونٹ) مہر مقرر ہوا، یہ آپ ﷺ کا پہلا نکاح تھا اور حضرت خدیجہؓ کا تیسرا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال، اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق اٹھائیس سال۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۱۱۱ تا ۱۱۲، جلد: ۲/ ۲۴۴ تا ۳۴۴)

حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ محلّہ بنو ہاشم سے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ان کے بھتیجے کے گھر دارِ خزیمہ منتقل ہوگئے، کیوں کہ اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ سے متاثر ہوکر سیدہ خدیجہؓ نے اپنا گھر اور مال و زر سب کچھ حضور ﷺ پر نثار کر دیا تھا، حتیٰ کہ حضرت خدیجہؓ کو ان کے بھتیجے حکیم بن حزام نے ایک غلام زید بن حارثہ دیا تھا، جو اصل میں یمن کے قبیلہ بنو خزاعہ کے سردار حارثہ بن شرحبیل کے صاحبزادہ تھے، اسلام سے قبل ڈاکوؤں نے زبردستی آٹھ سال کی عمر میں اغوا کر کے بیچ دیا تھا؛ لیکن ان کے مقدر کا ستارہ یوں چمکا کہ سیدہ خدیجہؓ نے اپنے اس ہونہار غلام کو بھی حضور ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، تو حضرت زیدؓ بھی اخلاقِ مصطفیٰ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ ہی کے محبّ اور جاں نثار بن کر رہ گئے۔

(از: "پیامِ سیرت عہدِ حاضر کے پس منظر میں" ص: ۷۰)

اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ پر سیدہ خدیجہؓ کا شاندار تبصرہ:

اور واقعہ یہ ہے کہ جو ایک مرتبہ آپ ﷺ کے اخلاق سے متاثر ہوکر قریب ہوگیا، پھر وہ کبھی آپ ﷺ سے جدا نہ ہوا، پھر ایک انسان کے سب سے زیادہ قریب عموماً اس کی بیوی ہوتی ہے، اس لیے بیوی سے بڑھ کر کسی کی گواہی معتبر و مستند نہیں ہوسکتی۔ ان حقائق کی روشنی میں اب دیکھئے کہ سیدہ خدیجہؓ جو کہ آپ ﷺ کی پہلی بیوی ہیں، وہ اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ سے متعلق کیا شاندار تاثر پیش فرماتی ہیں، یہ یاد رکھئے کہ سیدہ خدیجہؓ نے حضور ﷺ کی زوجیت میں نبوت سے قبل پندرہ سال اور بعد میں دس، کل ملا کر پچیس سال کا طویل عرصہ گذارا، اور جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آپ ﷺ نے دوسرا عقد نہیں فرمایا، آپ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کی چار صاحبزادیاں حضرت زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن کے علاوہ دو صاحبزادے حضرت قاسم اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ (تیسرے صاحبزادے حضرت ابراہیم حضور ﷺ کی باندی ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے۔) غرض سیدہ خدیجہؓ نے نبوت سے قبل ہی ایک زمانہ حضور ﷺ کے ساتھ گذارا، اور اس سے بھی پہلے تجارت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے ساتھ معاملہ کر کے آپ ﷺ کو اچھی طرح جانچ اور پرکھ چکی تھیں، پھر عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ تھیں۔ (مظاہر حق جدید: ۴/ ۳۴۴)

لہٰذا ان کے سامنے رحمتِ عالم ﷺ کی زندگی چاند سے زیادہ روشن، کلیوں سے زیادہ پاکیزہ اور پھولوں سے زیادہ معطر تھی، وہ آپ ﷺ کی خلوت و جلوت کی راز دار تھیں، اب جب آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، تو یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں تھی، اس لیے ذمہ داری کے احساس نے آپ ﷺ کو لرزا دیا، آپ ﷺ حرا کی چوٹیوں سے اتر کر سیدھے اپنے گھر سیدہ خدیجہؓ کے پاس پہنچے، آپ ﷺ سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے، قدم رکھتے ہی فرمایا: "زَمِّلُوْنِیْ، زَمِّلُوْنِیْ" (مجھے چادر اوڑھاؤ) سیدنا خدیجہؓ نے ایک وفا شعار

رفیقۂ حیات کی حیثیت سے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے چادر ڈال دی، پھر سرہانے بیٹھ گئیں، جب گھبراہٹ کی کیفیت دور ہوئی تو آپ ﷺ نے اصل واقعہ اور صورتِ حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''خَشِيْتُ عَلٰی نَفْسِيْ'' (مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہے) میں یہ بارِ نبوت اٹھا سکوں گا یا نہیں۔ تب سیدہ خدیجہؓ نے تسلی دی اور غم خواری کا فرض اس طور پر نبھایا جو ان ہی کا حق تھا، اس لیے کہ بعض اوقات کسی صاحبِ اوصاف شخص کی تعریف اُسی کے روبرو کرنا تسلی اور حوصلہ دلانے کے لیے لازم ہو جاتا ہے۔ (مظاہر حق جدید: ۳۳۴/۵)

سیدہ خدیجہؓ نے فرمایا:

" كَلَّا، وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَداً، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ لِلْمَعْدُوْمِ، وَتَقْرِيْ الضَّيْفَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ."

(متفق علیه، مشکوۃ / ص:۵۵۲/ باب المبعث وباب الوحی / الفصل الأول)

میرے محبوب! آپ کوئی لاوارث تو نہیں، آپ تنہا تو نہیں، آپ جس کے نمائندہ ہیں، مجھے اسکی جلالت کی قسم ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا، اس لیے کہ آپ کے اخلاق ہی ایسے ہیں کہ ایسے اخلاق والے کبھی نامراد نہیں؛ بلکہ بامراد ہوتے ہیں، اس کے بعد ام المومنین سیدہ خدیجہؓ نے اپنی اس تسلی کی دلیل میں زندگی بھر کے تجربات میں آئے ہوئے اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ کے مختلف اوصاف نہایت سادگی کے ساتھ مختصر ترین الفاظ میں بیان فرمائے۔

مصطفیٰ ﷺ کا پہلا وصف: صلہ رحمی کرنا:

ان میں پہلا وصف ہے ''إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ'' آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، آپ تعلق توڑنے والوں سے تعلق جوڑتے ہیں۔ صلہ رحمی کے یہی معنیٰ ہیں، چنانچہ حدیث میں وارد ہے:

'' لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ

وَصَلَهَا.'' (بخاری، مشکوۃ/ص: ۴۱۹)

صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو بدلہ چکائے، بلکہ وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ توڑا جائے تب بھی وہ جوڑے، آپ ﷺ نے ساری زندگی قول وعمل سے صلہ رحمی کی بڑی تاکید فرمائی، ہمیشہ رشتوں کا لحاظ اور احترام کیا، سیرۃ النبی ﷺ میں اس کی ایک بہترین مثال غلامِ مصطفیٰ زید بن حارثہؓ کا واقعہ ہے کہ جب حضرت زیدؓ کے والد کو کسی طرح پتہ چلا کہ ان کا فرزند ہاشمی خاندان کے ایک نامور شخص کے یہاں ہے، تو وہ تلاش کرتے ہوئے حضورِ پاک ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے، بتایا جاتا ہے کہ وہ زید کی جدائی کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے، عرض کیا! حضور! یہ زید میرا بیٹا ہے، جب سے یہ جدا ہوا گھر کا آنگن مسکراہٹوں کو ترس گیا ہے، اس کی ماں تو رو رو کر آنکھیں کھو بیٹھی ہے، اس کی ننھی بہنیں گھر کی چوکھٹ پر ہر وقت انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں، میرا یہ حال ہو گیا ہے حضور! زید کو خریدنے میں جتنی رقم آپ نے خرچ کی ہے میں اس سے دوگنی دینے کو تیار ہوں؛ مگر میرا بیٹا مجھے دے دیجئے گا! رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''تم رقم دینے کی بات کرتے ہو، میں تو اپنے زید کو بلا معاوضہ تحفے دے کر تمہارے حوالہ کرنے کے لیے تیار ہوں، کہ میں رشتے جوڑنے کے لیے آیا ہوں، توڑنے کے لیے نہیں، میں جدا کرنے نہیں آیا، ملانے آیا ہوں، اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی کی بات ہوگی کہ ایک بچھڑا ہوا بیٹا اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے مل جائے، تم اپنے بیٹے کو لے جا سکتے ہو، میری طرف سے کوئی رُکاوٹ نہیں، بس صرف اتنی بات ہے کہ جبر نہ کیا جائے، زید کو بھی راضی کر لیا جائے، اگر وہ بہ طیبِ خاطر خوش دلی سے تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' زید کے والد مسکرا کر سراپا شکر بن گئے، اور دل کی گہرائیوں سے حضور ﷺ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زید کی طرف دیکھا اور کہا: ''اٹھو لختِ جگر! میں تمہیں ماتا کی ٹھنڈی چھاؤں تک پہنچا دوں۔'' لیکن شاید آسمان کی آنکھ نے یہ منظر پہلی مرتبہ دیکھا ہوگا کہ آقا نے اجازت دے دی؛ مگر غلامِ مصطفیٰ نے ایک نظر اپنے والد کی طرف اور ایک نظر اپنے اور کائنات کے محبوب آقا کی طرف ڈالی، کچھ دیر تک نگاہوں نے

جائزہ لیا، اور پھر ضمیر نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ کی، حضرت زیدؓ نے صاف صاف کہہ دیا: ''ابا حضور! آپ سے تو ملاقات ہوگئی، ہوسکتا ہے ماں سے بھی ہوجائے، ورنہ کل حشر میں مل لیں گے، سب کو میرا سلام کہنا، آپ تشریف لے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، دامنِ مصطفیٰ کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' باپ حیرت سے کہنے لگے کہ ''تم عجیب آدمی ہو، آزادی کو غلامی پر ترجیح دیتے ہو؟'' زید نے عرض کیا: ''ابا جان! یہ وہ غلامی ہے جس پر آزادی کے سارے مفہوم قربان کیے جاسکتے ہیں۔'' ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ

محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

بہر حال آپ ﷺ کا ایک وصف ہے صلہ رحمی کرنا، آپ ﷺ نے ساری زندگی اس پر عمل کرکے پاکیزہ نمونہ انسانیت کے سامنے پیش کیا، آج ہم آپ ﷺ کے اس وصف کو اگر اپنالیں تو واقعی معاشرہ میں محبت کی فضا قائم ہوجائے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی حضور ﷺ کی طرح ہمیشہ توڑ کے بجائے جوڑ کی فکر اور نفرت کا جواب محبت سے دیا کریں۔

مصطفیٰ ﷺ کا دوسرا وصف: سچ بولنا:

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے مصطفیٰ ﷺ کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا: ''وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ'' (آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں) صداقت سیرۃ النبی کا لازمی جزا ور آپ ﷺ کی پہچان ہے، آج بھی اگر یہ سوال کیا جائے کہ سچ کیا ہے؟ تو جواب ہوگا: سچائی وہ ہے جس کو حضور ﷺ نے فرمایا، نبوت سے قبل بھی آپ ﷺ جس لقب سے مشہور ہوئے وہ ہے ''الصادق الأمين'' آپ ﷺ کی امانت وصداقت کا اعتراف سبھی نے کیا، چنانچہ جس وقت رحمتِ عالم ﷺ کو حکم ہوا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الحجر: ۹۴)
اور ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴)

کہ اپنی نبوت اور دعوت کا عام اعلان اور اظہار کیجئے، تو آپ ﷺ داعیِ حق وصداقت بن کر صفا کی بلندیوں پر کھڑے ہوگئے، اور چادر ہلا ہلا کر مکہ کی بستی کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے، اس وقت مکہ کا قدیم دستور یہی تھا کہ لوگوں کو کسی غیر معمولی بات کی اطلاع دینی ہوتی، تو وہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہوکر لوگوں کو اپنا مدعا سناتے، کیوں کہ اسی پہاڑی کے قریب کعبۃ اللہ بھی تھا، اور یہیں مکہ کی چھوٹی سی بستی بھی آباد تھی، رحمت عالم ﷺ نے بھی اہلِ مکہ کے اس قدیم طریقہ سے فائدہ اٹھایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں جو ذرائعِ ابلاغ ہوں دعوت دین کے لیے ان کا استعمال کرسکتے ہیں، اس لیے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے اس اہم کام کے لیے کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں فرمایا، لہٰذا جس زمانہ اور علاقہ میں ابلاغ کے جو مختلف ذرائع ہوں دعوت کے لیے انہیں اختیار کرسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہوں، صفا پہاڑی پر چڑھ کر مشرکین مکہ کسی اہم بات کے اعلان کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے تھے حضور ﷺ نے اسی قدیم طریقہ سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ اہل مکہ جمع ہوئے، خادم بھی آئے مخدوم بھی، رعایا بھی آئی آقا بھی، لات وعزی اور ہبل کے آستانہ نشین بھی اور ان کے مریدین بھی، عورتیں، مرد، جوان، بوڑھے، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب کی نگاہیں رحمتِ عالم ﷺ کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ نہ معلوم آج اس زبان سے کیا نکلنے والا ہے، اب لب مبارک ہلتے ہیں، فرمایا: ﴿لَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ﴾ (یونس: ۱۶) مکہ والو! میں نے تم میں رہ کر زندگی کی چالیس بہاریں گذاری ہیں، چالیس گھنٹے نہیں، چالیس دن نہیں، چالیس ہفتے نہیں، چالیس مہینے نہیں، پورے چالیس سال گذارے ہیں، میرا بچپن بھی تمہارے سامنے ہے، لڑکپن بھی اور جوانی بھی، فیصلہ کرو! تم نے مجھے زندگی کے چالیس سالہ تجربات میں کیسا پایا؟ سچا پایا، یا اس کے برعکس؟ مکہ والوں نے بیک زبان ہوکر جواب دیا: ''مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا'' (متفق عیه، مشکوٰۃ / ص: ۵۲۳) ہم نے زندگی کے ہر موڑ

پر جب بھی آپ کو آزمایا ہمیشہ سچا ہی پایا، آپ تو صداقت کا نشان ہیں، اِسی کو سیدہ خدیجہؓ نے "وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ" کہہ کر بیان فرمایا، کاش! ہم بھی اگر قول و عمل اور ظاہر و باطن میں سچائی کو اپنالیں تو کامیابی ہمارے قدم چومنے لگے۔

مصطفیٰ ﷺ کا تیسرا وصف لوگوں کا بوجھ اُٹھانا:

اس کے بعد مصطفیٰ ﷺ کا تیسرا وصف ان الفاظ میں بیان فرمایا: "وَتَحْمِلُ الْكَلَّ". آپ تو لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ بے سہاروں کو سہارا دیتے ہیں۔ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　مزہ تو تب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

سیرتِ سرورِ کائنات ﷺ کا مطالعہ کیجئے! معلوم ہوگا کہ اپنوں اور بیگانوں کا ظاہری اور باطنی بوجھ دور کرنا، ان کو پریشانیوں اور غموں سے نجات دلانا ان کی مشکلات میں کام آنا، یہ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور فطرتِ سلیمہ کا ایک خاص شعار تھا، یہی وجہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ نے دیکھا کہ میرے چچا ابوطالب کثیر العیال ہیں، اور معاشی و اقتصادی اعتبار سے مشکلات سے دوچار ہیں، تو آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں میں حضرت عباسؓ سے (جو معاشی اعتبار سے بہتر حالت میں تھے ان سے) مشورہ کیا کہ ہم لوگ چچا ابوطالب کے کچھ بچوں کی کفالت و پرورش اپنے ذمہ لے لیں، تو ان کا بوجھ کم ہو جائے گا، حضرت عباسؓ تیار ہو گئے، حضور ﷺ تو پہلے ہی سے تیار تھے، اس کے بعد خواجہ ابوطالب سے درخواست کی، تو انہوں نے کہا: "عقیل تو میرے پاس رہیں گے" باقی علی اور جعفر کو تم لوگ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو" تبھی سے حضرت علیؓ کو تو آپ ﷺ نے اپنے پاس رکھا اور حضرت جعفر کو حضرت عباسؓ کے حوالہ کیا، پھر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کی اولاد کی طرح پرورش فرمائی، او ربالآخر بیٹی حضرت فاطمہؓ کو ان کی زوجیت میں عطا فرمایا۔ (سیرۃ ابن ہشام/ص:۳۴۶، از: "پیامِ سیرت"/ص:۱۰۴)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس وسعت ہو تو کسی تنگدست عیال دار کی اولاد

کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا خرچ اپنے ذمہ لینا بھی رحمت عالم ﷺ کی سنت ہے، آپ ﷺ کی سیرت میں ایسے کئی واقعات مل سکتے ہیں کہ آپ ہر پریشان حال کی ہر پریشانی اور بوجھ میں اس کا سہارا بنتے تھے۔

مصطفیٰ ﷺ کا یہی وہ وصف ہے جس کو سیدہ خدیجہؓ نے بیان فرمایا: "وَتَحْمِلُ الْكَلَّ"، پس ماندہ سماج کو اونچا اٹھانے کا یہ ایک نسخۂ اکسیر ہے، جب کہ ہم اس عمل کو اپنے لیے اُسوہ بنالیں۔

مصطفیٰ ﷺ کا چوتھا وصف: تنگدست کے لیے کمانا:

آگے مصطفیٰ ﷺ کا چوتھا وصف یہ بیان فرمایا کہ "وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ" آپ فقیروں اور تنگدستوں کے لیے کماتے ہیں۔ اپنا کمایا ہوا مال ان کی ضرورت میں خرچ کرتے ہیں، اعراب کے فرق کے ساتھ یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو کمائی پر لگا دیتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں، یا آپ ان کو اس لائق بنا دیتے ہیں کہ وہ کما سکیں۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو دیکھا جائے تو یہ سارے ترجمے صادق آتے ہیں، آپ ﷺ اپنی کمائی سے مفلس، نادار اور بے روزگار لوگوں کی حد درجہ فراخدلی کے ساتھ مدد فرماتے تھے، اور ان کو بھی اس قابل بناتے کہ وہ اپنا اور ماتحتوں کا خرچ برداشت کرسکیں۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک صحابیٔ رسولؓ اپنی مجبوری اور تنگدستی کی وجہ سے حاضرِ خدمت ہوئے اور آپ ﷺ سے سوال فرمایا، آپ ﷺ نے ان کی مدد فرمائی، انہوں نے دوبارہ سوال کیا، آپ ﷺ نے پھر مدد فرمائی، انہوں نے سہ بار سوال کیا، تو آپ ﷺ نے اس خیال سے کہ کب تک یہ بے چارے سوال کرتے رہیں گے، سوال کی مذمت بیان فرمائی، پھر دریافت فرمایا کہ "گھر میں کچھ ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ "ایک چادر اور ایک پیالہ ہے،" آپ ﷺ نے پیالہ منگا کر فروخت کرایا اور ایک کلہاڑی خریدوائی، پھر اپنے دستِ مبارک سے اس میں لکڑی کا دستہ لگایا، اور ان سے فرمایا: "جاؤ! جنگل سے

لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاؤ اور بازار میں جا کر انہیں فروخت کرو‘‘ آپ ﷺ نے ان تنگدست صحابی کو روزگار کا وہ طریقہ بتایا جس سے چند دنوں میں وہ صحابی فارغ البال ہو گئے۔ (مشکوۃ /ص:۱۶۳)

الغرض! غریبوں، بے کسوں، بے روزگاروں اور فاقہ کشوں کی اعانت کرنا، ان کو روزگار مہیا کرانا یہ حضور ﷺ کا خاص مزاج تھا، جس کو سیدہ خدیجہؓ نے ’’وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ‘‘ کے ذریعہ بیان فرمایا۔ آج اگر اس وصف کو اپنا کر بے کار لوگوں کو روزگار پر لگا دیا جائے تو غریبی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مصطفیٰ ﷺ کا پانچواں وصف: مہمانوں کا اکرام:

مصطفیٰ ﷺ کا پانچواں وصف سیدہ خدیجہؓ نے ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ’’وَتَقْرِیْ الضَّیْفَ‘‘ آپ ﷺ مہمان نواز تو ہیں ہی، لیکن ساتھ ہی ان کی تعظیم اور توقیر کرتے ہیں، آنے والے کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کے ساتھ مہمان نوازی اور بہتری کا معاملہ فرماتے ہیں، حتیٰ کہ آپ کا جانی دشمن بھی کبھی مہمان بن کر آیا تو وہ بھی آپ ﷺ کی مہمان نوازی سے محروم نہ رہا۔

پڑھیے گا دُرود اُس پر جس ذات نے دشمن کو
خنجر سے نہیں مارا، اخلاق سے مارا ہے

مہمان نوازی اور مہمان کی تعظیم و توقیر کرنا آپ ﷺ کا محبوب مشغلہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب آیتِ کریمہ: ﴿وَ أَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴) نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا اور اپنے قبیلے والوں کو کھانے پر مدعو کیا، کم و بیش چالیس افراد جمع ہو گئے، جن میں آپ ﷺ کے اعمام ابو طالب، حمزہ، عباس کے علاوہ ابولہب بھی شامل تھے، آپ ﷺ نے سب کو گوشت کھلایا، پھر دودھ پیش فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اُس گوشت، روٹی اور دودھ میں ایسی برکت دی کہ تھوڑا کھانا سب کو

کافی ہو گیا، اس کے بعد ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی، تو ابولہب نے سختی سے انکار کیا اور برا بھلا کہا کہ: لوگو! اٹھو، محمد نے تو آج تمہارے کھانے پر جادو کر دیا ہے، لوگ متفرق ہو گئے، البتہ اس مجمع میں حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کی دعوتِ طعام کے ساتھ دعوتِ اسلام کو بھی قبول کیا، اور آپ ﷺ کے مشن میں بھرپور مدد کا عہد کیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج۳/ ۳۵۹، از: ’’پیامِ سیرت‘‘ ص:۱۰۶، و’’سیرۃ المصطفیٰ‘‘ ج۱/ص:۱۷۳)

معلوم ہوا کہ صالح تبلیغی و اصلاحی مقاصد کے لیے کھانے وغیرہ کی تقریبات منعقد کرنا تا کہ لوگ مانوس ہو جائیں، پھر دعوتِ طعام کے بعد دعوتِ اسلام پیش کرنا بھی آپ ﷺ کی سنت اور دعوت و تبلیغ کا ایک مؤثر طریقہ ہے، اس مقصد کے تحت مستقل دعوتِ طعام بھی کی جا سکتی ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افطار پارٹی یا عید ملن وغیرہ کے عنوان سے غیر مسلم بھائیوں کو بلایا جائے، اور موقع کی رعایت کے ساتھ ان کے سامنے اپنی اسلامی، اصلاحی اور تبلیغی بات رکھی جائے۔

مگر افسوس! آج بعض مسلمان سیاسی اور مادی اغراض و مقاصد کے تحت تو ایسی تقریبات منعقد کرتے ہیں جن میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا جاتا ہے، لیکن دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی مقاصد کے تحت ایسی تقریبات منعقد کرنے سے غفلت برتی جاتی ہے، کیا اچھا ہو کہ ہم دعوتِ طعام کو بھی دعوتِ اسلام کا ذریعہ بنا لیں۔

مصطفیٰ ﷺ کا چھٹا وصف: حق مارے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا:

اخیر میں ام المومنین سیدہ خدیجہؓ کے تسلی کے الفاظ میں مصطفیٰ ﷺ کا جو چھٹا وصف ارشاد ہوا وہ ہے: ’’وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ‘‘، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ حق مارے ہوئے لوگوں کی مدد کرتے ہیں، حق کہیں بھی ہو، اور اہلِ حق کوئی بھی ہو، مگر آپ ﷺ ضرور اس کا ساتھ دیتے ہیں، ’’حِلْفُ الْفُضُوْل‘‘ کا واقعہ آپ ﷺ کی اس صفتِ مبارکہ کا کھلا اظہار ہے۔

ہوا یہ کہ بنو زبید کے قبیلہ کا ایک آدمی آیا، اور عاص بن وائل نامی شخص سے کچھ

کاروباری معاملہ کیا، جو مکہ کا بڑا آدمی کہلاتا تھا، معاملہ طے ہونے کے بعد عاص نے وعدہ خلافی کی اور زبیدی کا حقِ واجب اس کو نہ دیا، اس مظلوم نے بہت کوشش کی، مکہ کے بااثر لوگوں سے بھی رابطہ کیا کہ کوئی اس کا حق دِلوادے، مگر عاص بن وائل جیسے جری اور زورآور آدمی کے ساتھ معاملہ ہونے کی وجہ سے کسی کو ہمت نہ ہوئی، بالآخر اس نے عربوں کے قدیم دستور کے مطابق ٹھیک طلوعِ آفتاب کے وقت ابوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہلِ مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد وپیش بیٹھے ہوتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو چونکادیا، آپ ﷺ آگے بڑھے اور اپنے ایک چچا زبیر بن عبد المطلب کو لے کر مکہ کے شریف لوگوں کو عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا، اور ایک معاہدہ کیا، جس کے الفاظ یہ تھے: ”لَنَكُونَنَّ يَداً وَاحِدَةً عَلىٰ كُلِّ ظَالِمٍ، حَتّٰى يُؤَدِّيَ حَقَّهُ.“ ظالم کے خلاف ہم سب مل کر ایک ہاتھ اور قوت بن کر رہیں گے، یہاں تک کہ وہ مظلوم کا حق ادا کردے۔ چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا اور زبیدی کے حوالہ کیا گیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک بیس سال تھی۔ اتفاق سے اس معاہدہ میں اشرافِ مکہ کے تین ایسے لوگ شریک تھے جن کا نام فاضل تھا، اِسی مناسبت سے یہ عہدنامہ ”حلف الفضول“ کہلایا۔ نبوت کے بعد آپ ﷺ اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔ (البدایہ والنہایہ ۲۹۱-۲۹۳ از: ”پیامِ سیرت“: ۱۰۱)

عاجز کے خیالِ ناقص میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی اس ملک میں مظلوموں کا حق دِلانے میں اپنوں اور پرایوں کے ساتھ سر جوڑ کر کوئی ”حلف الفضول“ کی طرح معاہدہ کریں، اور اخلاقِ مصطفی ﷺ کو اپنی شناخت بنا کر انسانیت کی اس مشترکہ دولت کو ساری دنیا میں تقسیم کریں، تا کہ وہ فلاحِ دارین پا جائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں اخلاقِ مصطفی ﷺ سے متصف فرما کر انہیں عام کرنے کے لیے سارے عالم میں خلوص کے ساتھ موت تک قبول فرمائیں۔ آمین۔

۲۶/ ربیع الاول/ ۱۴۳۴ھ/ بروز: جمعہ مطابق: ۸/ فروری/ ۲۰۱۳ء/ (بزم صدیقی)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۲۵)

سیرتِ طیبہ ساری انسانیت کے لیے دائمی اُسوۂ حسنہ (اچھا نمونہ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ أَبَا جَهْلٍ قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ، وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهِ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِيهِمْ: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ (رواه الترمذي في السنن، مشكوٰة: ۵۲۱/ باب في أخلاقه وشمائله/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ابوجہل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو کہنے لگا کہ ”ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے؛ بلکہ ہم تو وہ باتیں جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں، تب اللہ رب العزت کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ (الأنعام:۳۳) بے شک وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے؛ بلکہ ظالمین اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔

تمہید:

اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کی ہدایت اوراس کوزندگی کی سچی اورصحیح راہ پر چلانے کے لیے خودان ہی میں سے اعلیٰ اوصاف وعمدہ صفات کے حامل کچھ ایسے افراد واشخاص کو ہر زمانہ میں منتخب ومقرر فرمایا، جواس کے مفوضہ (اور سپرد کیے ہوئے) کام اخلاص واستقامت کے ساتھ انجام دے سکیں، اور ساری انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کے احکام ہمت وحکمت کے ساتھ پہنچا سکیں، ہدایت وتبلیغ رسالت کے اس اہم کام کوانجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جوانسان منتخب اور مقرر ہوئے وہ ''نبی'' اور ''رسول'' کے لفظ سے یاد کیے جاتے ہیں، یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر رحمتِ عالم ﷺ پر جا کر ختم ہوگیا، کیوں کہ حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام انسانوں میں اپنے اعلیٰ اخلاق واوصاف اور عمدہ اعمال واحوال کے اعتبار سے سب پر فائق، برتر اور بلند ہوتے ہیں۔

اس لیے ہر زمانہ کے انسانوں کے لیے ان کی زندگی کونمونہ اور آئیڈیل قرار دیا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نبی اور رسول اپنے زمانہ کے لوگوں کے لیے کامل اور مکمل نمونہ تھے، لیکن نبی آخر الزماں، امام الانبیاء، محبوبِ کبریا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات اور زندگی کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہی زمانہ کے لوگوں کے لیے نہیں؛ بلکہ ہر زمانہ کے ہر انسانی طبقہ کے لیے تاقیامت کامل اور مکمل نمونہ بنادیا۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ۲۱)

''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔'' یعنی آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہی ہر انسانی طبقہ کے لیے اسوۂ حسنہ ہے، اب بظاہر تو یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے، لیکن اس کی دلیل خود آپ ﷺ کا ذکرِ جمیل اور سیرتِ طیبہ ہے، اسی لیے اللہ پاک نے اپنے آخری رسول ﷺ کو اپنی کتاب کا عملی مجسمہ اور نمونہ بنا کر پیش کیا۔

آپ ﷺ ہی کی سیرتِ طیبہ کو اُسوۂ حسنہ کیوں قرار دیا؟:

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ ہی کی سیرتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ کیوں بنایا؟ تو ہمارے علماءِ محققین نے اس کی مختلف وجوہات بیان فرمائیں، منجملہ ان کے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی پاکیزہ سیرت کتابِ ہدایت کی طرح محفوظ ہے، اور چوں کہ کتابِ ہدایت کی عملی صورت آپ ﷺ کی سیرت ہے، اس لیے کتابِ ہدایت کی طرح تاقیامت آپ ﷺ کی سیرت بھی محفوظ رہے گی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مبارک سیرت مہد سے لحد تک زندگی بھر کے جتنے بھی حالات ہیں، جوانسانوں کے مختلف طبقات کو مختلف اوقات میں پیش آتے ہیں، ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور آپ ﷺ نے ان تمام اوقات وحالات سے گذر کر انسانوں کے مختلف طبقات کے لیے عملی نمونہ پیش کیا، اس لیے اب ارشادِ ربانی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ۲۱) کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا والو! تمہارے لیے میرے محمد ﷺ کی زندگی، اور سیرتِ طیبہ ہر حال میں اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونہ وآئیڈل ہے۔

تم اگر یتیم ہوتو عبداللہ وآمنہ کے درِ یتیم کی یتیمی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، تم اگر بچے ہوتو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کا بچپن تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، تم اگر جوان ہوتو محمد ﷺ کی بے داغ اور پاک جوانی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، تم اگر بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ وعائشہؓ اور ازواجِ مطہرات کے شوہر نبیٔ پاک ﷺ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم اولاد والے ہوتو فاطمہؓ کے والد اور حضرات حسنینؓ کے مقدس نانا کا حال تمہارے لیے اُسوہ ہے، اگر تم تاجر ہوتو مکہ سے ملکِ شام کا سفر تجارت کرنے والے سچے اور امانت دار تاجر کا حال تمہارے لیے اُسوہ ہے، اگر تم مزدور ہوتو وادیٔ بطحاء میں بکریاں چرانے والے نبی کی حالت وکیفیت تمہارے لیے اُسوہ ہے، اگر تم قیدی ہوتو شعبِ ابی طالب کے مظلوم قیدی کا صبر واستقلال تمہارے لیے اُسوہ ہے، اگر تم تنہائی وبے کسی کے عالم میں ہدایت اور دعوتِ

خلق کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہوتو مکہ کے بے یار و مددگار داعیٔ ذی وقار کی دعوت تمہارے لیے اُسوہ ہے، اگر تم ہادی، داعی اور ناصح ہوتو کوہِ صفا اور مسجدِ نبوی کے منبر و محراب سے پیغامِ حق وصداقت سنانے والے مصلحِ اعظم کے مواعظِ حسنہ تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم شاگرد ہوتو روح الامینؑ کے سامنے بیٹھنے والے کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم استاذ اور معلّم ہوتو دارِ ارقم اور اصحابِ صفہ کے معلم اعظم کے حالات تمہارے لیے اسوہ ہیں، اگر تم کمانڈر اور سپہ سالار ہوتو بدر و حنین کے سپہ سالار کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو جنگِ اُحد میں شکست کھانے والے کے حالات تمہارے لیے اُسوہ ہیں، اگر تم نے فتح پائی ہے تو فاتحِ مکہ کے حالات تمہارے لیے اُسوہ ہیں، اگر تم رعایا ہوتو قریش مکہ کے محکوم کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم عدالت کے جج و قاضی اور پنچایت کے ثالث ہوتو کعبہ میں نورِ آفتاب سے قبل داخل ہونے والے ثالث کے حالات تمہارے لیے اُسوہ ہیں، اگر تم بادشاہ ہوتو شاہِ مدینہ کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم مہمان ہوتو ابوایوب انصاریؓ کے مہمان کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، اگر تم میزبان ہوتو رؤساءِ مکہ اور مدینہ میں آنے والے مختلف وفود اور مہمانوں کے میزبان کے حالات تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، غرض! تم جو کوئی بھی ہو اور جس حالت میں بھی ہو ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ حسنہ دائمی نمونہ ہے، اور اس کا اتباع دارین میں نجات کا ذریعہ ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

نورِ ہدایت کا وہ مخزن، صاحبِ عرفاں، حاملِ قرآن
خلق میں یکتا، فخرِ دوعالم، صلی اللہ علیہ وسلم
رشد و ہدایت ان سے ملی ہے، ان کے در سے سب کو ملی ہے
مرکزِ ایماں، ہادیٔ عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
سب نبیوں میں افضل وہ ہیں، کیا رُتبہ ہے اللہ اللہ!
سب نبیوں میں وہ ہیں خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں تعلق مع اللہ سے متعلق اسوۂ حسنہ:

اسی کے ساتھ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو اسوہ قرار دینے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے من جانب اللہ ساری انسانیت کے نام جتنے احکام و پیغام پہنچائے پہلے خود ان پر عمل کر کے دکھایا، یہی وجہ ہے کہ سیرتِ طیبہ میں ہر عمل کا اُسوہ اور نمونہ پایا جاتا ہے، مثلاً دیکھیے! آپ ﷺ نے اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور مناجات کی ترغیب و تاکید فرمائی، اب حضرات صحابہؓ کی مقدس زندگی میں اس کے جو نمایاں اثرات تھے وہ الگ چیز ہے، لیکن خود آپ ﷺ کی زندگی میں اس کا کتنا اثر تھا؟ سیرتِ طیبہ میں آپ ﷺ کے تعلق مع اللہ کا جائزہ لینے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں آپ ﷺ تعلق مع اللہ سے خالی رہتے ہوں، ہر وقت آپ ﷺ یا تو زبان سے اللہ تعالیٰ کی یاد میں یا دل سے مشغول رہتے تھے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے، غرض! ہر حال میں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں زبان یا دل سے مشغول رہتے تھے، آج بھی گلدستۂ احادیث میں ایک بڑا حصہ ان ہی مبارک کلمات اور دعاؤں کا موجود ہے جو مختلف حالات و اوقات کی مناسبت سے آپ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے ادا ہوئیں۔ حصن حصین دو سو صفحوں کی کتاب صرف اور صرف ان کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ ہے جن کے ایک ایک جملہ اور فقرہ سے آپ ﷺ کا تعلق مع اللہ ظاہر ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم اولوا الالباب (عقلمندوں) کی پہچان بیان کرتا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۱)

”جو لوگ کھڑے اور بیٹھے، اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے (ہر وقت) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔“ آیتِ کریمہ کی روشنی میں آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو دیکھا جائے تو یہی آپ ﷺ کی زندگی کا نقشہ تھا، جس کی شہادت حدیثِ عائشہؓ میں پائی جاتی ہے:

عن عَائِشَةَ –رَضِيَ اللّٰهُ عَنهَا– قَالَتْ: "كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلىٰ كُلِّ

أَحۡيَانِهٖ."(مسلم، مشکوٰۃ/ص:۴۹/باب مخالطة الجنب وما يباح له/الفصل الأول)

کہ آپ ﷺ ہر مناسب وقت اور ہر لمحہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ (حتیٰ کہ جن اوقات میں زبانی ذکر مناسب نہ ہوتا، مثلاً قضاءِ حاجت کے وقت، اس میں ذکرِ قلبی فرماتے، اس طرح ہر وقت ذکر اللہ اور تعلق مع اللہ میں آپ ﷺ مصروف رہتے تھے) تبھی تو کہا گیا ہے:

بندہ اور خدا سے واصل، خاکی اور انوار کا حامل
اُمی اور اسرار کا محرم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں نماز سے متعلق اسوۂ حسنہ:

آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز کا من جانب اللہ حکم دیا؛ مگر خود آپ ﷺ کا کیا حال تھا؟ نبوت کے آغاز ہی سے آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ کفارِ مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے، لیکن اس کے باوجود عین حرم میں جا کر سب کے سامنے نماز پڑھتے، عام لوگوں اور مسلمانوں کو تو پانچ وقت کی نماز کی ترغیب وتاکید فرماتے؛ مگر خود آپ ﷺ پانچ نہیں؛ بلکہ آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے: (۱) نمازِ فجر (۲) پھر طلوعِ آفتاب کے بعد اشراق (۳) کچھ اور دِن چڑھنے پر چاشت (۴) ظہر (۵) عصر (۶) مغرب (۷) عشاء اور (۸) اس کے بعد نمازِ تہجد، نمازِ پنجوقتہ کی فرضیت کے بعد عام مسلمانوں سے تو نمازِ تہجد کی فرضیت ختم ہوگئی تھی؛ مگر رحمتِ عالم ﷺ اس کو بھی تمام عمر ہر شب پورے اہتمام سے ادا فرماتے رہے۔

اور پھر کیسی نماز؟ کہ رات رات بھر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے، رات تھک جاتی مگر آپ ﷺ نہ تھکتے، باوجود یکہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا۔ حدیث میں ہے: حضرت مغیرہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو آپ ﷺ نے طویل قیام فرمایا، جس سے آپ ﷺ کے قدمین مبارک پر ورم آگیا، اس وقت آپ ﷺ سے عرض کیا گیا: "لِمَ تَصۡنَعُ هٰذَا ؟

وَقَدۡ غُفِرَ لَكَ مَاتَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَقَالَ: أَفَلَا أَكُونُ عَبۡدًا شَكُورًا." (متفق عليه / مشكوٰة/ص:۱۰۹) "اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے، پھر آپ اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ فرماتے ہیں: کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔" اس نے اپنی عطا وعنایت میں کچھ کمی کی ہے کہ میں اس کی اطاعت وعبادت میں کمی کروں؟ سخت سے سخت حالات میں بھی کبھی نماز سے غفلت نہ ہوئی۔ بدر کے میدان میں تمام صحابہؓ دشمنوں کے مقابل کھڑے تھے، مگر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آگے نماز میں سربسجود تھے، بعض اوقات آپ ﷺ پر حالت نماز میں حملہ بھی کیا گیا، اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی؛ مگر آپ ﷺ پھر بھی نماز میں مشغول رہے۔ (متفق علیہ/مشکوٰۃ/ص:۵۲۳)

تمام عمر کوئی نماز عموماً اپنے وقت سے مؤخر نہیں ہوئی، اور نہ دو وقتوں کے علاوہ کبھی کسی وقت کی نماز قضا ہوئی، ایک تو خندق کے موقع پر ۵ھ ہجری میں تمام کفار نے اتفاق کرے پندرہ ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا، صحابہ تقریباً تین ہزار (۳۰۰۰) تھے، حضرت سلمانؓ کے مشورہ پر مدینہ کے گرد خندق کھودی گئی، سخت سردی میں اٹھائیس (۲۸) دن جنگ جاری رہی، اسی میں ایک دن چند نمازیں یا نمازِ عصر قضا ہوگئی، تب آپ ﷺ نے کفار کے حق میں بددعا فرمائی:

عَنۡ عَلِيٍّؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَوۡمَ الۡخَنۡدَقِ: "حَبَسُوۡنَا عَنۡ صَلَاةِ الۡوُسۡطٰى، صَلٰوةِ الۡعَصۡرِ، مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوۡتَهُمۡ وَ قُبُوۡرَهُمۡ نَارًا." (متفق عليه / مشكوة : ص۶۳)

کفار نے ہمیں صلاۃِ وُسطیٰ یعنی نمازِ عصر سے روکا، اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔ غور کیجیے کہ غزوہ اُحد میں آپ ﷺ کو ذاتی تکلیف پہنچی، تب بددعا نہ کی، لیکن نماز قضا ہوگئی تو بددعا فرمائی۔ دوسرا موقع غزوۂ خیبر سے واپسی میں جب آپ ﷺ پر غنودگی طاری ہونے لگی، تو رات کے اخیری حصہ میں آرام کے لیے ایک جگہ اترے، حضرت بلالؓ کو آپ ﷺ نے بیدار رہنے کا حکم فرمایا، پھر آپ ﷺ اور صحابہؓ

سوگئے، کچھ دیر کے بعد حضرت بلالؓ کی بھی آنکھ لگ گئی حتیٰ کہ سب کی نمازِ فجر قضا ہوگئی۔ (مسلم، مشکوٰۃ/ص:٦٦) ان مواقع پر حکمت الٰہی سے نماز قضا ہوئی، چھوٹی نہیں، حتیٰ کہ جماعت بھی ترک نہ ہوئی، اسی طرح جب آپ ﷺ کی قوت جواب دے چکی تھی تو آپ حضرت علی وعباس رضی اللہ عنہما کے کندھوں پر سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے اور نماز ادا فرمائی۔

(مشکوٰۃ/ص:١٠٢/ باب ما على الماموم من المتابعة وحكم المسبوق)

غرض! سیرتِ طیبہ میں یہ تھا نماز سے متعلق اسوۂ حسنہ۔

المدثر، المزمل ذات ہے اس کی کونین کا حاصل
خاک پہ سجدہ، عرش پہ پرچم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں روزہ سے متعلق اُسوہ:

اِسی طرح آپ ﷺ نے روزے کا حکم من جانب اللہ پہنچایا، اب عام مسلمانوں پر تو سال بھر میں ماہِ رمضان ہی کے روزے فرض ہیں؛ مگر اس سلسلہ میں خود آپ ﷺ کا عمل کیا تھا؟ آپ ﷺ کا کوئی مہینہ یا ہفتہ روزہ سے خالی نہ جاتا تھا۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے: "كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ يَصُومُ حَتّٰى نَقُولَ لَا يُفْطِرُ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:١٧٨/ باب صیام التطوع)

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تو دن میں روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، دِن بھر سے زیادہ رکھنے کی ممانعت فرمائی؛ مگر خود آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ کبھی کبھی تو دو دو دِن، تین تین دن بیچ میں کچھ کھائے پیے بغیر مسلسل روزہ رکھتے تھے، اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا، صحابہؓ جب اس عمل میں آپ ﷺ کی تقلید کرنا چاہتے تو فرماتے: "وَ أَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ إِنِّيْ أَبِيتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَ يَسْقِينِيْ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:١٧٥)

"تم میں سے کون میرے مانند ہے؟ تحقیق کہ میں رات گذارتا ہوں اس حال

142

میں کہ میرا رب مجھے (روحانی غذا) کھلاتا پلاتا ہے۔" آپ ﷺ ہر ماہ کے ایام بیض میں روزے رکھتے تھے: "كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَصُومُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ." (مسلم، مشکوٰۃ/ص:١٧٩/ باب صیام التطوع) علاوہ ازیں ہر ہفتہ میں عموماً پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے: "عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَصُومُ الإِثْنَيْنِ وَ الخَمِيسَ." (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:١٧٩) یہ تھا روزوں کے متعلق آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ۔

کنزِ دقائق، حصن حقائق، جانِ حدائق، روحِ خلائق
سب پر فائق، سب پہ مقدم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں زکوٰۃ وخیرات سے متعلق اُسوۂ حسنہ:

اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے لوگوں کو زکوٰۃ وخیرات کا حکم فرمایا کہ مسلمانو! مالدارو! جو کچھ حق حلال کا مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے صرف چالیسواں حصہ اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو جو محتاج اور غریب ہیں زکوٰۃ وخیرات میں دو۔ یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لیے تھا؛ مگر خود آپ ﷺ کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آتا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردیا جاتا، غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال واسباب کی کمی بھی نہ تھی، لیکن وہ سب غریبوں کے لیے تھا، اپنے لیے کچھ نہیں؛ بلکہ اپنے لیے وہی فقر وفاقہ تھا۔

بحرین سے ایک مرتبہ خراج کا لدا ہوا خزانہ آیا، حکم ہوا کہ مسجد کے صحن میں ڈال دیا جائے، صبح جب نماز کے لیے تشریف لائے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے خزانہ کے انبار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، نماز کے بعد اس مال کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور تقسیم کرنا شروع کردیا، جب سب ختم ہوگیا تو دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہوگئے کہ گویا کوئی غبار تھا جو دامن مبارک پر لگ گیا تھا۔

ایک دفعہ فدک سے چار اونٹوں پر غلہ لاد کر لایا گیا، کچھ قرض تھا وہ ادا کیا گیا، پھر کچھ لوگوں کو دینے کا حکم دیا گیا، اس کے بعد حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ بچ تو نہیں

رہا؟ عرض کیا گیا کہ اب کوئی لینے والا نہیں، اس لیے کچھ بچ رہا ہے، فرمایا: ”جب تک دنیا کا یہ مال باقی ہے، میں گھر نہیں جاسکتا۔“ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی، صبح کو حضرت بلالؓ نے بشارت دی کہ ”حضور! اللہ تعالیٰ نے آپ کو سبکدوش فرما دیا، یعنی جو کچھ تھا وہ تقسیم ہوگیا۔“ اس پر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا۔

اس سے بڑھ کہ یہ کہ جس وقت آپ ﷺ مرض الوفات اور سخت تکلیف ونہایت بے چینی میں تھے عین اس وقت یاد آتا ہے کہ چھ یا سات اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں، سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں: ”فَأَمَرَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أُنْفِقَهَا.“ حکم ہوتا ہے کہ انہیں خیرات کردو، لیکن حضور ﷺ کی بیماری کی مشغولی میں مجھے اس کا موقع نہ ملا، آپ ﷺ نے کچھ افاقہ ہونے پر پھر اس کے متعلق دریافت فرمایا، جب عذر پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان اشرفیوں کو منگوایا اور (تقسیم کرنے کے لیے) اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ”مَا ظَنُّ نَبِيِّ اللّٰهِ، لَو لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَهٰذِهِ عِنْدَهُ.“ (رواه أحمد، مشكوٰة/ ص:١٦٧) کیا اللہ کے نبی کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ سے اس حالت میں ملے (یعنی اس کی موت ہوجائے) کہ (اس کے پیچھے اس کے گھر میں) اشرفیاں پڑی ہوں۔

۷ھ فتح خیبر کے بعد سے آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ سال بھر کے خرچ کے لیے تمام ازواجِ مطہرات کے مابین غلہ تقسیم فرماتے تھے؛ مگر سال تمام بھی نہیں ہونے پاتا تھا کہ غلہ تمام ہوجاتا تھا، اور فاقہ پر فاقہ شروع ہوجاتا تھا، کیوں کہ غلہ کا بڑا حصہ اہل حاجت کی نذر کردیا جاتا، ضرورت مندوں پر خرچ کردیا جاتا، اور اپنی ضرورت کا خیال تک نہ رہتا، حتیٰ کہ سیدہ عائشہؓ کے فرمان کے مطابق آپ ﷺ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں تیس (۳۰) صاع جو کے بدلے میں رہن رکھی ہوئی تھی۔

(بخاری، مشکوٰۃ/ص: ۲۵۰/ کتاب البیوع/ باب السلم والرہن)

یہ تھی اس باب میں آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں سے چند عملی مثالیں، جن کا تعلق عبادت اور سخاوت سے تھا۔

جس کا بذل عطائے شامل، جس کا فضل شفاءِ عاجل
جس کا حکم قضائے مبرم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں صبر واستقلال اور شجاعت سے متعلق اُسوۂ حسنہ:

اب نبی کریم ﷺ کا صبر واستقلال اور شجاعت میں کیا حال تھا؟ اس کا بھی نظارہ کر لیجیے! جب باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر واستقلال سے کام لیا، آپ بھی ایسا ہی کیجئے!) چنانچہ ساری زندگی مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے اس پر عمل کر کے دکھایا، اس لیے کہ آپ ﷺ ایک ایسی جاہل اور اَن پڑھ قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی، اور اس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہوجاتی تھی، مگر آپ ﷺ نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی، عین حرم میں جا کر صدائے توحید بلند کرتے اور نماز ادا کرتے، اس کے ردِ عمل میں قریش مکہ نے آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا؟ کس کس طرح تکلیفیں نہیں پہنچائیں؟ جسم مبارک پر صحنِ حرم میں نجاست ڈالی، گلے میں چادر ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی، راستہ میں کانٹے بچھائے، مگر آپ ﷺ کے صبر واستقلال میں کوئی فرق نہ آیا، حتیٰ کہ جب ابوطالب نے حمایت سے ہاتھ اٹھالینے کا اشارہ کیا، تو آپ ﷺ نے کس جوش اور ولولہ سے فرمایا کہ ”چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر مہتاب رکھ دیں، تب بھی میں اس فرض سے باز نہ آؤں گا، آپ ﷺ کو شعب ابی طالب میں تین سال تک گویا قید رکھا گیا، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کا مقاطعہ کیا گیا، آپ ﷺ کے قتل کی مختلف اوقات میں سازشیں کی گئیں، یہ سب کچھ ہوا، مگر آپ ﷺ نے صبر واستقلال کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔

حالانکہ سیرتِ طیبہ میں کچھ مواقع ایسے بھی ملتے ہیں جن میں بعض مسلمانوں کے قدم اُکھڑنے لگے، مگر ان مواقع میں بھی آپ ﷺ صبر واستقلال اور شجاعت کا پہاڑ ثابت

ہوئے، مثلاً غزوۂ اُحُد میں بعض مسلمانوں کے قدم پیچھے ہٹنے لگے، مگر رحمتِ عالم ﷺ اپنی جگہ ثابت قدم تھے، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے تھے، خود کی کڑیاں سر مبارک میں گھس گئی تھیں، دندان مبارک شہید ہو چکا تھا، چہرۂ اقدس زخمی ہو رہا تھا، مگر اُس وقت بھی آپ ﷺ کے صبر و استقلال میں کمی نہ آئی۔

اسی طرح حنین کے میدان میں جب ایک وقت دس ہزار تیروں کی بارش ہوئی تو تھوڑی دیر کے لیے بعض مسلمان پیچھے ہٹنے لگے، مگر آپ ﷺ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہے، صورتِ حال یہ تھی کہ ادھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور ادھر سے " أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب، أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبِ" (بخاری، مشکوۃ/ص:۵۳۴) کا نعرہ بلند تھا، سواری سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: ”میں اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہوں۔“ پھر آپ ﷺ نے حضرات صحابہؓ کی (دوبارہ) صف بندی فرمائی، یہ تھی اس راہ میں آپ ﷺ کی عملی مثال!

فکر انوکھی، ہمت عالی، بول نرالے، چال نرالی
ہر لمحہ ہر شان معظم، صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ طیبہ میں عفو و درگذر سے متعلق اسوۂ حسنہ :

لیکن یہ آپ ﷺ کا صبر و استقلال اور شجاعت کا حال دورِ مغلوبیت کا تھا؛ مگر جب اللہ نے آپ ﷺ کو غلبہ عطا فرمایا تو آپ ﷺ کے عفو و درگذر کا حال بھی نہایت عمدہ اور مثالی تھا۔ چند نمونے اس کے پیش کئے جاتے ہیں:

ابوسفیان کون تھا؟ جانتے بھی ہو! وہی جو جنگِ بدر، اُحد اور خندق وغیرہ میں کفار کا سرغنہ تھا، اور جس نے نہ جانے کتنے ہی مسلمانوں کو تہہِ تیغ کرایا تھا، کتنی ہی دفعہ خود حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا تھا، غرض ہر قدم پر اسلام، اور پیغمبر اسلام ﷺ کا دشمن ثابت ہوا تھا، فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباسؓ کے ساتھ آپ ﷺ کے سامنے آیا، تو اس کا جرم اس

کے قتل کا مشورہ دے رہا تھا؛ مگر رحمت عالم ﷺ کا عفوِ عام دیکھئے! آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اُسے معاف کیا؛ بلکہ حکم فرمایا کہ ”مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِيْ سُفْيَانَ كَانَ آمِنًا“ ابوسفیان! تم کو بھی معاف کر کے امن دیتا ہوں اور اس کو بھی جو تمہارے گھر میں پناہ لے۔

خود ابوسفیان کی بیوی ہندہ جو غزوۂ اُحد میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی تھی اور جس نے حضور ﷺ کے محبوب چچا سیدنا حمزہؓ کو اپنے غلام وحشی بن حرب کو لالچ دے کر دھوکہ سے شہید کروا کر اُن کا مثلہ کر کے کلیجہ چبایا تھا، فتح مکہ کے دن وہی چہرہ پر نقاب ڈال کر سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی؛ لیکن حضور ﷺ پھر بھی کچھ تعرض و توجہ نہیں فرماتے، حتیٰ کہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ ہندہ حضور ﷺ کے اس عفو و درگذر کی معجزانہ شان دیکھ کر پکار اٹھتی ہے کہ ”یارسول اللہ! آج سے پہلے آپ کے چہرے اور خیمہ سے زیادہ مجھے کسی سے نفرت نہ تھی؛ لیکن آج آپ کے چہرے اور خیمہ سے زیادہ مجھے اور کوئی محبوب نہیں ہے۔“

ہبار بن الاسود وہ شخص ہے جو ایک حیثیت سے آپ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ زینبؓ کا قاتل اور کئی شرارتوں کا مرتکب تھا، فتح مکہ کے موقع پر اس کا خون معاف کیا گیا، وہ چاہتا تو یہی تھا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے؛ لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا دربارِ رسالت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے: ”یارسول اللہ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا؛ لیکن پھر مجھے آپ کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا، اب میں حاضر ہوں، میرے جرائم کی جو بھی اطلاعات آپ کو ملی ہیں وہ سب درست ہیں، آپ جو چاہیں میرے حق میں فیصلہ کیجئے!“ اتنا سنتے ہی آپ ﷺ کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوست و دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

یہ ہیں سیرتِ طیبہ میں عفوِ عام کے چند عملی مظاہرے۔

فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت
حل کیے مل کے، جو اسرار تھے باہم، صلی اللہ علیہ وسلم

غرض! ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ سیرتِ طیبہ کو جس زاویہ سے بھی دیکھا جائے اس میں ہر طرح اور ہر طبقہ کے لیے نمونے محفوظ وموجود ہیں، کیوں کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ساری انسانیت کے لیے دائمی نمونہ اوراُسوۂ حسنہ بنایا ہے:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

سیرتِ طیبہ کے اسوۂ حسنہ سے نفع کون حاصل کرے گا؟

لیکن اسی کے ساتھ آگے یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ سیرتِ طیبہ سے وہی خوش نصیب انسان نفع اٹھائے گا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور ذکر اللہ کی کثرت کرتا ہو:

﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْآخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الأحزاب:۲۱)

مطلب یہ ہے کہ جیسے قرآن کی ہدایت تو عام ہی ہے؛ لیکن اس سے استفادہ وہی کرتے ہیں جو دولتِ ایمان سے مالامال ہیں۔ اسی طرح صاحبِ قرآن کی رسالت وپیغامِ سیرت بھی عام ہے، سیرتِ طیبہ تو ساری انسانیت کے لیے دائمی اسوۂ حسنہ ہے؛ لیکن عملی طور پر اس سے وہی خوش نصیب مستفیض ہوتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اب جس کے ایمان میں جتنی کمی وکمزوری ہوگی اس کے عمل میں بھی اتنی ہی کمی وکمزوری ہوگی۔

دعا کریں کہ حق تعالیٰ ہمیں کمالِ ایمان کے ساتھ ہمارے آقا ﷺ کی صحیح غلامی نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۲/ربیع الاول/۱۴۳۵ھ
مطابق:۱۴/جنوری/۲۰۱۵ء/ بروز بدھ، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۲۶)

عبادت کی حقیقت وفضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: " يَاابْنَ آدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ، أَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى، وَأَسُدَّ فَقْرَكَ، وَإِنْ لَا تَفْعَلْ، مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا، وَلَمْ أَسُدَّ فَقْرَكَ." (ترمذی:۲/۷۰، مشکوة المصابیح/ص:۴۴۰/کتاب الرقاق/ الفصل الثانی) (حدیث قدسی نمبر: ۹)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''حق تعالیٰ کا فرمانِ عظیم الشان ہے کہ ''اے آدم کے بیٹے! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہوجا، تو میں تیرے سینہ کو غنا (دل کی مالداری) سے بھردوں گا، اور تیری غربت وحاجت اور تنگدستی کو دور کردوں گا، اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تیرے دونوں ہاتھوں کو کاموں سے بھردوں گا اور تیری حاجت وتنگ دستی کو بھی دور نہ کروں گا۔''

عبادت زندگی کا مقصد:

اللہ رب العزت نے اس جہاں کو بمنزلۂ مکان کے بنایا، مکان کے لیے فرش اور

چھت ضروری ہے، تو زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنادیا، روشنی کی ضرورت ہوئی تو چاند، سورج اور ستاروں کو روشن کردیا، چوں کہ اس مکان کا اصل مکین انسان ہے، تو اس کی ضرویاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے پہلے آسمان سے بارش برسائی، پھر اِسی زمین سے اس کی ساری ضروریات اور زینت کی چیزوں کو بھی پیدا فرمادیا، جیسا کہ حق تعالیٰ اپنی عبادت کا حکم دینے کے بعد فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ (البقرة:۲۲)

اے انسان! یہ سب کچھ میں نے اپنی قدرت سے کیا، اور صرف تیرے لیے کیا۔ معلوم ہوا کہ اس جہاں میں جو کچھ ہے وہ انسان کے لیے ہے؛ لیکن اس جہاں میں خود انسان کس لیے بھیجا گیا؟ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ اس اہم راز کو قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاريات: ۵٦)

’’میں نے جن وانس کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا۔‘‘ اس جہاں میں وہ اسی لیے بھیجے گئے تاکہ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی میری بے شمار نشانیوں میں غور وفکر سے کام لیتے ہوئے مجھے پہچانیں اور میری نعمتوں سے لطف اندوز ہوکر میرے شکر گزار اور عبادت گزار بنیں۔ دانائے روم نے اسی کی ترجمان فرمائی کہ

ما خلقت الجن والانس بخواں
نیست مقصود جز عبادت از جہاں

یہ ساری کائنات انسان کے لیے سجائی گئی؛ مگر انسان خالقِ کائنات کے لیے پیدا کیا گیا، کائنات کی ساری مخلوق تو انسان کے لیے ہے؛ مگر انسان خالق کائنات کی عبادت کے لیے ہے، اس کا مقصدِ زندگی خالقِ کائنات کی بندگی کے سوا اور کچھ نہیں، اس لیے کہا کسی کہنے

والے نے:

کھیتیاں سر سبز ہیں تیری غذا کے واسطے
چاند، سورج اور ستارے ہیں ضیا کے واسطے
بحر وبر، شمس وقمر، ما و شما کے واسطے
یہ جہاں تیرے لیے اور تو خدا کے واسطے

عبادت کی اہمیت:

عبادت کی اِسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن وحدیث میں ایمان وعقیدہ کی درستی کے بعد سب سے زیادہ تاکید اسی کی آئی ہے؛ بلکہ قرآنِ کریم میں تو ساری زندگی اللہ کی بندگی اور عبادت میں لگے رہنے کی ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر/۹۹)

محبوبم! موت تک اپنے مولیٰ کی عبادت کرتے رہو۔ ساری زندگی ہماری بندگی میں گذاردو، ہماری عبادت سے کبھی فراغت اور غفلت نہ ہو، اپنی امت کو بھی اس کی ہدایت کرو، اس ارشاد کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا:

عَنْ جُبَيْرِبْنِ نُفَيْرٍ رضی اللہ عنہ مُرْسَلًا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنْ أَجْمَعَ الْمَالَ، وَأَكُوْنَ مِنَ التَّاجِرِيْنَ، وَلٰكِنْ أُوْحِيَ إِلَيَّ: أَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ، وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ، وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاتِيَكَ الْيَقِيْنُ."

(رواه فی شرح السنة، مشكوٰة/ص:٤٤٤)

مجھے وحیِ الٰہی کے ذریعہ مال دولت جمع کرنے اور تاجر بن جانے کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی وہ یہی ہے کہ اللہ کی تسبیح وتحمید بیان کرتا رہوں اور ساجدین (یعنی نماز پڑھنے والوں) میں سے ہوجاؤں، اور ساری زندگی اسی کی بندگی کرتا ہوں۔ بقول شخصے: ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

اس راہ میں (یعنی مالکِ حقیقی کی بندگی وعبادت میں) اپنے آپ کو تادمِ آخر (کسی دنیوی نقصان کی پرواہ کیے بغیر پورے طور پر) مشغول رکھو! حالاں کہ ہمارے آقا ﷺ کی تو ساری زندگی مالکِ حقیقی کی بندگی میں گذری؛ مگر اس کے باوجود خاص آپ ﷺ پر یہ وحی بھیجی گئی، تاکہ امت پر عبادت کی اہمیت واضح ہوجائے، اسی لیے عارفین کا قول ہے کہ ”اَلدُّنْیَا سَاعَةٌ، فَاجْعَلْهَا طَاعَةً“، مطلب یہ ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی بہت مختصر اور ایک گھڑی کے مانند ہے، لہٰذا اس عارضی اور مختصر زندگی کو سراپا بندگی والی بنالو! سکونِ زندگی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

عبادت کی حقیقت:

اور واقعہ یہ ہے کہ اگر عبادت کی حقیقت سمجھ میں آجائے اور توفیق الٰہی بھی شاملِ حال ہوجائے، تو اس دنیوی زندگی کو سراپا بندگی بنانا کوئی مشکل امر نہیں؛ بلکہ ہم میں سے ہر کسی کے لیے ممکن ہے، عام طور پر ارکانِ اربعہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی اور زیادہ سے زیادہ ذکر واذکار ہی کو عبادت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اسلامی عبادت کا دائرہ اِن ہی فرض ونفل اعمال کی ادائیگی تک محدود نہیں؛ بلکہ بہت ہی زیادہ وسیع ہے، دیگر مذاہب میں تو عبادات کا دائرہ نہایت ہی تنگ ہے، ان کے یہاں عبادت کا مطلب یہ ہے کہ خاص وقت اور خاص جگہ میں مخصوص انداز کے ساتھ محض موہوم رسوم کو انجام دینا عبادت سمجھا جاتا ہے، اس کی ادائیگی کے بعد بزعمِ خود وہ عبادت کے فرائض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، اس کے بعد چھٹی، اب جو مرضی میں آئے کیجیے گا، جب کہ دینِ اسلام مین مخصوص فرض ونفل اعمال کے علاوہ ہر وہ مباح کام جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشا کے مطابق ثواب کی نیت سے کیا جائے وہ بھی عبادت میں داخل ہے، اس لیے کہ عبادت کی حقیقت عمل بالشریعت ہے،

لہٰذا شریعت (یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتلایا اس) کے کسی بھی حکم پر عمل کرنا اسلام میں عبادت کہلاتا ہے، خواہ اس کا تعلق فرض ونفل عبادت سے ہو یا تجارت سے، زراعت سے ہو یا صناعت سے، سیاست سے ہو یا سیاحت سے، معاملات سے ہو یا معاشرت سے، یعنی شریعت کے حکم کے مطابق اگر ارکانِ اربعہ پر عمل کیا جائے تو وہ عبادت، زراعت وصنعت کی جائے تو وہ عبادت، ملازمت وسیاست کی جائے تو وہ عبادت ہے، غرض زندگی کے جس شعبہ میں شریعت کا جو حکم ہے اس کی اطاعت کا نام عبادت ہے۔

زندگی کا جائزہ اور اُسے سراپا بندگی بنانے کا طریقہ:

اگر مذاہبِ باطلہ کی طرح اسلامی عبادات میں بھی تنگی ہوتی تو اس دنیوی زندگی کو سراپا بندگی بنانا ممکن نہ ہوتا، کیوں کہ اس دنیوی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں جن مخصوص اور فرض اعمال کو عبادت سمجھا جاتا ہے خود ان کی ادائیگی کے لیے بھی بہت ہی کم وقت درکار ہے؛ کیوں کہ ایک انسان کی عمر عموماً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں اس امت کی عمر کے متعلق یہی منقول ہے: ”عُمُرُ أُمَّتِي مِنْ سِتِّيْنَ سَنَةً إِلٰى سَبْعِيْنَ.“ (ترمذی، مشکوٰۃ / ص: ٤٥٠) اور عمرِ مسنون تریسٹھ سال ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص کی عمر ۶۳ سال کی ہے، تو اس میں بچپن کا زمانہ ۱۵ سال تک کا یوں ہی گذر جاتا ہے، کہ اس زمانہ میں بچہ احکامِ شرع کا مکلّف نہیں ہوتا، اور بالغ ہونے کے بعد کا جو دور ہے تو اس میں کسبِ معاش، ملازمت اور کاروبار کے لیے انٹرنیشنل قانون کے مطابق روزانہ دن میں آٹھ گھنٹے تو کم از کم خرچ ہو ہی جاتے ہیں، اور دِن رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں، اس حساب سے اکیس سال کا عرصہ یوں ہی گذر جاتا ہے، اس کے بعد رات میں ڈاکٹری اصول کے مطابق صحت کو بحال رکھنے کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے سونا ضروری ہے، اب اگر ایک انسان روزانہ دِن رات میں کم از کم آٹھ گھنٹے سوئے، تو دوسرے اکیس سال کا عرصہ یوں گذر جاتا ہے، اس طرح دورِ بچپن کے پندرہ سال کے علاوہ بیالیس سال گذر جاتے ہیں،

لہٰذا تریسٹھ سال کی عمر میں ستاون سال تو یوں ہی گذر جاتے ہیں، اب باقی رہے تقریباً چھ سال، تو اس کا بھی اکثر حصہ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے اور رشتہ دار واحباب سے ملنے جلنے میں گذر جاتا ہے، اس طرح زندگی میں مالکِ حقیقی کی بندگی وعبادت کے لیے تو بہت ہی کم وقت ملتا ہے، اور جتنا وقت ملتا ہے تو وہ بھی اکثر غفلت کی نذر ہو جاتا ہے، لیکن قربان جایئے رحمت عالم ﷺ کی ہدایات وتعلیمات پر، واقعی آپ ﷺ نے جو شریعت من جانب اللہ پیش فرمائی اس پر عمل کر کے زندگی کو سراپا بندگی بنایا جاسکتا ہے، ہمارا کمانا، کھانا، اور سونا سب عبادت بن سکتا ہے، بشرطیکہ آپ ﷺ کی ہدایات اور شریعت کے مطابق ہو۔

عبادت میں سہولت اور وسعت:

چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

”مَنُ طَلَبَ الدُّنُيَا حَلَالاً اِسُتِعُفَافاً عَنِ الُمَسُئَلَةِ، وَسَعُياً عَلٰى أَهُلِهٖ، وَتَعَطُّفاً عَلٰى جَارِهٖ، لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى يَومَ الُقِيَامَةِ، وَوَجُهُهٗ مِثُلُ الُقَمَرِ لَيُلَةَ الُبَدُرِ.“

(بیہقی، مشکوٰۃ/ص:۴۴۴/ کتاب الرقاق/الفصل الثالث)

جس نے حلال روزی کی تلاش میں اس لیے کوشش کی تاکہ اپنی اور گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکے، اور پاس پڑوس والوں کے ساتھ حسن سلوک کر سکے، تو یہ شخص قیامت میں حق تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا۔ دوسری حدیث میں فرمایا گیا:

”مَنُ أَكَلَ طَيِّباً، وَعَمِلَ فِيُ سُنَّةٍ، وَ أَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهٗ، دَخَلَ الجَنَّةَ.“

(ترمذی، مشکوٰۃ/ ص:۳۰/ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

”جس نے حلال کھایا اور سنت (وشریعت) پر عمل کیا اور لوگوں کو اپنے نقصان سے مامون رکھا، تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔“ معلوم ہوا کہ حلال کمانا، کھانا اور عیال پر خرچ کرنا یہ سب عبادت ہے، اسی لیے اس پر وعدۂ اجر ہے، اور جب یہ عبادت ہے تو اس میں جتنا وقت

148

صرف ہوگا وہ سب عبادت ہی میں شمار ہوگا۔

اب رہی بات سونے اور آرام کرنے کی، تو اگر انسان مخصوص فرض عبادت کا اہتمام کرلے، تو اس کی برکت سے وہ وقت بھی عبادت میں شمار ہو جائے گا، اس لیے کہ حدیث پاک میں ہے:

”مَنُ صَلّٰى الُعِشَاءَ فِيُ جَمَاعَةٍ، فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصُفَ اللَّيُلِ، وَمَنُ صَلّٰى الصُّبُحَ فِى جَمَاعَةٍ، فَكَأَنَّمَا صَلّٰى اللَّيُلَ كُلَّهٗ.“ (مسلم، مشکوٰۃ/ ص:۶۲/ باب فضائل الصلوٰۃ / عن عثمانؓ)

جس نے نمازِ عشاء کو (مسنون طریقہ سے) باجماعت پڑھا، (پھر کسی گناہ کے بغیر اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر اگر چہ رات بھر سوتا رہا مگر) اُسے آدھی رات کی عبادت کا ثواب دیا جائے گا، اور جس نے نمازِ فجر کو (مسنون طریقہ سے) باجماعت پڑھا تو دوسری آدھی رات کی عبادت کا ثواب دیا جائے گا۔ یعنی ان فرض نمازوں کو اچھی طرح پڑھ کر رات بھر سو بھی جائے، تب بھی اللہ رب العزت رات بھر کی عبادت کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ دین اسلام میں عبادت بہت آسان ہے، اور اس کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، خلاصہ یہ ہے کہ شریعت پر عمل کرنے والے مومن کا ہر عمل عبادت ہے، حتیٰ کہ کمانا، کھانا اور سونا بھی۔

عبادت میں جامعیت:

علاوہ ازیں ایک اور نکتہ پر اگر غور کیا جائے تو روشن ضمیر اور صاحب عقل سلیم پر یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے کہ دین اسلام نے فرض اعمال وعبادات کا جو پاکیزہ نظام اور پروگرام پیش کیا ہے وہ اتنا جامع اور کامل ومکمل ہے کہ اس کی کما حقہ ادائیگی سے ایک انسان بہت سی اچھی صفات اور خصوصیات کا حامل بن سکتا ہے، مثلاً وضو کی برکت سے طہارت و نظافت، نماز کی برکت سے اوقات کی مواظبت (پابندی)، جماعت کی برکت سے اجتماعیت

اور وحدت، روزہ کی برکت سے ضبطِ نفس، زکوٰۃ کی برکت سے مخلوق اور محتاج کی نصرت، نیز حج کی برکت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نیز اسلامی شعائر کی عظمت ومحبت جیسی پاکیزہ صفات اور خصوصیات ایک انسان میں پیدا ہوسکتی ہیں، کیوں کہ ان مخصوص (فرض) اعمال و عبادات میں مجموعی طور پر مذکورہ اوصاف کی تعلیم و ہدایت پائی جاتی ہے، لہٰذا ان کو کماحقہٗ ادا کرنے والا ان اوصاف سے متصف ہوکر صرف ایک اچھا انسان ہی نہیں بلکہ اللہ کا محبوب بندہ بن سکتا ہے۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک چور شاہی محل میں چوری کے ارادہ سے داخل ہوا، اتفاق سے اس وقت بادشاہ بیٹی کی شادی کے بارے میں اپنی بیگم سے مشورہ کررہا تھا، جس میں بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو؛ مگر میں حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنی اکلوتی بیٹی کا نکاح اُسی سے کروں گا جو دیندار، عبادت گزار اور متقی وپرہیزگار ہوگا، چور نے بھی یہ فیصلہ سن لیا، اور اس نے ارادہ کرلیا کہ میں شہزادی سے نکاح کرنے کے لیے بظاہر دیندار، عبادت گزار اور متقی وپرہیزگار بن جاؤں گا، اور اس طرح شادی کے بعد شاہی خزانوں کا مالک بن جاؤں گا، اس پختہ ارادہ کے بعد چوری کیے بغیر وہ واپس لوٹا اور کسی خلوت گاہ میں مشغولِ عبادت ہوگیا حتیٰ کہ ایک عرصہ اسی حالت میں گذر گیا، جس میں تمام اعمال وعبادات کو بتمامہ وکمالہ ادا کیا، تو اللہ کی شان کہ عبادت کی برکت سے اس کی شہرت ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچی کہ شہر کے فلاں مقام پر ایک بہت ہی پارسا، دیندار اور عبادت گزار نوجوان ہے، اس نے ارادہ کرلیا کہ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اپنی بیٹی کا نکاح اسی سے کردوں گا، چنانچہ اس نے تحقیق حال کے بعد اپنے وزیر کو نکاح کا پیغام لے کر بھیجا، جب وزیر نے بادشاہ کی بیٹی کے لیے پیغامِ نکاح پہنچایا، تو حقیقتِ حال بیان کرتے ہوئے اس عابد نے عرض کیا کہ میں نے یہ عبادت کا سلسلہ دراصل اِسی رشتہ کے حصول کے لیے شروع کیا تھا، لیکن اب مجھے اس عبادت کی برکت سے اللہ کی

محبت الحمد للہ نصیب ہوگئی، اس لیے مجھے اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، اس طرح وہ چور عبادت کی برکت سے اللہ کا ولی بن گیا۔ (از: ''منتخب انمول موتی'' ج:۶/ص:۴۶)

عبادت سے غفلت ہلاکت ہے:

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اسلامی عبادات میں سہولت اور وسعت کے ساتھ جامعیت بھی ہے، جس کی برکت سے انسان بہت سی صفاتِ حسنہ سے مزین ہوکر دارین کی صلاح وفلاح کا حامل اور حقدار بن سکتا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی اپنے مقصد زندگی کو بھلا کر عبادت سے غفلت برتے، تو اس کی ہلاکت میں کیا تردد ہوسکتا ہے، رب العالمین نے فرمایا:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ أَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ (المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم نے یہ خیال کیا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے مقصد دنیا میں پیدا کردیا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔'' حقیقت یہ ہے کہ غافلوں کی اس ناسمجھی اور غلط فہمی نے انہیں برباد اور ہلاک کردیا، جس کو قرآن نے دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا:

﴿وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (فصلت:۲۳)

''اور تمہارا یہ گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا اسی نے تمہیں ہلاک کردیا، سو تم خسارہ میں ہوگئے۔'' اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کی مثال تو اس ملازم کی سی ہے جو اپنے مالک کی طرف سے دی ہوئی تمام سہولتوں سے فائدہ بھی اٹھائے اور تنخواہ بھی پوری وصول کرے، لیکن جس کام کے لیے اسے ساری تنخواہ اور سہولیات مہیا کی گئیں اسی کو انجام نہ دے، اور مالک جب اسے کسی کام کا حکم دے تو تعمیل حکم سے انکار کردے، یا بہانے بازی سے کام لے، تو ظاہر ہے کہ یہ ملازم نہ صرف یہ کہ تنخواہ اور سہولیات کا حقدار نہیں؛ بلکہ سزا کا مستحق ہے، بالکل اسی طرح وہ شخص بھی جو عبادت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے غافل ہے، وہ نہ صرف یہ کہ کائنات کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کا حقدار نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا کا مستحق ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

اس کے برعکس وہ شخص جو عبادت کی حقیقت واہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے فرائض اور

واجبات کو ریاءً نہیں؛ بلکہ خالصاً لوجہ اللہ انجام دیتا ہے، تو اس کی مثال اس فرماں بردار ملازم کی سی ہے جس سے اس کا آقا خوش ہو کر مزید انعام واکرام سے نوازتا ہے۔ اس مضمون کو مذکورہ حدیث قدسی میں حق تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ "یَا ابْنَ آدَمَ! تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ" اے آدم کے بیٹے! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہوجا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوجا، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خواہشاتِ نفسانی کو مرضیاتِ ربانی پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوجا، "أَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى، وَ أَسُدَّ فَقْرَكَ." تو میں تیرے سینہ کو غنا کا خزانہ بنا دوں گا، اور تیرے فقر کو بند کردوں گا اور تیری حاجت کو پورا کرنے کا ایسا انتظام کروں گا کہ لوگوں کے جو کام حرج وخرچ کے باوجود بھی نہیں ہوتے وہ کام تیرے بآسانی بلا حرج وخرچ کے بھی ہوجایا کریں گے۔

"وَ إِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا، وَ لَمْ أَسُدَّ فَقْرَكَ."

لیکن یاد رکھنا اے ابن آدم! اگر تو نے اپنا مقصدِ زندگی بھلا دیا اور بس خواہشاتِ نفسانی کی پیروی میں مشغول ومنہمک رہا اور اُسی کے لیے ساری دوڑ دھوپ کی، تو نہ تیری مشغولی ختم ہوگی نہ تنگدستی، نہ ضروریاتِ زندگی، ایک کے بعد دوسری ضرورت وچاہت کا سلسلہ جاری رہے گا، اور اسی میں ساری زندگی ختم ہوجائے گی، پھر سوائے حسرت کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

دانائی وعقلمندی اسی میں ہے کہ آج زندگی میں ہمیں جو یہ گراں قدر اور قیمتی موقع ملا ہے اسے سمجھیں اور مقصدِ زندگی کے مطابق مرضیاتِ الٰہی پر چلیں، تاکہ ہماری یہ زندگی سراپا بندگی بن جائے۔

حق تعالیٰ ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو عبدِ کامل بنا کر ہماری زندگی کو سراپا بندگی بنا دے۔ آمین یا رب العالمین۔

۱۳/ رجب المرجب/ ۱۴۳۵ھ مطابق: ۲۴/ مئی ۲۰۱۳ء/ قبل الجمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۲۷)

لواطت کی مذمت اور نحوست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِيْ عَمَلُ قَوْمِ لُوْطٍ." (رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص: ۱۳۲/ کتاب الحدود/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے اپنی امت کے بارے میں (گناہ پر بے صبری اور خواہشات نفسانی کی وجہ سے) قومِ لوط کے عمل کا بڑا خطرہ ہے۔" (کہ یہ امت بھی کہیں لواطت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب میں مبتلا نہ ہوجائے۔)

لواطت کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے انسان میں فطری اور طبعی طور پر جو دواعی اور تقاضے رکھے ہیں ان ہی میں ایک داعیہ وتقاضہ جنسی (یعنی مرد وعورت کا باہمی جسمانی تعلق) بھی ہے، یہ داعیہ وتقاضا انسان کے لیے صرف لذت وعشرت اور خوشی وشادمانی کا باعث ہی نہیں؛ بلکہ

بقائے نسل انسانی کا سبب بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ جائز طور پر اس جنسی وبشری تقاضے کی تکمیل کو شریعت نے نہ صرف جائز قرار دیا؛ بلکہ اسے عبادت و باعثِ اجر فرما کر اس کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، لیکن اسی کے ساتھ اگر کوئی شخص اس کے لیے غیر فطری اور ناجائز طریقے اختیار کرے تو پھر شریعت نے اس کی نہایت سخت مذمت بھی فرمائی ہے، منجملہ ان کے ایک غیر فطری طریقہ یہ ہے کہ کوئی مرد دوسرے مرد سے (یا پاخانہ کے مقام میں کسی عورت سے، یا دو عورتیں ایک دوسری سے اپنی شہوت وہوس اور) اپنی جنسی خواہش کو پورا کرے، (ویسے مردوں کا باہم شہوت پوری کرنا لواطت اور عورتوں کا باہم شہوت پوری کرنا سحاق کہلاتا ہے) چوں کہ سب سے پہلے اس غیر فطری عمل میں قوم لوط مبتلا ہوئی، (درِ منثور:۳/۱۰۰) پر مذکور ہے کہ قومِ لوط کی عورتیں عورتوں کے ساتھ اور مرد مردوں کے ساتھ ملوث تھے) (''حیااور پاک دامنی'' ص:۲۶۶) اس لیے ''ہم جنس پرستی'' کے اس فعل کو لواطت کہتے ہیں۔

یہ ایسا خبیث عمل ہے کہ انسان تو انسان عام جانور بھی اس بدترین عمل کے قریب نہیں جاتے، چنانچہ مشہور محدث اور امام تعبیر محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ''جانوروں میں بھی سوائے گدھے اور خنزیر کے کوئی جانور قومِ لوط والا عمل نہیں کرتا۔'' (تفسیر درِ منثور:۳/۱۸۷)

لواطت کی ابتدا:

قرآن کریم کی صراحت کے مطابق لواطت کی لعنت میں سب سے پہلے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم مبتلا ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، آپ اپنے مقدس چچا کی طرح عراق میں پیدا ہوئے تھے، اور جب چچا نے وہاں سے بحکمِ الٰہی ہجرت فرمائی تو ان کے ساتھ (بیوی کے علاوہ) حضرت لوط علیہ السلام بھی تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو فلسطین کے علاقے میں آباد ہوئے، اور حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اُردُن کے مرکزی شہر سَدُوم (sodom) میں پیغمبر بنا کر بھیجا، اس کے مضافات میں عمورہ وغیرہ کئی بستیاں آباد تھیں، کفر وشرک کے علاوہ ان بستیوں کی

شرمناک حرکت یہ تھی کہ وہ ہم جنسی (Homosexuddlit) کی لعنت میں گرفتار تھے، جس کا ارتکاب قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق ان سے پہلے دنیا کے کسی فرد نے نہیں کیا تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں اس فعل بد کی مذمت اور نحوست سمجھائی، ارشادِ قرآنی ہے:

﴿ وَ لُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِينَ ﴾ (الأعراف: ۸۰)

کیا تم اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہاں کے کسی شخص نے نہیں کی؟ حضرت لوط علیہ السلام کے بار بار سمجھانے کے باوجود جب یہ لوگ اپنی خباثت ولواطت سے باز نہ آئے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ سزا دی کہ دنیا کی کسی قوم کو ایسی سزا نہیں دی، انہیں ہلاک کرنے کے لیے مختلف عذابوں کو جمع فرما دیا، انہیں زمین میں دھنسا کر ان کی آبادی کو ان پر الٹ دیا گیا۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے گھروں کو جڑ سے اکھاڑ کر آسمان کی طرف اتنا اونچا اٹھایا کہ فرشتوں نے کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے رینکنے کی آواز سنی۔ (''حیاو پاک دامنی'' ص:۲۴۸) پھر آسمان سے پتھر برسائے گئے اور انہیں سنگسار کیا گیا، تاکہ دنیا والے جان لیں کہ ایسے بدبختوں کے لیے تو زمین کے اوپر والے حصے کی نسبت زمین کے اندر والا حصہ ہی بہتر ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''آج بحر میت (Dead Sea) کے نام سے جو سمندر ہے، کہتے ہیں کہ یہ بستیاں یا تو اس میں ڈوب گئی ہیں، یا اس کے آس پاس تھیں، جن کا نشان واضح نہیں رہا۔ (از: ''آسان ترجمۂ قرآن'' /ص:۴۷۰)

لواطت فطرت اور قانونِ قدرت کے خلاف بغاوت ہے:

اتنا سخت عذابِ الٰہی اس بدکاری پر اس لیے نازل ہوا کہ قومِ لوط کا یہ عمل فطرت اور قانونِ قدرت کے خلاف بغاوت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جنسی تسکین کے لیے بیبیوں کو

بنایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ مِنْ آيٰتِهٖٓ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا﴾ (الروم:۲۱)

اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرسکو۔ پھر بیبیوں سے بھی جنسی تسکین کے لیے ان کے جسم کا اگلا حصہ مقرر کیا، فرمایا:

﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ﴾ (البقرة:۲۲۳)

یعنی تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں، لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف کنایہ فرما کر میاں بیوی کے خصوصی ملاپ کے بارے میں چند حقائق بیان فرمائے ہیں، من جملہ ان کے ایک حقیقت تو یہ واضح فرمائی کہ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلۂ کھیتی کے ہیں، ان کے رحموں میں تم (صحبت کے ذریعہ) جو نطفہ ڈالتے ہو وہ تخم اور بیج کے مانند ہے، جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ آج تک پیچھے کے حصہ (دبر) سے کبھی اولاد پیدا نہیں ہوئی، کیوں کہ موضع کاشت عورت کا آگے کا مقام ہی ہے، لہٰذا یہ عمل نسوانی جسم کے اسی حصہ میں ہونا چاہیے جو اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تخم ریزی اسی خاص مقام میں ہو جہاں پیداوار کی امید ہو، یعنی لواطت ہرگز نہ کرو۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا صریح الفاظ میں اس (خلافِ فطرت فعل لواطت) کا ذکر نہ فرمانا غالبًا اس لیے ہے کہ صراحۃً ایسے خبیث وبدترین فعل کا تذکرہ بصورتِ نفی یا بصورتِ نہی بھی حق تعالیٰ نے گوارا نہیں فرمایا۔ (تفسیر انوار البیان: ۱/ ۳۱۸) اور اپنی بیوی کے ساتھ بھی یہ فطرت اور قانونِ قدرت کے خلاف عمل جائز نہیں، حرام اور سخت گناہ ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَتٰى حَائِضًا، أَوِ امْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا، أَوْ كَاهِنًا، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ. "(ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۵۶/باب الحیض)

"جس نے حالتِ حیض میں عورت سے صحبت کی، یا عورت سے پیچھے والے راستہ میں شہوت پوری کی، یا کاہن کے پاس غیب کی باتیں دریافت کرنے کے لیے گیا، تو اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ دین کا انکار کیا۔" اس میں جن تین کفریہ اعمال کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک لواطت بھی ہے۔

لواطت کی نحوست:

دوسری حقیقت آیتِ کریمہ میں نہایت لطیف انداز میں یہ بیان فرمائی کہ جب تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں جن کے رحم میں تم اپنے بیج ڈالتے ہو، تو ظاہر ہے کہ پھر تمہارے جنسی ملاپ کا مقصد محض لطف اور لذت حاصل کرنا نہ ہو؛ بلکہ اسے نسل انسانی کی بڑھوتری کا ذریعہ سمجھنا چاہیے، جس طرح کاشتکار اپنی کھیتی میں بیج ڈالتا ہے تو اس کا اصل مقصد پیداوار کا حصول ہوتا ہے، اسی طرح یہ جنسی ملاپ بھی دراصل نسل انسانی کو باقی رکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اس کے برخلاف لواطت والا عمل نسل انسانی کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے، کیوں کہ لوطی شخص اپنے نطفہ کو ایسی جگہ ڈالتا ہے جہاں نسل بڑھنے کا امکان ہی نہیں، لہٰذا اس خلافِ فطرت فعل کے مجرم اللہ رب العزت کی دی ہوئی امانت (قوت) میں خیانت کے بھی مرتکب ہیں، اس اعتبار سے انہیں لواطت کے گناہ کے ساتھ ساتھ نسل کشی یعنی نسل انسانی کو ضائع کرنے کا گناہ بھی ہوتا ہے، واقعی لواطت بہت ہی خطرناک جرم ہے، حتیٰ کہ علماء نے اس کی نحوست زنا سے بھی زیادہ بیان فرمائی ہے، حالاں کہ گناہِ کبیرہ دونوں ہیں؛ مگر زنا کے مقابلہ میں لواطت کی شناعت، مذمت اور نحوست زیادہ سخت ہے، اور وہ اس طرح کہ زنا کے لیے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً﴾ (الإسراء:۳۲) اس میں

"فَـاحِشَةً" کا لفظ نکرہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زنا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ تو ہے، مگر اس میں مرد وزن کا ملاپ ہوتا ہے، جو ایک اعتبار سے فطری تقاضا کہا جا سکتا ہے؛ لیکن اس کا یہ طریقہ ناجائز ہے، جب کہ لواطت کے لیے قرآن کریم نے ﴿أَتَـأْتُـونَ الْـفَـاحِشَةَ مَـا سَبَـقَـكُـمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الأعراف: ۸۰) فرمایا، اس میں "الـفَـاحِشَةَ" کا لفظ معرفہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لواطت تقاضائے فطرت اور قانونِ قدرت کے خلاف ایسا جرم ہے کہ اس جیسا جرم پہلے کبھی نہیں ہوا۔

پھر زانی کو قرآنِ کریم میں خبیث فرمایا (النور: ۲۶) جب کہ لوطی کے لیے قرآنِ کریم میں متعدد برے الفاظ استعمال کیے، مثلاً:

(۱) "فَاسِقِيْنَ".
﴿إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۷۴)
(۲) "مُفْسِدِيْنَ":
﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (العنكبوت: ۳۰)
(۳) "ظَالِمِيْنَ":
﴿إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴾ (العنكبوت: ۳۱)
(۴) "مُسْرِفُوْنَ":
﴿بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾ (الأعراف: ۸۱)
(۵) "عَادُوْنَ":
﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ﴾ (الشعراء: ۱۶۶)

جیسے لفظ استعمال کیے گئے، نیز حدیثِ پاک میں زانی پر ایک مرتبہ لعنت کی گئی، جب کہ لوطی پر تین مرتبہ لعنت کی گئی:

قَـالَ رَسُـوْلُ الـلّٰهِ ﷺ ثَلَاثًا: "لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ." (مسند

أحمد: ۱/۳۱۷) (مستفاد از: "حیا اور پاک دامنی"/ص: ۲۵۰)

ان حقائق سے ثابت ہوا کہ لواطت کی نحوست نہایت ہی سخت ہے، اس لیے تمام ہی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لواطت حرام اور سخت گناہِ کبیرہ، غیر اخلاقی، غیر انسانی، غیر مذہبی اور غیر فطری عمل ہے۔

لواطت کے دنیوی اور اُخروی نقصانات:

صاحبو! کتاب وسنت میں لواطت کے دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کے بہت سے نقصانات وارد ہوئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے جنسی، دینی اور اخلاقی انحراف پیدا ہوتا ہے، اور انسان انسانیت کے درجہ سے گر کر جانوروں اور چوپایوں کے درجہ سے بھی نیچے پہنچ جاتا ہے، دوسرے یہ کہ فاعل ومفعول کے دلوں سے شرم وحیا اور ادب ومروّت کا جنازہ نکل جاتا ہے، نیز اس سے سماج اور سوسائٹی میں بہت سی مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، علاوہ ازیں یہ عمل غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والا ہے، ان مضرتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس خلافِ فطرت کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی زمین پر زندہ رہنے کا کوئی حق ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ حدیثِ پاک میں رحمتِ عالم ﷺ نے اس برائی کا ارتکاب کرنے والے مجرمین کو قتل کرنے کا حکم فرمایا:

عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ، فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ." (رواه الترمذي وابن ماجه، مشكوٰة/ص: ۳۱۲)

یعنی ان دونوں کو (اسلامی حکومت میں حاکمِ وقت) قتل کر دے۔

مشکوۃ شریف میں امام رزینؒ کی ایک روایت ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ -رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا- "أَنَّ عَلِيًّا أَحْرَقَهُمَا، وَأَبَا بَكْرٍ هَدَمَ عَلَيْهِمَا حَائِطًا." (مشكوة/ص: ۳۱۳)

حضرت علیؓ نے لواطت کرنے اور کرانے والے کو بطورِ سزا جلا دیا تھا، اور حضرت ابو بکرؓ نے ان دونوں پر دیوار گرا دینے کا حکم دیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے سیدنا صدیق اکبرؓ کو خط لکھا کہ بعض علاقوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بد فعلی کرتے ہیں، میں کیا کروں؟ صدیق اکبرؓ نے خط پڑھ کر اس معاملہ میں حضرات صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، جس میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کو قوم لوط کے سوا کسی نے نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا وہ آپ کو معلوم ہے، لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو جلا دیا جائے، چنانچہ صدیق اکبرؓ نے اسی کا حکم فرمایا۔

(رواه البیهقی فی شعب الإیمان/ ج:٤/ص:٣٥٧)

لواطت کی سخت قباحت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ رب العزت ایسے لوگوں کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں فرماتے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلٰى رَجُلٍ أَتٰى رَجُلًا، أَوِ امْرَأَةً فِی دُبُرِهَا. " (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:٣١٣)

ایک روایت میں ہے کہ لواطت کرنے والوں کو قیامت کے دِن قومِ لوط میں شامل کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص جس حالت میں فوت ہوتا ہے اسی حالت میں قبر سے نکالا جائے گا، حتیٰ کہ لوطی نکالا جائے گا تو اس حالت میں کہ اس کا آلۂ تناسل اپنے ساتھی کی دُبر میں ہوگا، جس کی وجہ سے یہ دونوں قیامت میں تمام مخلوق کے سامنے رُسوا ہوں گے۔ (از: "عشق مجازی کی تباہ کاریاں"/ص:۱۲۳) العیاذ باللہ العظیم۔

لواطت کے اِن ہی دنیوی اور اخروی نقصانات کی وجہ سے حدیثِ مذکور میں رحمت عالم ﷺ نے یہ اندیشہ ظاہر فرمایا کہ "إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلٰى أُمَّتِی عَمَلُ قَوْمِ لُوْطٍ. " مجھے اپنی امت میں سب سے زیادہ خطرہ قومِ لوط کے عمل (لواطت) کا ہے۔ گویا

آپ ﷺ اس فرمان سے پیش بندی اور پابندی لگانا چاہتے ہیں کہ میرا اُمتی اس طرف ہرگز رُخ نہ کرے کہ یہ دنیوی اور اُخروی ہر اعتبار سے ایسی برائی ہے جس سے دونوں جہاں میں تباہی اور بربادی مقدر بن جاتی ہے۔

قرآن وحدیث میں اس خلافِ فطرت گناہ کی دنیوی واُخروی سخت سزائیں امت کو اس سے روکنے کے لیے بیان کی گئیں، اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا منشا یہ ہے کہ لوگ ایسی برائی کی مذمت کا احساس کر کے اس سے بچنے کی پوری کوشش اور تدبیر کریں۔

لواطت سے حفاظت کی تدابیر:

علماء نے فرمایا کہ لواطت سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ جو اس گناہ تک پہنچنے کے اسباب ودواعی ہیں ان سب سے الگ تھلگ رہنے کی سعی اور کوشش کی جائے، من جملہ ان کے خلوت بالامرد سے احتیاط واجتناب بھی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"لَا يُفْضِی الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ، وَلَا تُفْضِی الْمَرْأَةُ إِلَى الْمَرْأَةِ فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ. " (مسلم، مشکوٰۃ/ص: ٢٦٨)

ایک مرد دوسرے مرد اور ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک ہی کپڑے (اور بستر) میں نہ لیٹے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث شریف کے تحت فرماتے ہیں کہ ایک کپڑے (چادر، بلینکیٹ وغیرہ) میں لیٹنے، سونے سے اس لیے منع فرمایا کہ اس سے جنسی میلان میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس سے کبھی کبھی لواطت کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ علامہ رازیؒ نے بھی اسی حدیث شریف کو دلیل بنا کر فرمایا کہ "دو مردوں (وعورتوں) کا ایک ساتھ سونا، لیٹنا جائز نہیں، اگرچہ دونوں بستر کے مختلف کنارے پر ہی کیوں نہ ہوں۔ (تفسیر کبیر ج:٦/ ۲۵۹) یہ حکم نفسیات کے بالکل مطابق ہے۔

غالباً اِن ہی وجوہات کی بنیاد پر حدیثِ پاک میں حکم دیا گیا کہ جب بچوں کی عمر دس سال کی ہو جائے تو ان کے بستر علیٰحدہ کر دو:

"فَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ"(أبوداوٗد/ص:۱۵۹، مشکوٰۃ : ۵۸)

کہ عمر کے اس حصہ سے انسان میں جنسی میلان کی کچھ سوجھ بوجھ شروع ہو جاتی ہے، اور جب حقیقی بھائی بہنوں کو احتیاطاً ایک ساتھ سونے سے منع کیا گیا تو اجنبی کے لیے بدرجۂ اولیٰ ممانعت ثابت ہوگی۔

دورِ حاضر میں اس ہدایت پر بطورِ خاص عمل کرنا چاہیے کہ اس دور میں ایسی چیزوں کی کثرت ہے جو جنسی میلان کو مشتعل کرتی رہتی ہیں، اور کم وبیش ہر شخص پر اس کا اثر بھی پڑتا رہتا ہے۔

ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بہت اہتمام تھا، حضرت سفیان ثوریؒ ایک مرتبہ حمام گئے تو ایک خوبصورت کم سن بچہ کو دیکھا، تو فرمایا: اس (امرد) کو جلدی سے ہٹاؤ، کیوں کہ عورت کے ساتھ تو عموماً ایک شیطان ہوتا ہے؛ لیکن خوبصورت لڑکوں کے ساتھ دس سے زائد شیطان ہوتے ہیں، لہٰذا فتنہ کا زیادہ اندیشہ ہے۔

حسن بن ذکوان فرماتے ہیں کہ مالداروں کے لڑکوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ بالکل نہ کرو، وہ کنواری لڑکیوں کی طرح عموماً خوبصورت ہوتے ہیں، عورتوں سے زیادہ ان میں فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (شعب الایمان/ ج:۴/ص:۳۵۸)

دوسری تدبیر لواطت سے حفاظت کی یہ ہے کہ خلوت بالامرد سے احتیاط واجتناب کے علاوہ ان کی طرف دیکھنے سے بھی احتیاط کی جائے، اس لیے کہ امردوں کے حسن کو بعض بزرگوں نے عورتوں کے حسن پر ترجیح دی ہے، روایت میں آتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں قبیلۂ عبدالقیس کا وفد پہنچا، اس میں کچھ حسین امرد بھی تھے، تو آپ ﷺ نے ان کو پیچھے بٹھایا اور فرمایا کہ "داود علیہ السلام کی قوم کا فتنہ "دیکھنا" ہی تھا۔ (کتاب الکبائر: ۵۹، بحوالہ: دیلمی)

امرد اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی ڈاڑھی ابھی نہ نکلی ہو، مونچھ آرہی ہو۔ بعض علماء

تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اگر امرد حسین ہو تو عورتوں کے حکم میں ہے، یعنی سر سے پاؤں تک اس کا جسم بھی ستر کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کی طرف دیکھنے سے احتیاط کرنا چاہیے، خصوصاً جب کہ شہوت کا اندیشہ ہو۔ (شامی)

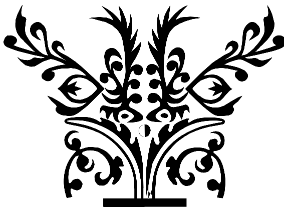
عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ان دو تدابیر کے ساتھ دعا کا اہتمام بھی کریں، یہ بھی ایک بہترین تدبیر ہے، افسوس کہ آج بعض ممالک میں اس منحوس عمل کو سندِ جواز دے دی گئی ہے۔

نہ مرد میں رہی شرم، نہ عورت میں رہی حیا
خواہش نفس نے انسان کو حیوان بنادیا

حق تعالیٰ اس منحوس عمل سے ہماری اور قیامت تک کی ہماری نسلوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۷/صفر ۱۴۳۵ھ
مطابق: ۱۰/ دسمبر/ ۲۰۱۵ء، بروز جمعرات، بزم صدیقی، بڑودا
(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۲۸)

دعوت کو مؤثر بنانے کے پانچ پیغمبرانہ اصول

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ النُّعۡمَانِ بۡنِ بَشِيۡرٍؓ قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ يَخۡطُبُ، فَقَالَ: "أَنۡذَرۡتُكُمُ النَّارَ، أَنۡذَرۡتُكُمُ النَّارَ، فَمَازَالَ يَقُوۡلُهَا، حَتّٰى لَوۡ كَانَ فِيۡ مَقَامِيۡ هٰذَا، سَمِعَهٗ أَهۡلُ السُّوۡقِ، وَحَتّٰى سَقَطَتۡ خَمِيۡصَةٌ كَانَتۡ عَلَيۡهِ عِنۡدَ رِجۡلَيۡهِ." (رواه الدارمي، مشكوٰة/ص:٥٠٤/ باب صفة النار وأهلها/ الفصل الثاني)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو خطبہ کے دوران یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اے لوگو! میں تمہیں آگ سے ڈرا رہا ہوں، اے لوگو! میں تمہیں آگ سے ڈرا رہا ہوں، آپ ﷺ اس جملہ کو بار بار دہراتے رہے، یہاں تک کہ اگر آپ ﷺ میری اس جگہ میں ہوتے تو تمام بازار والے اس کو سن لیتے، آپ ﷺ نے اس جملہ کو اس قدر دہرایا کہ آپ ﷺ کی اوڑھی ہوئی چادر مبارک آپ ﷺ کے

قدموں پر گر پڑی۔

دعوت الی اللہ دنیا کا بہترین کام:

اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کا راستہ بتانا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف آنے کی دعوت دینا اس دنیا کا سب سے عظیم اور بہترین کام ہے:

﴿ وَمَنۡ أَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَآ إِلَى اللّٰهِ﴾ (حم السجدة:٣٣)

اور اس شخص سے زیادہ بہتر (کام و) کلام اور کس کا ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے۔ معلوم ہوا کہ دعوت الی اللہ دنیا کا بہترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ کے سب سے بہترین اُن افراد کا انتخاب فرمایا جنہیں حضرات انبیاء ورُسل کہا جاتا ہے، اور حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی سب سے معتبر تاریخ قرآن کریم ہے، ان کے متعلق قرآن کا اعلان ہے:

﴿ شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِيۡٓ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ وَ مَا وَصَّيۡنَا بِهٖٓ إِبۡرٰهِيۡمَ وَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰٓى أَنۡ أَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الۡمُشۡرِكِيۡنَ مَا تَدۡعُوۡهُمۡ إِلَيۡهِ﴾ (الشورى:١٣)

ترجمہ: اس نے تمہارے لیے (اسی) دین (اور اس کی دعوت) کا وہی طریقہ رکھا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جو ہم نے تمہارے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے، اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ (اپنے قول وعمل اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ) دین قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، (پھر بھی) مشرکین کو وہ بات بہت گراں گذرتی ہے جس کی طرف آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ أَنۡذِرُوۡٓا أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاتَّقُوۡنِ﴾ (النحل:٢)

ترجمہ: میرے پیغمبرو! لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو۔ (کسی اور سے نہیں)

قرآنی گواہی کے مطابق حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی زندگی کا بنیادی مشن دین کی دعوت تھا، اسی کے لیے ان کی ساری فکر، بےقراری، جدوجہد اور تگ ودو ہوتی تھی، لہٰذا دین کی دعوت اس اعتبار سے بھی دنیا کا بہترین کام ہے کہ یہ کارِ نبوت ہے، حق تعالیٰ نے نبوت کو تو خاتم النبیین ﷺ پر ختم فرما دیا، لیکن کارِ نبوت کو ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے جاری رکھا، جس کا اعلان صاحبِ قرآن ﷺ سے اس طرح کروایا:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ﴾ (یوسف: ۱۰۸)

ترجمہ: کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ دعوت الی اللہ دیتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی (اسی کارِ نبوت کو انجام دیتے ہیں)۔

دعوت الی اللہ کارِ نبوت ہے، لہٰذا اُسے نہجِ نبوت کے مطابق کیا جائے:

اور جب یہ کارِ نبوت ہے تو ضرورت ہے کہ اسے نہجِ نبوت کے مطابق کیا جائے، کیوں کہ یہ کام نہجِ نبوت کے مطابق ہوگا تو ہدایت عام ہوگی، اور اگر کارِ نبوت نہجِ نبوت کے مطابق نہ ہوگا تو اس کے کما حقہ نتائج وفوائد حاصل نہ ہوں گے۔ جس طرح تجارت تاجرانہ اور حکومت حاکمانہ مزاج کے بغیر نہیں چل سکتی، اسی طرح نبوت والا یہ عظیم کام بھی نہجِ نبوت کے بغیر مفید اور مؤثر نہیں ہوسکتا، دعوت کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں؛ لیکن اسے مزید مؤثر ومفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر اس کارِ عظیم کو ان ہی طریقوں اور اصولوں کے مطابق انجام دیا جائے جن کے مطابق حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام نے انجام دیا۔ آج ہماری دعوت وتبلیغ کا کوئی خاص اثر اور نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا، تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دعوت کے پیغمبرانہ اسلوب واصول کو ترک کر دیا ہے۔

مفسر قرآن مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بقول: ''پیغمبرانہ

دعوت کے بنیادی اصول پانچ ہیں، جن کو اختیار کرکے ہم اپنی دعوت کو مزید مؤثر اور مفید بنا سکتے ہیں۔'' (مستفاد از: ''مفتیٔ اعظم نمبر'')

اصلاحِ امت کی فکر:

پیغمبرانہ دعوت کا پہلا بنیادی اصول جس کے بغیر دِل میں دعوت کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوسکتا وہ اصلاحِ اُمت کی صحیح اور سچی فکر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ غلط راہ اور گمراہی پر چلنے والی امت کس طرح راہ یاب ہوجائے، اس کا جذبہ دِل میں پیدا ہوجائے، اس کے لیے پہلے امت پر نظر، پھر اصلاحِ امت کی فکر، اس کے بعد دعا اور دعوت کے ذریعہ کوشش کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کا یہی حال تھا، ان کو اصلاحِ امت کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ ہوتی تھی کہ وہ دن رات اُسی کی جدوجہد اور دعوت میں لگے رہتے تھے، وہ اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہوتے تھے، اس کے باوجود جب اکثر امت نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا؛ بلکہ قولاً وعملاً انکار کیا، تو انہوں نے بےچین ہوکر رب العالمین سے فریاد کی، جیسا کہ قرآن کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا وَ اِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾ (نوح: ۵-۶-۷)

ترجمہ: آپ نے عرض کیا: میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دِن دعوت دی ہے، لیکن میری دعوت کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ وہ اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے ان کو جب جب بلایا تاکہ تو ان کو معاف کردے، تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال دیں اور اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹے اور ضد کی اور بڑا غرور کیا۔

ابتداءً جب داعیٔ اعظم رحمت عالم ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ چند خوش

نصیب افراد واصحاب کے علاوہ اکثر مشرکین نے اعراض وانکار کیا، تو ہمارے آقا ﷺ بھی بہت ہی غم زدہ اور بے قرار ہوگئے کہ یا اللہ! میں دِن رات، خلوت، جلوت اور خوشی وغمی میں ہدایت کی دعوت دیتا ہوں، پھر بھی اکثر لوگ اسے کیوں قبول نہیں کرتے۔ جب اس فکر میں آپ ﷺ گھلنے لگے تب حق تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی:

﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴾ (الشعراء : ۳)

ترجمہ: شاید آپ اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جا رہے ہیں کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے۔

آپ ﷺ کو اصلاحِ امت کی فکر نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا، لوگوں کے گھروں پر جا کر ان کے دِرِدل پر دستک دیتے تھے، اس کے باوجود جب ہٹ دھرموں نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہ کی تو آپ ﷺ کو بہت ہی فکر ہوئی، اس پر مزید آپ ﷺ کو تسلی دی گئی:

﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ (الغاشية : ۳۳)

ترجمہ: میرے محبوب! آپ ان پر داروغہ تو نہیں۔

آپ سے مطالبہ دعوت الی اللہ کا ہے، اس کے ثمرہ اور نتیجہ کا نہیں، اس لیے آپ کا فریضہ تو صرف دعوت وتبلیغ کرنے سے ادا ہو جاتا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبی علیہ السلام کو اصلاحِ امت کی کتنی فکر تھی، اور جب تک امت پر رحم کی نظر اور ان کی اصلاح کی فکر دل میں نہ ہو دعوتی جذبہ بیدار نہیں ہوسکتا، ہر نبی کے دل میں اصلاحِ امت کی فکر تھی، تو جس طرح ہر نبی کو اصلاح امت کی فکر تھی، اسی طرح داعی کو بھی اصلاحِ امت کی فکر ہونی چاہیے، دعوت کو مؤثر بنانے کا یہ پہلا پیغمبرانہ اصول ہے، اب جس کو اصلاحِ امت کی فکر کا جتنا حصہ نصیب ہوگا اس کی دعوت میں اتنا ہی اثر ہوگا۔

دعوت کی لگن:

اور جب اصلاح امت کی صحیح فکر دل میں ہوگی، تو اس سے دعوت کی لگن اور تڑپ خود بخود پیدا ہوگی، اور دعوت کو مؤثر بنانے کا دوسرا پیغمبرانہ اصول ہے: ''دعوت کی لگن اور تڑپ'' یہ اسی کا اثر تھا کہ تمام انبیاء ورُسُل علیہم السلام نتائج کی پرواہ کیے بغیر لگاتار دعوت میں مشغول رہتے تھے، اور جب بھی جہاں بھی اور جس کو بھی دعوت دینے کا موقع مل جاتا اسے غنیمت سمجھتے۔

جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ آپ مدت سے عزیزِ مصر کی قید میں محبوس تھے، وہاں بظاہر آپ کا کوئی ہم نوا بھی نہیں تھا، اس حالت میں جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں تھا؛ لیکن آپ نے ان کے جواب کے بارے میں پہلے تو انہیں مطمئن کر دیا:

﴿ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ﴾ (یوسف: ۳۶)

ترجمہ: فرمایا: جو کھانا تمہیں قید خانہ میں دیا جاتا ہے وہ ابھی آنے نہیں پائے گا کہ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔

پھر آپ نے اپنا مرتبہ ومقام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر ہونے والے انعام کا تذکرہ کرنے کے بعد دعوت کا حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ (یوسف:۳۹)

اے قید کے ساتھیو! کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں، یا وہ ایک اللہ جس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔

یعنی اس طرح خواب کی تعبیر سے پہلے تبلیغ فرمائی، سیرتِ نبی ﷺ میں بھی ایسے بہت سے مواقع ملتے ہیں جن میں آپ ﷺ نے موقع ملتے ہی اسے غنیمت سمجھتے ہوئے دین کی دعوت دی۔

مثلاً حدیثِ پاک میں ہے کہ ایک یہودی لڑکا آپ ﷺ کی خدمت میں آیا کرتا تھا، ایک مرتبہ آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہوگیا ہے، تو آپ ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اور اس کے پاس سرہانے بیٹھ کر اسے دین کی دعوت دینے لگے، اس نے اپنے والد کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا، جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، وہ بولا: ''تم ابوالقاسم ﷺ کی بات مان لو۔'' اس پر وہ مسلمان ہوگیا، تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا۔ (رواه البيهقي في دلائل النبوة، مشكوٰة/ ص:۵۱۸/باب أسماء النبي وصفاته)

اس طرح آپ ﷺ کا عیادت کے موقع پر بھی دعوت پیش کرنا یہ داعیانہ تڑپ اور لگن کی بات تھی، جس طرح نبی علیہ السلام کو دعوت کی لگن تھی اسی طرح داعی کو دعوت کی لگن ہونی چاہیے، دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ داعی کو چاہیے کہ ہر وقت دعوت کے موقع کی تلاش میں رہے، جب موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھا کر دعوت پیش کرے، اور کسی مرحلے پر تھکنے یا اُکتانے کا نام نہ لے، جب داعی میں نبیوں کی طرح یہ تڑپ اور لگن ہوگی تو ان شاء اللہ اس کی دعوت میں سہولت اور برکت ہوگی۔

مخاطب پر شفقت:

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی لگن کے نتیجہ میں موقع کی تلاش کے بعد جب کبھی کسی داعی کو موقع مل جائے تو اپنے مدعو اور مخاطب کو نہایت شفقت کے ساتھ دعوت پیش کرے، اس لیے کہ دعوت کو مؤثر بنانے کا تیسرا پیغمبرانہ اصول ''مخاطب پر شفقت'' ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے دل میں دعوت وتبلیغ کا جذبہ اور داعیہ امت پر شفقت ہی کے نتیجہ میں منجانب اللہ پیدا ہوا تھا، ان کے دل میں امت کی شفقت تھی، اسی لیے تو وہ ان کو ہدایت کی دعوت دیتے تھے، تاکہ وہ ضلالت سے بچ جائیں۔ جس کا اشارہ قرآن کریم میں نبیوں کے لیے استعمال ہونے والے ایک لفظ "نَذِيْرٌ" سے ملتا ہے، چنانچہ فرمایا گیا:

﴿ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر:۲۴)

''اور کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔'' خود ہمارے آقا ﷺ کے لیے اسی آیت میں اور اس کے علاوہ کئی مقامات پر اسی لفظِ نذیر کو اختیار فرمایا، نیز حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے آقا ﷺ دعوت دیتے ہوئے اِسی لفظ کو بار بار دہراتے، جس کا لفظی ترجمہ ہے: ''ڈرانا''، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی میں "إِنْذَار" یا "نَـذِيْرٌ" اُس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا مقصد دوسروں پر شفقت ہو۔ جیسے ایک باپ یا بڑا اپنے چھوٹے کو کسی نقصان سے ڈراتا ہے تو اس میں شفقت کا پہلو ہوتا ہے، یہی بات لفظِ "إنذار" اور "نذير" میں بھی ہے۔ عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی بستی کے قریب یا سفر میں جب کہیں پڑاؤ ڈالتے تو کسی اونچے ٹیلے یا پہاڑی پر ایک نگہبان مقرر کر دیتے، جو چاروں طرف نگاہ رکھتا جونہی اسے کسی جانب سے دشمن کے خطرے یا حملے کا اندیشہ ہوتا، وہ لوگوں کو آگاہ کر دیتا، جس کی وجہ سے لوگ اس کے شکر گزار ہوتے کہ تم نے خطرۂ مستقبل سے ہمیں آگاہ کر دیا، ورنہ دشمن بے خبری میں ہمیں تباہ وتاراج کر دیتا، اس نگہبان کو ان کی اصطلاح میں "النذير العريان" کہا جاتا تھا، قرآنِ کریم نے اس کی عریانیت ختم کر کے نبی کے لیے لفظ "نذير مبين" استعمال کیا، اور واضح کر دیا کہ یہ نبی تمہارے لیے نذیرِ عریاں بلکہ اس سے زیادہ خیر خواہ اور شفقت والا ہے، کہ اس نے تمہیں کفر وشرک کے نتیجہ میں آنے والے دارین کے خطرات سے وقت سے قبل ہی آگاہ کر دیا، لہٰذا تمہیں بھی اس کا احسان مند ہونا چاہیے اور اس کی دعوت کو قبول کرنا چاہیے، یہ نبی تمہارے بدخواہ نہیں؛ بلکہ بہی خواہ ہیں، ان کی دعوت کا مقصد شفقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا، تو جس طرح نبی میں شفقت ہوتی ہے، اسی طرح داعی میں بھی شفقت ہونی چاہیے، اور جس طرح ایک طبیب اور ڈاکٹر کو یہ حق نہیں کہ وہ مریض سے نفرت کرے، ایسے ہی داعی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ سخت سے سخت کافر وفاجر سے بھی نفرت کرے، نفرت ان کے افعال سے ضرور ہونی چاہیے، ذات سے نہیں، جب یہ بات داعی میں پیدا ہوگی تو مدعو کو شفقت کے ساتھ دعوت دینا آسان ہوگا اور اس دعوت میں اثر بھی ہوگا۔

دعوت مع الحکمت:

جب داعی کے دل میں اصلاحِ امت کی فکر، دعوت کی تڑپ اور لگن کے ساتھ مدعو اور مخاطب پر شفقت کا جذبۂ صادقہ پیدا ہوجاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں دعوت کے طریقے القاء فرماتے ہیں، اور اسے من جانب اللہ یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس کے سامنے کس طرح بات کہی جائے، اِسی کو دعوت مع الحکمت کہتے ہیں، جو دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے چوتھا پیغمبرانہ اصول ہے، ہر نبی نے نہایت حکمت کے ساتھ اپنی امت کو دعوت دی، دعوت کا اسلوب اور طریقہ یہی ہے کہ مدعو اور مخاطب کے مزاج اور قوتِ استعداد کو سامنے رکھ کر دعوت پیش کی جائے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بیان فرمایا کہ جب آپؑ نے نمرود کو اللہ کی عظمت سمجھا کر دعوت دی، تو وہ بھی حقیقت جانتا تھا؛ لیکن چوں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کرنا چاہتا تھا، اس لیے حجت پر اُتر آیا، اس موقع پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نہایت حکیمانہ طریقے سے سمجھا کر دعوت پیش فرمائی:

﴿ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ (البقرة : ۲۵۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تو یقیناً اللہ تعالیٰ سورج کو (روزانہ) مشرق سے نکالتے ہیں، تو اس کو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال۔

معلوم ہوا کہ حکمت یہ دعوت کا خاص اسلوب اور طریقہ ہے، جس کا حکم داعیٔ اعظم ﷺ کو دیتے ہوئے خالق عالم نے فرمایا:

﴿ اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل : ۱۲۵)

اے میرے محبوب! آپ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیجیے۔

اس آیت کریمہ میں دعوت کے دو اہم اسلوب واصول بیان فرمائے گئے، جو تمام انبیاء علیہم السلام کے یہاں مشترک تھے، پہلا اصول یہ ہے کہ دعوت مع الحکمت ہو، یہ حکم تو داعیٔ اعظم ﷺ کو ہے، لیکن آپ ﷺ کے توسط سے ساری امت کے دعاۃ کو حکم فرمادیا کہ تبلیغ سے پہلے تدبیر سوچیے، پھر موقع دیکھ کر دعوتِ اسلام واحکام کو نہایت آسان کر کے دل نشیں انداز میں، مثلاً دعوتِ اسلام واحکام قبول کرنے کے فضائل وفوائد اور نہ کرنے کے مفاسد، ہمدردی ودلسوزی کے ساتھ بیان کرے، یہی حکمت کا تقاضا ہے، ہر نبی نے دعوت کے لیے اسی اسلوب کو اختیار کیا، اس لیے ہر داعی کے لیے بھی اسی اسلوب کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

موعظتِ حسنہ:

دعوت کو مؤثر بنانے کا پانچواں پیغمبرانہ اصول ''موعظتِ حسنہ'' ہے، جس کا حکم مذکورہ آیتِ کریمہ میں ''والموعظة الحسنة'' کے ذریعہ دیا گیا۔ یہ لفظ بھی بہت جامع ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو کی ہمدردی وخیر خواہی کے پیش نظر نرمی اور ناصحانہ انداز میں دعوت پیش کرے، تاکہ مدعو کا دِل قبولیت کے لیے نرم ہوجائے۔ اسی کا حکم رب العالمین نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے دیا تھا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ: ۴۴) یعنی فرعون سے نرم بات کرو، شاید وہ سمجھ لے، یا ڈر جائے۔ یہ اصول بھی داعیٔ حق کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے، کیوں کہ ہمارا مدعو فرعون سے بڑا گمراہ تو نہیں ہوسکتا، اور ہمارے داعی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہوسکتے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے مصلحِ عظیم اور داعیٔ کبیر کو فرعون جیسے سرکش کافر سے جس کی موت بھی علم الٰہی کے مطابق بحالتِ کفر ہونے والی تھی، اس سے بھی نرم بات کرنے کا حکم دیا، تو ہما شما کی کیا حقیقت ہے؟ کہ مخاطب اور مدعو سے سخت کلامی کریں، اسی لیے علماء نے فرمایا کہ فرقِ باطلہ کی تردید کے لیے بھی ''الموعظة الحسنة'' اور

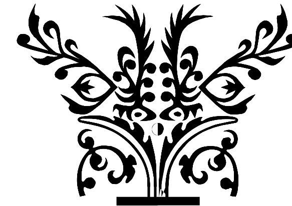
"جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِيَ أَحْسَنُ" کے اصولوں پر عمل ضروری ہے۔ کیوں کہ عاجز کے خیالِ ناقص میں دِل آزاری ودِل شکنی کے ساتھ کبھی دِل نہیں جیتے جاسکتے۔ اور جو دعوت ان پانچ پیغمبرانہ اصول سے ہٹ کر ہوگی وہ نہ مفید ہوگی نہ مؤثر؛ بلکہ وہ دعوت عداوت کا موجب بنے گی۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور ہمیں سچا داعی بنا کر سارے عالم میں اپنی رضا کے ساتھ موت تک قبول فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

۹/صفر المظفر /۱۴۳۵ھ
مطابق: ۱۳/ دسمبر/۲۰۱۳ء/قبل الجمعہ، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۲۹)

بیان وخطابت کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی قَالَ: قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا، فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْراً." (رواه البخاري، مشكوٰة/ص: ۴۰۹/ باب البيان والشعر/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مشرق کی جانب سے (وفد بنوتمیم کے) دو شخص آئے اور انہوں نے بیان کیا، تو لوگوں کو ان کی فصاحت وخطابت پر بڑا تعجب ہوا، اس موقع پر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ "واقعی بعض بیان جادو (کی طرح بہت جلد طبائع پر اثر انداز) ہوتے ہیں۔"

بیان وخطابت کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے:

اللہ رب العزت نے انسان کے علاوہ بھی اس کائنات میں بے شمار مخلوقات کو آباد فرمایا؛ لیکن ان سبھی میں انسان کو کچھ امتیازی وخصوصی صلاحیتوں اور نعمتوں سے نواز کر ایک شان اور پہچان عطا فرمائی، من جملہ ان کے ایک نعمت زبان اور اس کے ذریعہ اظہارِ بیان کی

استعداد اور قدرت وصلاحیت بھی ہے، حق تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان میں کمی بیشی کے ساتھ زبان اور بیان کی ایسی زبردست صلاحیت رکھی ہے کہ اگر اسے تربیت وتمرین کے ذریعہ بروئے کار لایا جائے تو پھر اس بیان وخطابت سے ایک انسان اپنے مافی الضمیر (دلی جذبات وخیالات) کو دل نشین اور مؤثر ترین طریقے سے پیش کر کے اسلام اور اس کے پیغام کو عام کر کے ایک صالح انقلاب رونما کرسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بیان وخطابت کی صلاحیت انسان کی وہ خوبی ہے جس سے دوسری مخلوق محروم ہے، اللہ رب العزت نے بطورِ خاص انسان ہی کو اس انعام وعطیہ سے نوازا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان پر کیے گئے انعامات واحسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (الرحمن: ۱-۴)

اللہ ہی ہے الرحمٰن (نہایت ہی مہربان) اسی نے دی تعلیم قرآن، پیدا کیا انسان، پھر سکھایا اسے اظہارِ بیان، جو اس کا انعام ہے عظیم الشان۔

دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر کیے گئے انعامات واحسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تین خصوصی نعمتیں انہیں عطا فرمائیں، (۱) حکومت (۲) حکمت (نبوت) اور (۳) خطابت۔

﴿ وَ شَدَدْنَا مُلْكَهُ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص: ۲۰)

یہاں بھی خطابت کو خصوصی انعام اور نعمت کے طور پر ذکر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت نے انسان کو جن امتیازی وخصوصی نعمتوں سے نوازا اُن میں ایک عظیم الشان نعمت بیان وخطابت کی استعداد وصلاحیت بھی ہے۔

نعمتِ خطابت کی حکمت:

انسان کو عطا کی گئی نعمتِ خطابت کی اصل حکمت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بظاہر

اس کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو اللہ نے روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (البقرة: ۳۰) میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

علماء نے فرمایا کہ آیتِ کریمہ میں خلیفہ سے مراد انسان ہے، اور اس کے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود عمل کرے اور اپنی طاقت کے مطابق دوسروں سے بھی عمل کرانے کی کوشش کرے۔ (آسان ترجمۂ قرآن/ص:۵۴)

جب یہ ثابت ہوگیا کہ دنیا میں اللہ کے دین اور اس کے احکام پر عمل کرنا، پھر دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتذکیر کے ذریعہ دوسروں کو اس کی ترغیب دینا، خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی وجہ سے ایک انسان کی ذمہ داری ہے، تو اس کو نبھانے اور ادا کرنے کے لیے جو اسباب وذرائع ہیں ان میں ایک بہترین ومفید ترین ذریعہ بیان وخطابت بھی ہے، شاید اسی لیے اللہ رب العزت نے انسان کو نعمتِ بیان وخطابت سے نوازا، (بالخصوص حضرات انبیاء وعلماء اور ان جیسے منتخب بندوں کو) تاکہ وہ اس کے ذریعہ دین کی دعوت واشاعت کا فرض ادا کریں، اور یہی اس نعمت کا حق وشکر ہے۔

بیان وخطابت انبیاء علیہم السلام کی سنت اور دعوت وتبلیغ کی ضرورت:

واقعہ یہ ہے کہ بیان وخطابت کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہونے کے علاوہ دعوت وتبلیغ کی نہایت اہم ضرورت بھی ہے، کیوں کہ دعوت وتبلیغ کے جتنے بھی اسباب وذرائع ہیں ان تمام میں وعظ ونصیحت نہایت ہی نفع بخش ذریعہ ہے، اس سے براہِ راست مدعو داعی سے، متعلّم معلم سے، مرید شیخ سے اور طالب مطلوب سے نفع حاصل کرسکتا ہے، حتی کہ امتی اپنے نبی سے بھی، یہی وجہ ہے کہ خود رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو اس کا حکم فرمایا:

﴿ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا﴾ (النساء: ۶۳)

”آپ اُنہیں نصیحت ایسی فصاحت وبلاغت سے کیجئے کہ ان کے دل میں اُتر

جائے۔‘‘ اسی کے ساتھ اس کے نفع بخش ہونے کو قرآن میں بیان فرمایا:

﴿ وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الذاريات:٥٥)

محبوبم! آپ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے رہیں، اس لیے کہ نصیحت کرنا ان لوگوں کو نفع دیتا ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان مقدر کر دیا، یا جو ایمان لے آئے ہیں، اسی لیے خطیبِ اعظم رحمت عالم ﷺ اور آپ سے پہلے دیگر انبیاء ورُسل علیہم السلام نے اپنی امت میں دعوت وتبلیغ کے لیے زبانی بیان وخطابت کا طریقہ بھی اختیار فرمایا، جس کا اشارہ آیت کریمہ: ﴿ وَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (إبراهيم: ٤) سے ملتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ اپنی قوم کی زبان بولنے والے تھے، تاکہ وہ اپنی قوم کے سامنے بیان کریں۔

معلوم ہوا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی ہے اور دعوت کی اہم ضرورت بھی، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب حق تعالیٰ نے انہیں نبوت عطا فرمائی تو ان کی زبان اور اظہارِ بیان میں وہ روانی نہ تھی جو ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام میں تھی، لہٰذا دعوتی سفر میں آسانی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیے جانے کی درخواست کرتے ہوئے علت یہ بیان فرمائی کہ وہ فصیح اللسان ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

﴿ وَ أَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْأً يُّصَدِّقُنِيْ﴾ (القصص:٣٤)

میرا بھائی ہارون زبان اور بیان کے اعتبار سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے، اس لیے اسے میرا مددگار بنا دیجئے، تاکہ وہ میری نبوت ودعوت کی تصدیق کر سکے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا، چنانچہ علماءِ تفسیر فرماتے ہیں کہ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان (دعوتی وتبلیغی) مکالمات میں حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کے درمیان ترجمان

ہوتے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل وبراہین کو نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ بیان فرماتے، اور دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری بخوبی وبآسانی ادا فرما لیتے۔ (قصص الانبیاء، وآداب الصالحین/ص:۱۳۷/تلخیص قصص القرآن)

بیان وخطابت کا اثر:

ان قرآنی حقائق سے واضح ہوا کہ بیان وخطابت کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت اور حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی سنت ہونے کے علاوہ دعوت وتبلیغ کی نہایت اہم ضرورت بھی ہے، اگر ایمان، اخلاص اور اعتدال کے ساتھ قوت بیان وخطابت کا استعمال کیا جائے تو اس سے اسلام کا پیغام عام ہوگا، اور اس کی برکت سے فتنے کافور اور دلوں کی غفلت دور ہوگی، اسی لیے حدیثِ مذکور میں بیان وخطابت کی تاثیر بیان کرتے ہوئے خطیبِ اعظم رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ’’إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا‘‘ بیان وخطابت میں سحر کے مانند اثر ہوتا ہے، علماء نے فرمایا کہ آپ کا یہ جامع ارشاد بیان کی مدح ومذمت دونوں پر مشتمل ہے، کیوں کہ بیان کی شان یہ ہے کہ ’’هُوَ كَلَامٌ، فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَ قَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ‘‘ (دارقطنی/ مشکوۃ/ ص:۴۱۱) لہٰذا اگر بیان حق کا ترجمان ہو تو اس کا اثر اچھا ہوتا ہے، ورنہ برا اثر ہوتا ہے، جیسا کہ کوفہ میں ابن زیاد کے بیان کا ہوا تھا، جس سے عظیم فتنہ پیدا ہوا۔ اسی طرح سیدنا جعفر طیارؓ کا وہ بیان اور خطاب جس سے عظیم فتنہ کافور اور دلوں کی غفلت دور ہوئی، آپ کی ایک تقریر سے شاہِ حبشہ کے دربار میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا، دلوں کی شدت رقت میں اور نفرت محبت میں بدل گئی۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت اقدس تھانویؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؒ کہیں بیان کے لیے تشریف لے گئے، وعظ سے قبل کسی نے ایک تحریر پیش کی، جس میں لکھا کہ ہم نے

سنا ہے کہ آپ کافر اور جلاہے ہیں، اور یہ کہ آپ نے اختلافی مسائل بیان کیے تو خیر نہیں۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے وعظ کے شروع میں فرمایا: پہلی بات یہ ہے کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں: "أَشهدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأَشهدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ." اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ میں کافر ہوں یا مسلمان، کیوں کہ اس کلمہ کی بدولت کافر بھی مسلمان ہو جاتا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں کوئی نکاح کا پیغام لے کر نہیں آیا، جس کے لیے اس تحقیق کی ضرروت ہو، اگر بالفرض میں جلاہا ہوں بھی؛ مگر دین کی بات صحیح بتلاتا ہوں تو محض جلاہا ہونے کی وجہ سے اس کی تردید مناسب نہیں، ویسے کسی کو واقعی میرے نسب کی تحقیق کرنی ہو تو تھانہ بھون کے لوگوں سے جا کر کرلے۔ تیسری بات یہ ہے کہ میری عادت اختلافی مسائل کو موضوع بنانے کی نہیں؛ لیکن اگر اثناءِ وعظ کوئی اختلافی مسئلہ آ گیا، اور اس کی وضاحت ضروری ہوئی تو پھر اس کے بیان سے (جذبۂ حق کے تحت) رُکتا بھی نہیں، یہی عمل اس وقت بھی ہوگا، اب اگر وعظ سننے کا رادہ ہو تو الحمد للہ! ورنہ و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہِ رب العالمین.

نتیجہ یہ نکلا کہ کسی نے بیان اور وعظ میں رکاوٹ نہیں ڈالی، آپؒ نے نہایت نافع و مؤثر بیان فرمایا، اتفاق سے اس میں اختلافی مسائل بھی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے اور اس کی برکت سے لوگ تائب ہوئے اور خود مخالفین حامی بن گئے۔

اسی طرح شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رات کے وقت موتی نام کی دہلی کی مشہور رقاصہ کے مکان پر جا کر آواز دی، خادمہ نے نکل کر پوچھا: ''کون؟'' فرمایا: ''میں فقیر ہوں'' یہ سن کر اس نے کچھ پیسے دینا چاہے، تو فرمایا: ''میں صدا لگائے بغیر کچھ لیتا نہیں، لہٰذا تم سب جمع ہو کر میری صدا سن لو'' اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے صحن میں سورۂ تین کی تلاوت فرما کر اپنے مخصوص انداز میں نہایت جامع بیان فرمایا، گویا جنت وجہنم کا مشاہدہ کرا دیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ موتی سمیت اس وقت جتنی رقاصائیں تھیں ان

سب کی چیخیں نکل گئیں اور بالآخر سب نے سچی پکی توبہ کر لی۔ (ارواحِ ثلاثہ:۶۹)

بقولِ شاعر:

اِدھر وہ کہتا گیا، اُدھر آتا گیا دل میں — اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

صاحبو! جس بیان میں چار چیزوں کا اہتمام ہوگا اس بیان وخطابت میں چار چاند لگ جائیں گے، ضرورت کے مطابق مضمون کو منتخب کر کے اُسے (۱) آیاتِ قرآنیہ (۲) احادیثِ نبویہ (۳) واقعات اور (۴) اشعار سے مدلل ومزین کیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بیان و وعظ میں حق بات حق طریقے پر اور حق نیت کے ساتھ کہی جائے تو وہ مرتب ہو یا نہ ہو مؤثر ضرور ہوا کرتی ہے، اس کے بغیر بیان و وعظ مُرَکّب ومُرَتّب تو ہو سکتا ہے، مؤثر نہیں، بقول جگرؔ مرحوم:

واعظ کا ہر ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر ☆ آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقین کا نور نہیں

بیان وخطابت کو مؤثر بنانے کے لیے چند ضروری صفات:

اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بیان وخطابت کو مؤثر بنانے کے لیے چند قرآنی صفات کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جن کی طرف سورۂ غاشیہ کی ان آیات میں نہایت بلیغ انداز میں رہنمائی کی گئی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَ إِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَ إِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَ إِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ﴾

(الغاشية: ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱)

ترجمہ: کیا یہ لوگ اونٹوں کو غور وفکر کی نظر سے نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا، اور آسمان کو کہ اسے کس طرح بلند کیا گیا، اور پہاڑوں کو کہ انہیں کس طرح گاڑا گیا، اور زمین کو کہ اسے کیسے بچھایا گیا، اب آپ نصیحت کیے جائیے، آپ تو بس نصیحت کرنے والے

ہیں۔

آیاتِ مذکورہ بالا اوران کے ترجمہ کو پڑھ کر اگر غور کیا جائے تو یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ ان میں حق تعالیٰ نے خطیبِ اعظم ﷺ اور آپ ﷺ کے واسطے سے آپ ﷺ کے متبعین کو چند نہایت ہی اہم صفات سے متصف ہونے کی ترغیب دلائی ہے، کیوں کہ اربابِ علم ودانش سے مخفی نہیں ہے کہ اصولِ فقہ میں ایک بحث حروفِ معانی کی آتی ہے، جن میں ایک حرف ''ف'' ہے، جو تفریع اور نتیجہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس کے ذریعہ کسی اصل یا مقدمہ سے نتیجہ نکالا جاتا ہے، یہاں اس قاعدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ان آیات میں اَوّلاً اونٹ، پہاڑوں، آسمان اور زمین میں تدبر اور غور وفکر کی دعوت دے کر " فَذَكِّرْ " کا حکم فرمایا، جس کا منشا یہ ہے کہ ایک خطیب ومبلغ اور مذکر کے لیے ان صفات سے متصف ہونا ضروری ہے جو مذکورہ اشیاء میں بطورِ خاص پائی جاتی ہیں۔

خطیب کو چاہیے کہ اپنے اندر اونٹ والی صفات پیدا کرے۔

سب سے پہلے اونٹ کا ذکر ہے، تو اس کی امتیازی صفات میں سے ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے جسم میں موجود ایک عضو کے اندر ایسی چربی بھر لیتا ہے کہ کئی کئی دن گذر جائیں اور اس کو پانی نہ ملے تب بھی وہ اس جمع کردہ ذخیرہ پر گذر کرسکتا ہے، اور اس کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، اونٹ کی اس صفت سے ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو یہ سمجھایا گیا کہ وہ بھی اپنے اندر علوم ومعارف کا ایک ذخیرہ جمع کرے، اپنے مطالعہ کو وسیع رکھے، اپنے ذہن میں پہلے سے مواد تیار رکھے، جو اس وقت اس کو کام دے جب کہ وہ وعظ وخطابت کے ذریعہ قوم وملت کی رہنمائی کے لیے دشت وجبل ایک کردے۔

اونٹ کی دوسری نمایاں صفت یہ بھی ہے کہ اس کو "سفینة الصحراء" یعنی ریگستان کا جہاز کہا جاتا ہے، کتنے ہی خشک اور کیسے ہی جنگل کا سفر کیوں نہ ہو، مگر وہ بآسانی اُسے طے کرلیتا ہے، اونٹ کی اِس صفت سے ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو یہ سبق دیا گیا کہ بیان

وخطاب کے لیے خواہ کتنا ہی تند اور خشک موضوع اس کے سپرد ہو، موضوع شدید ہو یا سدید، درشت ہو یا درست، مگر جب وہ اس میدان میں اُترے تو اپنی قوتِ خطابی، سلاستِ بیانی اور طلاقتِ لسانی سے سامعین کو تشنہ نہ رہنے دے۔

علاوہ ازیں اونٹ کی تیسری صفت یہ ہے کہ اس میں بردباری کی قوت اور سخت کاموں کو انجام دینے کی بڑی زبردست طاقت ہے، اس سے ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو بتلایا گیا کہ وہ بھی اپنے اندر بردباری کی قوت اور سخت مجاہدات کی طاقت پیدا کرے کہ دعوت وتبلیغ کے سفر میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو آسائش طلبی اور عیش وتنعم کا عادی نہ بنائے، ورنہ یہ اہم فریضہ کما حقہ انجام نہیں دیا جاسکتا۔

خطیب کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر آسمان والی صفات پیدا کرے:

دوسری آیت ہے: ﴿وَ إِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ﴾ اس میں آسمان کی طرف غور وفکر کی دعوت دے کر خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو یہ بتلایا گیا کہ وہ بھی آسمان کی طرح بلا کسی سہارے کے قائم رہنا سیکھے، اپنے ایمان واخلاص اور علم وعمل میں مستقیم رہے، دنیا اور دنیا کے پرستاروں کے بل بوتے پر کھڑے ہو کر اُن کی چاہت کے مطابق نہیں؛ بلکہ معاشرے کی ضرورت کے مطابق بیان کرے، اپنے اندر کوئی طمع اور لچک نہ رکھے، اور اگر من جانب اللہ کوئی سلوک کردے تو منع بھی نہ کرے، بلکہ اسے قبول کرلے، البتہ جمع کرنے کے بجائے اپنی یا دین کی ضرورت میں خرچ کرلے، یہی بزرگوں کی شان ہے۔ نہ طمع، نہ منع، نہ جمع۔

پھر آسمان کی دوسری صفت یہ ہے کہ ﴿وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ﴾ اس میں کوئی شگاف بھی نہیں ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر بھی اپنے باطن میں کسی قسم کا شگاف پیدا نہ ہونے دے، اپنے ظاہر وباطن کو تزکیہ کے ذریعہ آسمان کی

طرح صاف، شفاف اور بے شگاف بنانے کی پوری کوشش کرے۔

علاوہ ازیں آسمان کی تیسری صفت یہ ہے کہ اس میں بڑی وسعت ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت سبھی پر سایہ فگن رہتا ہے، یہی صفت خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر میں بھی ہونی چاہیے، کہ وہ تنگ نظر نہ ہو؛ بلکہ عزائم کی بلندی اور وسعتِ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے بلا کسی طمع اور خوف کے سبھی پر علم وہدایت کے ساتھ سایہ فگن رہے۔

خطیب کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر پہاڑ والی صفات پیدا کرے:

تیسری آیت ہے: ﴿وَ إِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ﴾ اس میں پہاڑوں کی طرف دعوت فکر دے کر ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اس کے پیغام میں پہاڑ کی طرح استحکام ہونا چاہیے، حالات ومصائب کے کتنے ہی تھپیڑے آجائیں، معاش وسماج کے اعتبار سے اسے کیسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑے؛ مگر وہ حق وصداقت کے پیغام اور خدمتِ اسلام کے جذبہ میں پہاڑ کی طرح ثابت قدمی کا ثبوت پیش کرے، اور استحکام اخلاص کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا، جو کام اخلاص کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس میں استحکام ہوتا ہے، جس میں للّٰہیت نہیں ہوتی اس میں استقامت بھی نہیں ہوتی، لہٰذا خطیب کو اپنے اندر پہاڑ کے مانند استحکام پیدا کرنے کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے۔

پہاڑ کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کی بلندی آسمان کو چھو لیتی ہے، اس کے باوجود وہ زمین سے جڑا ہوا رہتا ہے، زمین سے اپنا رشتہ ختم نہیں کرتا، اسی طرح ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو عوام میں پہاڑ کی طرح کتنی ہی رفعت وبلندی کیوں نہ مل جائے؛ مگر اسے چاہیے کہ وہ اسلاف، اکابر اور اساتذہ سے اس طرح جڑا رہے جیسے پہاڑ زمین سے جڑا رہتا ہے، ورنہ بہت خطرہ ہے کہ ظاہری عزت ورفعت سے دھوکہ کھا کر عجب وکبر وغیرہ امراض میں مبتلا ہوجائے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

خطیب کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر زمین والی صفات پیدا کرے:

چوتھی آیت: ﴿وَ إِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ﴾ میں زمین کی طرف غور وفکر کی ترغیب دی، زمین کی پہلی خاصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دامن میں بطورِ امانت زندگی کی ضروریات اور زینت کے تمام ذخائر ودیعت کر رکھے ہیں، اور وہ ساری انسانیت کی ضرورت وزینت کے اسباب امانت داری کے ساتھ فراہم کرتی رہتی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایک دانہ بھی اس میں دفن کرتا ہے تو وہ بڑی وسعت کے ساتھ اُس امانت کو پودے کی شکل میں واپس کر دیتی ہے، تو ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو یہ آیت اس بات پر ابھارتی ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرح اپنے علم واخلاق کے خزانے ودیعت فرما دیے ہیں، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ بھی انسانیت کی علمی ضرورت کو پورا کرے اور خدمت خلق کے ذریعہ ان کے کام آئے۔

زمین کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے دامن میں زندگی کی ہر ضرورت وزینت کے ذخائر ہونے کے باوجود اس میں عاجزی اس قدر ہے کہ لوگوں کے پیروں تلے رہتی ہے، اسی طرح ایک خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کو چاہیے کہ اپنے اندر زمین جیسی عاجزی اور انکساری پیدا کرے۔

علاوہ ازیں زمین کی تیسری خاصیت یہ ہے کہ اس میں اتنی نرمی بھی نہیں کہ کوئی چیز اس پر قائم ہی نہ رہ سکے، اور اتنی سختی بھی نہیں کہ اس پر کوئی عمارت وغیرہ نہ بن سکے؛ بلکہ اس میں اعتدال ہے، نرمی بھی ہے اور سختی بھی ہے، نرم اتنی کہ جب کوئی شخص اس پر بڑی چھوٹی عمارت بنانا چاہے، یا اس کا سینہ چاک کر کے نہر نکالنا چاہے، تو عملاً سب کچھ ممکن ہے، اور ہوتا بھی ہے، اسی طرح اس کی سختی کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑوں اور دنیا بھر کی مخلوق کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، یہی اعتدال والا حال خطیب ومبلغ اور مقرر ومذکر کا بھی ہونا چاہیے، اس کا حال ریشم جیسا ہونا چاہیے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم اور ملائم کہ ہاتھ کو حظ اور لطف

ولذت نصیب ہو؛ لیکن اگر کوئی کاٹنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز، دھاردار چھری بھی اس پر پھسل کر رہ جائے۔

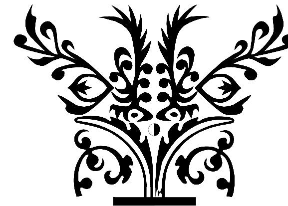
واللہ! اگر ہمارے واعظین اور خطباء قرآنِ کریم کی اِن چند اشارہ فرمودہ صفات سے متصف ہو کر ارشادِ ربانی: ﴿وَذَكِّرْ﴾ پر عمل کریں تو یقیناً ان کی موعظت وخطابت ﴿تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا مصداق بن جائے۔

اللہ رب العزت اپنے کرم اور آج کے اس مبارک دن کی برکت سے ہم میں یہ صفات پیدا فرما کر ہمیں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۸/نومبر/۲۰۱۳ء، یومِ عاشورا، قبل الجمعہ، کاٹھیاواڑ، مہوا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۰)

ماہِ شوال کے چھ روزے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِي أَيُّوْبَ الْأَنْصَارِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ." (رواه مسلم، مشكوٰة/ ص:۱۷۹/ كتاب الصوم/ باب صيام التطوع / الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے، اس کے بعد ماہِ شوال میں چھ (نفلی) روزے رکھے، تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا۔''

نفلی روزوں کی تعلیم وترغیب:

اللہ تعالیٰ کا قرب اعمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، قربِ الٰہی کے لیے اعمالِ شرعیہ میں نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا بھی ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرطِ لازم ہے، جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی بن ہی نہیں سکتی، اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں، (جو فرض قرار دیے گئے) لیکن ان کے علاوہ

شریعتِ اسلامیہ میں روحانی تربیت وتزکیہ اور تقرب الی اللہ کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دِنوں اور تاریخوں مثلاً رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے، اور ہر ماہ ایامِ بیض یعنی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کے روزوں کے علاوہ ہر ہفتے پیر اور جمعرات کے روزوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کر نفلی روزوں کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ روزہ کی برکات رمضان تک ہی محدود نہ رہیں؛ بلکہ یہ مبارک سلسلہ پورے سال جاری وساری رہے۔

صائم الدہر بننے کا آسان ترین وبہترین نسخہ:

چنانچہ ماہِ شوال کے چھ (نفلی) روزوں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حدیثِ مذکور میں رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ."

کہ جس مسلمان نے (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) رمضان المبارک کے فرض روزے رکھے، اس کے بعد ماہِ شوال میں (عید الفطر کے بعد مسلسل یا متفرق طور پر جس طرح بھی سہولت ہو) چھ روزے رکھے، وہ صائم الدہر یعنی ہمیشہ ساری زندگی روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔

اس موقع پر ایک بات سمجھنے کی ہے کہ مطلقاً روزوں کا اجر وثواب تو بے حد وحساب ہے، جیسے حدیثِ قدسی میں اس طرح بیان فرمایا گیا: "اَلصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهٖ" روزہ دار بندے کا روزہ تو بس میرے ہی لیے ہے، لہٰذا میں خود ہی اس کا صلہ دوں گا۔

اہمیت روزہ کی کیا بتاؤں، بس یہ جان لیجیے
اس کا بدلہ خود اللہ دے گا، حقیقت مان لیجیے

بڑوں کی عطا بھی بڑی ہوتی ہے نا! اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑے ہیں، اس لیے ان

کی عطا اور اجر کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا؛ لیکن یہاں شوال کے چھ نفلی روزوں کا اس قدر عظیم الشان اجر وثواب بیان کیا گیا؛ بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس حدیث میں صائم الدہر بننے کا آسان ترین وبہترین نسخہ بیان فرمایا کہ جو خوش نصیب صرف شوال کے چھ نفلی روزے رکھ لے، تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا، اس کے نامۂ اعمال میں صائم الدہر کے مانند اجر وثواب لکھا جائے گا۔ کتنا آسان نسخہ ہے، ہمارے علماء نے اس کے متعلق فرمایا کہ اس نبوی خوشخبری کی تائید اس فرمانِ الٰہی سے ہوتی ہے جس میں فرمایا کہ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ۱۶۰)

ہماری بارگاہِ رحمت میں ایک نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا دیا جاتا ہے۔ اس قانونِ کریمانہ کے حساب سے رمضان کے ایک مہینہ میں روزہ رکھنے کا ثواب دس مہینوں کے برابر ہوا، حالاں کہ مہینہ کبھی تیس کا ہوتا ہے، کبھی انتیس کا، مگر حق تعالیٰ اجر وثواب تیس کے حساب سے عطا فرماتے ہیں، یہ بھی ان کے فضلِ عظیم کی دلیل ہے۔

پھر شوال کے چھ روزوں کا ثواب ساٹھ کے حساب سے دو مہینوں کے برابر ہوا، اس اعتبار سے رمضان کے کل تیس اور شوال کے چھ ملا کر چھتیس (۳۶) روزے ہوتے ہیں، جن کا دس گنا (۳۶۰) ہو جاتا ہے، اور پورے سال کے دن ۳۶۰ سے کم ہی ہوا کرتے ہیں، لہٰذا جس سعادت مند نے پورے رمضان کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے بھی چھ روزے رکھ لیے، اور ہر سال اس کا اہتمام کیا، تو وہ اجر وثواب کے لحاظ سے اُس شخص کے مانند ہوا جو ساری زندگی سوائے ایامِ منہی عنہا کے روزہ رکھ کر اجر وثواب کا حقدار بنا۔

ماہِ شوال کے چھ روزوں کی فضیلت:

ماہِ شوال کے چھ روزوں کے فضائل اس کے علاوہ بھی احادیثِ طیبہ میں منقول ہیں، مثلاً ایک روایت میں ہے:

عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ،

وَأَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ." (الترغیب والترهیب/ج:۲/ص:۱۱۱/ الترغیب فی صوم ست من شوال للمنذری)

جس صاحبِ توفیق کو رمضان المبارک کے فرض روزوں کی ادائیگی کے بعد ماہِ شوال کے چھ روزوں کا موقع میسر آ جائے، اس کے سارے (صغیرہ) گناہ اس طرح معاف کردیے جاتے ہیں جیسے نومولود بچہ، جس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

یہاں گناہوں سے مراد اگرچہ صغیرہ گناہ ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ یہ صاحبِ توفیق اور خوش نصیب بندہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے، تو یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں؛ کیوں کہ حدیث میں ہمارے آقا ﷺ نے سیدہ عائشہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی تھی:

"يَا عَائِشَةُ إِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ، فَإِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ طَالِباً." (رواه ابن ماجه، مشكوة/ ص: ٤٥٨)

''اے عائشہ! چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی اجتناب (بچا) کرو، اس لیے کہ اللہ رب العزت کے یہاں اس پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے۔'' غور وفکر کرنے کا مقام ہے کہ جب عفیفۂ کائنات، امہات المومنین والمومنات کو صغائر سے احتیاط کی ضرورت تھی، تو ہمارے لیے اس سے غفلت کیسے روا ہو سکتی ہے؟

لہٰذا جس طرح کبائر سے بچنا ضروری ہے اسی طرح صغائر سے بچنا بھی ضروری ہے، اور اگر کبھی بتقاضائے بشریت چھوٹا بڑا گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ واستغفار اور نیک اعمال کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ اس سے پاکی ومعافی مل جائے، اور جو اعمالِ صالحہ گناہوں سے معافی وپاکی کا سبب ہیں اُن میں ماہِ شوال کے چھ روزے بھی ہیں، جیسا کہ حدیث پاک سے ثابت ہوگیا کہ یہ شش عید کے روزے (صغیرہ) گناہوں سے پاکی ومعافیہ کا بہترین ذریعہ ہیں۔

نوافل فرائض کی تکمیل کا وسیلہ ہیں:

اس سلسلہ میں ایک علمی نکتہ بھی قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ احادیثِ طیبہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ نوافل فرائض کی تکمیل کا وسیلہ ہیں، اور یہ ماہِ شوال کے چھ روزے چوں کہ فرض اور واجب نہیں؛ بلکہ نفل ہیں، اس لیے جو حیثیت فرائض کے بعد سنن ونوافل کی ہے وہی حیثیت رمضان المبارک کے فرض روزوں کے بعد ماہِ شوال کے ان چھ روزوں کی بھی ہے، اور نفلی اعمال کے متعلق حدیثِ قدسی میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلوٰتُهُ، فَإِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَ إِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ، فَإِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيضَتِهِ شَيْءٌ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ: أُنْظُرُوا! هَلْ لِعَبْدِي مِنْ تَطَوُّعٍ؟ فَيُكَمَّلُ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الْفَرِيضَةِ، ثُمَّ يَكُونُ سَائِرُ عَمَلِهِ عَلىٰ ذٰلِكَ." وَ فِي رِوَايَةٍ: "ثُمَّ الزَّكوٰةُ مِثْلُ ذٰلِكَ، ثُمَّ تُؤْخَذُ الْأَعْمَالُ عَلىٰ حَسَبِ ذٰلِكَ." (رواه أبو داوٗد وأحمد، مشكوٰة/ص:١١٧/ كتاب الصلوة / باب التطوع)

بلاشبہ سب سے پہلی وہ چیز جس کا بندہ سے قیامت کے دن اس کے (بدنی) اعمال میں حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے، اگر بندہ کی نماز ٹھیک (قبول) ہوئی تو بلاشبہ وہ بامراد اور کامیاب ہوگا۔ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کسی نے کہا ہے:

روزِ محشر کہ جاں گداز بود ☆ اولیں پرسش نماز بود

لیکن اگر وہ خراب (نامقبول) ہوئی تو وہ نامراد اور برباد ہوگا، اور اگر اس کے فرض (کی مقدار یا ادائیگی) میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ رب العزت کا کریمانہ ارشاد ہوگا کہ دیکھو! میرے بندے کے لیے کچھ نفل ہے؟ چنانچہ نوافل کے ذریعہ اس کمی کی تلافی کی جائے گی، پھر نماز کے علاوہ دیگر فرائض مثلاً زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ کا اسی ترتیب سے حساب ہوگا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح فرض نماز کی تقصیر اور کوتاہی نوافل کے ذریعہ مکمل کی جائے گی، اسی طرح رمضان المبارک کے فرض روزوں میں ہونے والی تقصیر اور کوتاہی کی تلافی بھی نفل روزوں کے ذریعہ کی جائے گی، لہٰذا ماہِ شوال کے یہ نفل روزے بھی تکمیل فرائض

کا وسیلہ ہوں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ ماہِ شوال کے یہ چھ روزے بڑے مبارک ہیں اگر بارگاہِ رب العزت میں قبول ہو جائیں تو پھر یہ (۱) صائم الدہر بننے کا آسان ترین وبہترین نبوی نسخہ، (۲) صغیرہ گناہوں سے پاکی ومعافی کا بہترین ذریعہ، (۳) اور قیامت کے دن فرض روزوں میں ہونے والی تقصیر کی تکمیل کا وسیلہ ہیں۔

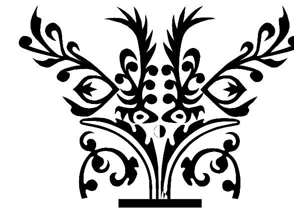
حق تعالیٰ ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو شرفِ قبولیت سے نواز کر مزید اعمالِ صالحہ مقبولہ کی توفیق مرحمت عطا فرمائیں اور میری بیٹی کے اس پہلی مرتبہ کے شش عید کے روزوں کو بھی قبول فرما کر اسے اور تمام اہل وعیال، ازواج واولاد، متعلقین ومحسنین کو دارین میں حیاتِ طیبہ عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

۹/شوال المکرّم/۱۴۳۳ھ

مطابق: ۲۸/اگست/۲۰۱۲ء/ بروز منگل، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۱)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حقیقت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضي الله عنه عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ." (رواہ مسلم/ ج: ۱/ ص: ۵۱، مشکوٰۃ / ص: ۴۳۶/ باب الأمر بالمعروف)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے روک دے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو زبان سے، (وعظ ونصیحت کے ذریعہ منع کردے۔) لیکن اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر کم از کم دل سے (نفرت کرے اور اس برائی کو برا سمجھے) یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

تمہید:

حق تعالیٰ نے ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے مختلف اوقات میں مختلف انبیاء اور رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، حتیٰ کہ بعض اوقات تو ایک ہی وقت میں دو دو نبی بھیجے، کہ باپ بھی نبی اور بیٹے بھی نبی، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، نیز حضرت اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام، اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام، اور بعض اوقات ایک ہی وقت میں دو بھائیوں کو نبوت عطا فرمائی، مثلاً حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام وغیرہ، اب سوال یہ ہے کہ جب دنیا میں انسان تھوڑے اور انسانیت کے مسائل بھی اتنے زیادہ نہ تھے تب تو ایک ایک وقت میں دو دو نبی ہوتے تھے، اور آج جب کہ انسان دنیا کے ہر نشیب و فراز میں موجود ہے اور مسائل بھی آئے دن بڑھتے ہی جاتے ہیں، تو اب سرے سے نبوت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا، آخر کیوں؟ حالانکہ دورِ حاضر میں تو نبوت کی ضرورت اور بھی زیادہ تھی، کیوں کہ آج تو ایک ایک شہر اِتنا بڑا ہے کہ بیک وقت دو چار نبی ایک شہر میں ہوتے تو عین مناسب تھا، لیکن اس آخری دور میں رب العالمین نے حضور ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر نبوت کا دروازہ ہی بند کر دیا، ایسا کیوں؟

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے آخری نبی کی امت کے علماء، صلحاء اور دعاۃ میں ایسی زبردست دعوت الی الخیر کی صلاحیت رکھی کہ اُن کے ہوتے ہوئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے امم سابقہ میں امتِ محمدیہ (علی صاحبها الصلوٰۃ والسلام) کو "خَیۡرُ اُمَّةٍ" کے خطاب سے نوازا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

آیت کریمہ سے اس امت کی بڑی زبردست عظمت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، امتِ محمدیہ کو بہترین امت کہنے کی مختلف وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ دعوت الی الخیر اس کا فرضِ منصبی اور بنیادی ذمہ داری ہے، اور دعوت الی الخیر کے مہتم بالشان فریضہ کو ادا کرنے ہی کی وجہ سے اس امت کو امم سابقہ پر عظمت وفضیلت حاصل ہوئی ہے، اور دعوت الی الخیر کا سیدھا مطلب ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، امر کے معنی ہیں حکم کرنا، اور معروف کے معنی ہیں نیکی و بھلائی، جب کہ نہی کے معنی ہیں روکنا، اور منکر کہتے ہیں برائی کو، اس اعتبار سے امر بالمعروف ایمان اور ایمانی اعمال کی دعوت دینے کو کہتے ہیں، جب کہ کفر وشرک اور جملہ معاصی و بے ایمانی والے کاموں سے منع کرنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں، البتہ اس میں ایمان اور دین اسلام کی عمومی دعوت تو اپنے قول وعمل سے غیر مسلموں کو دی جائے گی، کیوں کہ دعوت الی الخیر اور دعوتِ دین کے اصل مخاطب کفار ومشرکین ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے تیئیس (۲۳) سالہ عہدِ نبوت میں ابتداءِ نبوت سے فتح مکہ بلکہ حجۃ الوداع تک کفار ومشرک قبائل ہی میں دعوتی کوششیں فرمائیں، لیکن اسی کے ساتھ رب العالمین نے خود اہل ایمان کو

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا﴾ (النساء: ۱۳۶)

اور دوسری جگہ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً﴾ (البقرة: ۲۰۸)

کا حکم فرمایا، نیز اہل ایمان کی پہچان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ﴾ (التوبة: ۷۱)

اس لیے ایمان پر استقامت نیز اصلاحِ اعمال اور احکامِ اسلام کی خصوصی دعوت مسلمانوں کو بھی دی جائے گی، تب ہی دعوت الی الخیر یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم مکمل ہوگا اور ہمیں بھی خیر امۃ کا استحقاق حاصل ہوگا اور خیر وجود میں آئے گی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اسی سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے بغیر نہ ہم ''خیر امۃ'' بن سکتے ہیں نہ خیر اپنے حقیقی معنی اور مفہوم کے اعتبار سے سماج میں آسکتی ہے، حضور ﷺ ہمارے خیر خواہ تھے، اسی لیے حدیث پاک میں رحمت عالم ﷺ نے اس کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: " وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ، وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَاباً مِنْ عِنْدِهِ، ثُمَّ تَدْعُوْنَهُ، فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ." (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:٤٣٦)

قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف (اچھائیوں کی تلقین) اور نہی عن المنکر (برائیوں پر روک ٹوک) کرتے رہوگے، ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے گا، پھر تم دعائیں مانگوگے، مگر وہ قبول نہ کرے گا۔ یعنی دعا تو دفعِ بلا کا سبب ہوتی ہے؛ مگر اس فریضہ میں ہونے والی کوتاہی قبولیت دعا سے محرومی کا سبب ہوگی۔ درحقیقت اللہ رب العزت کے غیبی نظام میں ہماری اور سماج کی حفاظت کا اصل راستہ یہی ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت نہ برتیں، اسی لیے جو لوگ اپنے اس فرضِ منصبی کو اچھی طرح سے پورا کرتے ہیں قرآن نے انہیں خیریت وحفاظت بلکہ فلاحِ دارین کی بشارت سنائی، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران:١٠٤)

ترجمہ: تمہارے درمیان ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں، ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

ان حقائق سے واضح ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کے بغیر فلاحِ دارین نہیں مل سکتی۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ایک علمی نکتہ پر غور کیا جائے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر موجودہ سماج کی اصلاح ممکن نہیں، وہ اس طرح کہ کتاب وسنت میں بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا گیا، لفظِ ''معروف'' دراصل ''معرفت'' بمعنی پہچاننے سے بنا ہے، لہٰذا ''معروف'' کے معنیٰ ہیں ایسی بات جو شریعتِ مطہرہ میں جانی پہچانی ہونے کی وجہ سے سماج میں مروّج اور مشہور ہو، جیسا کہ معروف ومشہور شخص کو ہر کوئی جانتا ہے، اس کے بالمقابل ''منکر'' کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جس کے متعلق حکم شرعی وارد نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں اور سماج میں انجانی اور نامانوس ہو، گاہے گاہے پیش آتی ہو، جیسا کہ غیر معروف اور اجنبی کو کوئی نہیں جانتا، اس تعبیر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی کہ سماج میں ''معروف'' یعنی ایمان، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ وغیرہ کا عام چلن ہونا چاہیے، یہ سماج کے مروّج اور مشہور اعمال ہوں، اور ''منکر'' یعنی کفر وشرک اور جملہ معاصی کو سماج میں اتنا کم ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں میں غیر معروف، اجنبی اور اچنبھے کا باعث ہوں، جو خلاف معمول کبھی کبھی پیش آجائیں، بہر حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر ہماری زندگی اور سماج میں صلاح فلاح کا حصول ووجود ممکن نہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم:

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک مستحب اور مباح عمل سمجھ کر نہیں؛ بلکہ اپنی بنیادی ذمہ داری اور فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کیا جائے، اسی لیے علماءِ امت اس بات پر متفق ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر فردِ امت پر فرض ہے۔ (اس میں روافض کے علاوہ کسی کا اختلاف نہیں، اور روافض کا کوئی اعتبار بھی نہیں۔) (مظاہر حق جدید/ ج:۴/ص:۶۵۷)

امت محمدی کا ہر فرد داعی ہے، ہر فرد پر ساری امت کی اور ساری امت پر ایک ایک فرد کی ذمہ داری ہے، رہی بات اس کے حکمِ شرعی کی، تو ہمارے علماءِ محققین کے مابین اختلاف اس میں ہے کہ یہ فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ دونوں ہی قول صحیح ہیں، کیوں کہ "ولکل وجهة......" اس لیے اس میں تطبیق کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جس طرح نماز، روزہ وغیرہ فرضِ عین ہیں، اسی طرح امت مسلمہ کے ہر اس فرد پر جو معروف ومنکر کو اچھی طرح جانتا ہو، جب کبھی موقع آ جائے تب اس فریضہ کو انجام دینا اس پر فرضِ عین ہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران: ١٠٤)

علامہ فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظِ "مِنْ" بعض کے معنی میں نہیں؛ بلکہ بیان کے لیے ہے، جیسے ارشادِ باری: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ (الحج: ٣٠) میں ہے، جس کا مطلب ہے بتوں کی نجاست سے بچو، اس میں "مِنْ" بیان کے لیے ہے، نہ کہ بعض کے لیے، کیوں کہ بعض بتوں سے بچنے کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ تمام بتوں سے بچنے کا حکم ہے، اسی طرح یہ حکم بھی بعض کے لیے نہیں، سب ہی کے لیے ہے، جس کی تائید ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ......الخ﴾ (آل عمران: ١١٠) کے ذریعہ ہوتی ہے، کہ پوری امت مسلمہ کو اس کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے، لہٰذا اس نقطۂ نظر سے ہر مسلمان پر اپنی صلاحیت و استطاعت کے مطابق حسبِ موقع امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام فرضِ عین ہے، بشرطیکہ فتنہ کا باعث نہ ہو، اور قبولیت کا یقین ہو۔

لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے یہ کام اُمت کے ایک گروہ پر فرضِ کفایہ ہے، کیوں کہ فرمانِ الٰہی: ﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ﴾ میں ایک قول کے مطابق "مِنْ" بعض کے معنی میں ہے، اس لیے دعوت کے مکلّف صرف علماء ہیں، اس لیے اجتماعی طور پر ایسی

مخصوص جماعت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے۔ اگر قدرت کے باوجود بلا کسی شرعی عذر کے اس فریضہ کو ادا نہ کیا تو گناہ گار ہوں گے۔ (مظاہر حق جدید: ۴/ ۶۵۸)

اس جماعت میں اتنے علماء اور داعیوں کا ہونا ضروری ہے جو اپنی جگہ اس کام کو سرانجام دینے اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے کافی ہو جائیں۔ (مفاتیح الغیب/ ج:۴/ص:۲۷۶، از: "دعوتِ دین: مسلمانوں کے مسائل کا واحد علاج" ص:۱۹ تا ص:۲۶، علامہ خالد سیف اللہ رحمانی)

پھر شریعت کے احکام چوں کہ مختلف ہیں، اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم بھی مختلف ہوگا، مثلاً جو احکام فرض یا حرام ہیں، ان میں معروف کا حکم اور منکر سے منع کرنا فرض ہے، اس فریضہ کی ادائیگی میں اولاً نرمی سے کام لیا جائے، لیکن نہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، اس کے برخلاف جو احکام فرض اور واجب یا ناجائز اور حرام تو نہیں؛ بلکہ سنت یا مستحب اور مکروہ ہیں، ان میں نرمی کے ساتھ معروف کا حکم اور منکر سے منع کرنا سنت اور مستحب ہے۔ (مستفاد از: "معارف القرآن" / ج:۲/ص:۱۳۷ تا ۱۳۹)

امر بالمعروف کو نہی عن المنکر پر مقدم کیوں فرمایا؟

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ کتاب و سنت میں جہاں کہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے وہاں ہمیشہ امر بالمعروف کو نہی عن المنکر پر مقدم کیا ہے، کیوں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ داعیٔ خیر کے لیے امر بالمعروف نہی عن المنکر کے مقابلہ میں آسان ہے، اس میں کوئی خطرہ عموماً نہیں ہوتا، کیوں کہ اگر ہم کسی کو نیکی اور نماز کی دعوت دیں، زکاۃ و حج وغیرہ کی طرف توجہ دلائیں، تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے۔ جب کہ نہی عن المنکر یہ ایسا ہی ہے جیسے مخاطب سے اس کی کوئی محبوب اور عزیز ترین چیز چھین لینا، ظاہر ہے کہ یہ بات ہر کسی پر نا قابلِ برداشت حد تک گراں گزرتی ہے، اسی لیے نہی عن المنکر کرنے والے کو مخاطب کی جانب سے اکثر و بیشتر ترش روئی، روگردانی، سرکشی اور دشمنی کا نشانہ بننا پڑتا ہے، شاید اسی وجہ سے بعض حضرات محض

امر بالمعروف پر اکتفاء کرلیتے ہیں کہ ہمارا کام تو بس اچھائیوں کی دعوت دینا ہے، اور برائیوں پر نکیر کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، تو انہیں جان لینا چاہیے کہ یہ دعوت کا ایک حصہ ہے، مکمل دعوت نہیں، لہٰذا اس سے مطلوبہ نتائج وثمرات حاصل نہیں ہوسکتے، جیسا کہ کوئی کھیتی اس وقت تک سرسبز وشاداب نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے اِردگرد سے جھاڑ جھنکار کی صفائی نہ کی جائے، اور کوئی مریض اس وقت تک شفایاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ دوا کے ساتھ پرہیز نہ کرے، بالکل اسی طرح خیر امت کے سماج میں دعوت الی الخیر کے ذریعہ خیر کا تصور اور وجود اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ شر کو جڑ سے نہ اکھیڑ دیا جائے، اس کے لیے امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کی بھی ضرورت ہے۔

نہی عن المنکر کا پہلا اور سب سے اعلیٰ درجہ:

لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ امر بالمعروف تو ایک آسان عمل ہے؛ مگر نہی عن المنکر ہر وقت ہر کسی کے لیے آسان نہیں، اس لیے حدیث پاک میں رحمت عالم ﷺ نے امر بالمعروف کرنے والوں کی قسمیں اور درجے بیان نہیں فرمائے؛ بلکہ نہی عن المنکر کے طریقے اور درجے بیان فرمائے، چنانچہ فرمایا: "مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا، فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں "منکم" میں مخاطب اصلاً تو حضراتِ صحابہؓ ہیں، اور تبعاً پوری امت ہے، اور "مِـــنْ" تبعیضیہ ہے، جس سے اشارہ اس کے فرضِ کفایہ ہونے کی طرف ہے کہ جب تمہارے سامنے کوئی گمراہی اور برائی کی بات ہورہی ہو، تو اس کو روکنے کا پہلا اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تم اپنے ہاتھ اور طاقت سے روکنے کی پوری کوشش اور فکر کرو، لیکن یہ سب کے بس کی بات نہیں، اس لیے علماءِ محققین کی توجیہ کے مطابق اس حکم کے اصل مخاطب اہل اقتدار ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بین الاقوامی، ملکی، قومی، خاندانی یا کسی بھی سطح پر اقتدار ومنصب سے نوازا ہو، مثلاً حکمراں، امراء یا کمپنی، ادارہ، خاندان اور گھر کا سربراہ وغیرہ، تو ان کا فرض ہے کہ وہ جب کبھی اپنے ماتحتوں میں کسی گمراہی اور برائی کو دیکھیں تو اسے اپنے

اقتدار اور رسوخ سے ضرور روک دیں، اس لیے کہ ارشادِ نبوی "فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" کا اصل تعلق اُن ہی سے ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ بِالْيَدِ عَلَى الْأُمَرَاءِ" (فتاویٰ عالمگیری/ ج:۵/ص:۳۵۳) اب جو امراء اور سربراہ اپنے اس فرضِ منصبی وذمہ داری کو بخوبی نبھاتے ہیں؛ قرآن کریم نے ان کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ إِنْ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلوٰةَ وَ آتَوُا الزَّكوٰةَ وَ أَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ﴾ (الحج: ٤١)

یعنی سچے مقتدا اور مسلمان تو وہی ہیں کہ جب ہم ان کو زمین پر اقتدار اور قدرت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں نظامِ اطاعت قائم کرتے ہیں، جس کا ایک مظہر نماز ہے، اور اپنے مالیاتی نظام کو زکوۃ کے اصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصدِ حیات بناتے ہیں، اور اللہ ہی کے اختیار میں ہر کام کا انجام ہے۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے ان اہل اقتدار کی شان اور پہچان بیان فرمائی، جو اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کرتے ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ قدرت کے باوجود اس سے غفلت برتتے ہیں، حدیث پاک میں ان کے لیے مذمت اور عذاب کی وعید بھی آئی ہے:

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ؓ قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ، يَقْدِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ، وَ لَا يُغَيِّرُوْنَ، إِلَّا أَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ أَنْ يَمُوْتُوْا." (رواه أبو داوٗد، مشكوٰة: ٤٣٧)

جو شخص کسی قوم میں ہو، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور برائی کا ارتکاب کیا جاتا ہو، اور دوسرے لوگ اس کے روکنے پر قادر ہوں، مگر انہوں نے قدرت کے باوجود نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا نہ کیا، تو (اس فریضہ میں کوتاہی کے سبب عذابِ اخروی تو بعد الموت ہے ہی) اللہ تعالیٰ انہیں موت سے قبل دنیا ہی میں عذاب دے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔ اس لیے

اہل اقتدار کو اور وہ لوگ جو کسی بھی حیثیت سے ذمہ دار ہیں انہیں اس سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

الغرض نہی عن المنکر کا سب سے اعلیٰ درجہ وطریقہ یہ ہے کہ ہاتھ اور طاقت سے گناہ کو روکا جائے، اور اس کا تعلق اصحابِ اقتدار اور ذمہ داران سے ہے، جن میں سب سے اعلیٰ کردار حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ ادا کرسکتا ہے۔ جس کو کلی اختیار حاصل ہوتا ہے، اس لیے اس کا کام نہی عن المنکر کے وقت وعظ ونصیحت تک محدود نہیں؛ بلکہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کے تمام وسائل استعمال کرکے اس برائی کے قلع قمع کی فکر کرے۔

نہی عن المنکر کا دوسرا اور درمیانی درجہ:

جو لوگ امراء اور سربراہ نہیں، جن میں کسی گمراہی یا برائی کو ہاتھ اور طاقت سے روکنے کی استطاعت نہیں ہوتی، تو حدیث میں ان لوگوں کے لیے فرمایا کہ ”فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ“ یعنی اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر نہی عن المنکر کا دوسرا اور درمیانی درجہ یہ ہے کہ ”فَبِلِسَانِهِ“ زبان کے ذریعہ اس گمراہی وبرائی کو مٹانے کی کوشش اور فکر کی جائے۔

علماء محققین نے فرمایا کہ اس فرمان کا تعلق علماء سے ہے، کیوں کہ ارشاد ربانی: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ﴾ سے مراد ایک قول کے مطابق علماء ہی ہیں۔ لہٰذا ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ زبان یعنی کلام وقلم کی طاقت اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ اس برائی کی مذمت کریں اور اسے ختم کرنے کی مناسب تدبیر کریں، اور اس سلسلہ میں کسی کی ملامت ومضرت کی پرواہ نہ کریں۔ بحمد اللہ! علماءِ خیر اور علماءِ حق نے ہمیشہ سے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے حقدار بنے۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں بہت سے واقعات سیرۃ الصحابہ والصلحاء میں ملتے ہیں، ان میں سے

ایک واقعہ حضرت بنان حمالؒ کا بھی ہے، آپ چوتھی صدی کے مقبول علماء میں سے ہیں، آپؒ اصلاً بغداد کے رہنے والے تھے، لیکن سکونت مصر میں اختیار کر لی تھی، ایک مرتبہ شاہ مصر احمد ابن طولون کو کسی منکر کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا تو اسے باز رہنے کی نصیحت فرمائی، جس کی وہ تاب نہ لاسکا اور ناراض ہوکر آپ کو خونخوار شیر کے سامنے ڈال دینے کا حکم دیا، قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ جب آپ کو شیر کے سامنے ڈال دیا گیا تو اولاً شیر لپکا، پھر رک کر ان کا جسم سونگھنے لگا، اور ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا، اس عجیب منظر کو دیکھ کر لوگ حیران ہوگئے، اور بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا، لیکن اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہوئی کہ جب آپؒ سے پوچھا گیا کہ شیر کے سونگھنے کے وقت آپ کے دل پر کیا گزر رہی تھی، تو اس مخلص اور بے لوث عالم نے فرمایا: ”میں اس وقت درندے کے جھوٹے کے متعلق علماء کے اختلاف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا جھوٹا پاک ہے یا ناپاک؟ (احناف کے یہاں وہ ناپاک ہے، جیسا کہ علامہ شرنبلالیؒ نے فرمایا۔ نور الایضاح: ۲۷) (حلیۃ الاولیاء: ۳۲۴، از: ”کتابوں کی درسگاہ میں“: ۴۲)

صاحبو! موت انسان کے سامنے ہو، اور وہ بھی ایسے ہیبت ناک منظر کے ساتھ، لیکن ذہن فقہ کے ایک اختلافی مسئلہ میں مگن ہو، ایسی اعلام اور یگانۂ روزگار شخصیات سے انسان تو کیا، درندے بھی کیوں محبت نہیں کریں گے۔ ان ہی کے متعلق جگر نے کہا تھا:

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

بہرکیف حدیثِ پاک میں ”فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ“ کے تحت علماءِ امت کی یہ خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زبان وقلم کی صلاحیت اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ حتی الامکان نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”وَ بِاللِّسَانِ عَلَى الْعُلَمَاءِ.“ (ج:۵/ص:۳۵۳)

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس دعوت الی الخیر کی آج بھی (پھولوں کی طرح)

وہی تاثیر ہے جو قرنِ اوّل میں تھی، لہٰذا جو لوگ اس فریضہ کو خلوص اور اصول کے ساتھ انجام دیتے ہیں وہ اگر کما حقہ اس کے اہل نہ بھی ہوں تب بھی حق تعالیٰ اس عظیم الشان فریضہ کو انجام دینے کی برکت سے ان نا اہل کو اہل اور اہل کو اہل اللہ بنا دیتے ہیں، اس لیے علماء کو بطورِ خاص چاہیے کہ کسی ملامت و مضرت کی پرواہ کیے بغیر اس فریضہ کو انجام دیں۔

نہی عن المنکر کا تیسرا اور ادنیٰ درجہ:

جن علماء کو اپنے قلم و کلام کی طاقت اور وعظ و نصیحت سے نہی عن المنکر کرنے میں کسی شدید فتنہ یا نا قابلِ برداشت ابتلا اور تکلیف میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، یا علماء کے علاوہ عوام میں نہی عن المنکر کے اس دوسرے درجہ پر عمل کی استطاعت نہ ہو، تو پھر اس موقع کے لیے نہی عن المنکر کا تیسرا اور ادنیٰ درجہ "فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ" ہے، جب تمہارے سامنے کوئی برائی کا ارتکاب کرے، تو کم از کم اس گمراہی و برائی سے ایسی نفرت کرو جیسے گندگی کو دل سے برا سمجھتے ہو، اس کے مٹانے کی مناسب تدبیر سوچو، اور کم از کم اس برائی کے مٹ جانے کی دعائیں کرو۔ کیوں کہ بقول حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ: ''کسی بھی کام کو وجود میں لانے کے تین طریقے ہیں: (۱) زر (۲) زور (۳) زاری۔'' اور کارِ نبوت زاری کے بغیر نہیں ہوگا۔

یہ زندہ ضمیر عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ "وَ بِالْقَلْبِ لِعَوَامِّ النَّاسِ."
(عالمگیری / ج:۵ / ص:۳۵۳)

اسی کو حدیث پاک میں "وَ ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ" فرمایا، اس کے دو مطلب حضرات محدثین نے بیان فرمائے ہیں:

(۱) پہلا مطلب تو یہ ہے کہ جب اہل ایمان اس درجہ کم زور ہو جائیں کہ ان کے پاس کسی برائی کو مٹانے کی ہاتھ اور زبان سے قوت نہ رہے تو وہ ایمان کا سب سے کمزور زمانہ ہے، اس لیے کہ اگر اہل ایمان طاقتور ہوتے تو وہ کسی برائی کو اپنی فعلی اور قولی طاقت

و قوت کے ذریعہ مٹانے کے بجائے محض قلبی نفرت پر اکتفا کیوں کرتے! جب یہ نوبت آ گئی تو سمجھو کہ ایمان کا سب سے کمزور زمانہ ہے۔

(۲) اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ جو شخص کسی برائی کو ہاتھ اور زبان سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، محض دل ہی میں اسے برا سمجھتا ہے، تو یہ شخص اہل ایمان میں سب سے زیادہ کمزور ہے، اس صورت میں ضعفِ ایمان کا تعلق تمام اہل ایمان سے نہ ہوگا۔

ترکِ نہی عن المنکر پر وعید:

لیکن اللہ کی ناراضگی اور مؤاخذہ سے بچنے کے لیے نہی عن المنکر کے اس آخری درجہ کے مطابق برائی کو دل سے برا سمجھنا ضروری ہے اس کے بغیر نہ توبہ کی توفیق نصیب ہو سکتی ہے، نہ خیر امت اور اللہ کی نصرت کا استحقاق نصیب ہو سکتا ہے؛ بلکہ عذابِ الٰہی کا سخت اندیشہ ہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَ اعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (الأنفال: ۲۵)

ترجمہ: اور ڈرو اُس وبال سے جو تم میں سے صرف ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا، (بلکہ جو لوگ اس برائی کا خود تو ارتکاب نہیں کر رہے تھے، مگر دوسروں کو اس سے روکتے بھی نہیں تھے وہ بھی اس وبال کا شکار ہوں گے) اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

نیز حدیثِ قدسی میں ہے:

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَوْحَى اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ إِلٰى جِبْرَئِيْلَ أَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَ كَذَا بِأَهْلِهَا، فَقَالَ: "يَا رَبِّ إِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَ عَلَيْهِمْ، فَإِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ."

(رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة/ص:۴۳۸/ باب الأمر بالمعروف/ الفصل

الثالث) (حدیث قدسی نمبر : ۱۱)

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''حق تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں علاقے کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو، تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: ''اے میرے رب! (آپ کے علم میں تو یہ بات ہے کہ) اس میں فلاں بندہ ایسا بھی ہے کہ جس نے ایک پل کے لیے بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، (تو کیا اسے بھی مبتلائے عذاب کیا جائے) فرمایا: ''ہاں، بستی کو اس پر اور بستی والوں پر پلٹ دو، کیوں کہ اس کا چہرہ کبھی کسی برائی کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے بھی متغیر نہیں ہوا۔'' یعنی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب بستی والے معاصی کا ارتکاب کر رہے تھے تو کم از کم وہ ان گناہوں سے نفرت کرتا، جب اتنا بھی نہ کیا تو اب اسے بھی عذاب میں مبتلا کیا جائے، اس لیے کہ ارتکابِ معاصی کے وقت اگر دل میں معاصی کی برائی بھی نہ ہو تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا سبب ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

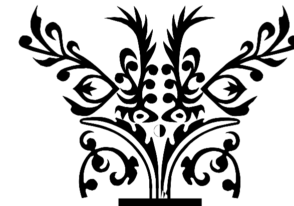
حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

۱۹/ ذی الحجہ قبل الجمعہ ۱۴۳۴ھ

مطابق: ۲۴/ اکتوبر/ ۲۰۱۳ء، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَهُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۲)

کامیابی قابلیت سے نہیں؛ قبولیت سے ملتی ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ، لَو أَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ.'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۶٦٤/ باب فضل الفقراء وماکان من عیش النبی ﷺ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے پراگندہ بالوں والے دروازوں سے دھکے دیے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے (مقبول) ہیں کہ اگر وہ (کسی معاملہ میں) اللہ کے نام کی قسم کھالیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا کر دے۔

قابلیت اور قبولیت میں فرق:

دنیا کا ہر دانشمند وعقلمند انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے اپنے اندر

قابلیت وصلاحیت پیدا کرنے کی بھر پور کوشش کرتا ہے اور کرنی چاہیے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف اسی پر اکتفاء نہ کیا جائے؛ بلکہ قابلیت کے ساتھ قبولیت اور صلاحیت کے ساتھ صالحیت وصلاح کی بھی فکر کرنی چاہیے، اس کے بعد ہی حقیقی کامیابی مقدر ہوسکتی ہے، کیوں کہ ایک ہے قابلیت اور ایک ہے قبولیت، یہ دونوں لفظ اگر چہ ملے جلے ہیں؛ مگر ان میں بڑا فرق ہے:
قابلیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان جِد وجُہد اور کوشش کر کے اپنے اندر اعلیٰ علمی وعملی کمالات، عمدہ صفات اور استعداد وصلاحیت پیدا کرلے، تو یہ شخص لائق، فائق اور قابل انسان کہلاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بڑی لیاقت وقابلیت ہے، اور عموماً اسی قابلیت کی بنیاد پر دنیا میں اس کا منصب وعہدہ متعین کیا جاتا ہے؛ لیکن اگر قابلیت کے باوجود اسے اللہ تعالیٰ کی نظر میں قبولیت نہیں ملی، یعنی یہ لائق وقابل آدمی ایمان واعمال، اخلاق واخلاص اور عاجزی و پرہیزگاری کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا محبوب نہ بنا، جو کہ ارشادِ باری: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدة:۲۷) کے مطابق قبولیت کے بنیادی اسباب میں سے ہے، تو اس قابلیت کی وجہ سے اسے دنیا کی عارضی زندگی میں وقتی منافع وفوائد تو حاصل ہو سکتے ہیں، مگر دارین کی دائمی اور حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، انسانی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص میں قابلیت تھی، مگر اس کو قبولیت نہ ملی، تو نتیجۃً وہ ناکام ہی رہا۔

قابلیت کے باوجود قبولیت کا نہ ملنا محرومی ہے:

مثلاً جہلاءِ قریش کا ولید بن مغیرہ نامی ایک بڑا سردار گذرا ہے، جس کے پاس دنیا کی وسعت، مال ودولت، دس دس بیٹے اور اولاد کی کثرت کے ساتھ بڑی قابلیت تھی، اس کی زمین وجائداد حضرت ابن عباسؓ کے بقول مکہ مکرمہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھی، سالانہ آمدنی حضرت سفیان ثوریؒ کے قول کے مطابق ایک کروڑ دینار تھی، لوگوں میں اس کا لقب "ريحانة قريش" مشہور تھا، قریش ہر مشکل امر میں اس کی طرف رجوع کرتے، یہ خود اپنے آپ کو "وحید ابن وحید، یعنی یکتا کا بیٹا یکتا" کہا کرتا تھا، اور واقعی اس میں بڑی زبردست

قابلیت تھی، یہی وجہ ہے کہ جب سورۂ غافر جسے سورۂ مؤمن بھی کہتے ہیں، اس کی ابتدائی آیات:

﴿حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (المؤمن: ۱-۲-۳)

نازل ہوئیں، اور سرکار دو عالم ﷺ کو مسجدِ حرام میں ولید نے اس کی تلاوت کرتے ہوئے سنا، تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، فوراً اپنی قوم بنی مخزوم میں جا کر کہا کہ "واللہ! میں نے محمد ﷺ سے ایسا کلام ابھی ابھی سنا جو انسانوں کا ہوسکتا ہے، نہ جنات کا، اس میں بڑی حلاوت اور طاقت ہے۔" اس کے بعد اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، یہ دیکھ کر ابوجہل کو خوف ہوا کہ کہیں ولید جیسا لائق وقابل شخص بھی مسلمان نہ ہو جائے، چنانچہ اس نے ولید کو غیرت دلائی، تو اس نے قابلیت کے باوجود قبولِ حق سے انکار کر دیا؛ پھر مسٹر ابوجہل نے کہا کہ "جب تک تم قرآن اور صاحبِ قرآن کے خلاف کوئی بات نہ کہو گے تب تک لوگ مطمئن نہ ہوں گے"، اس نے کہا: "ٹھیک ہے، مجھے سوچنے کا موقع دو!" پھر اس نے دل میں سوچ کر قرآن اور صاحب قرآن کے بارے میں جو بات تجویز کی، قرآن نے اس کو یوں بیان فرمایا:

﴿إِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ثُمَّ أَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ فَقَالَ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾

(المدثر: ۱۸-تا-۲۵)

"اس کا حال تو یہ ہے کہ اس نے سوچ کر ایک بات بنائی، اللہ کی مار ہو اس پر کہ کیسی بات بنائی، دوبارہ اللہ کی مار ہو اس پر کہ کیسی بات بنائی، پھر اس نے نظر دوڑائی، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا، پھر پیچھے کو مڑا اور غرور دکھایا، پھر کہنے لگا کہ کچھ نہیں یہ (قرآن) تو ایک روایتی جادو ہے، کچھ نہیں، یہ تو انسان کا کلام ہے۔"

دیکھئے! ولید میں قابلیت بڑی زبردست تھی؛ مگر انکارِ حق کی وجہ سے وہ کامیابی اور قبولیت حاصل نہ کرسکا، نتیجہ کیا نکلا؟ اس کی ساری قابلیت بے کار ثابت ہوئی، حق تعالیٰ نے اس کی ناکامی وبربادی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿سَأُصۡلِيۡهِ سَقَرَ﴾ (المدثر:۲۶)

عنقریب میں اس کو دوزخ میں جھونک دوں گا۔ (گلدستۂ تفاسیر/ ج:۲/ص:۴۵۴، انوارالبیان/ ج:۵/ص:۵۰۵)

معلوم ہوا کہ قابلیت کے باوجود قبولیت کا نہ ملنا بہت ہی بڑی محرومی ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ جیسا کہ قرآنِ کریم نے یہاں قابلیت والے کی محرومی کا ذکر کیا۔

قابلیت کے بغیر قبولیت کا ملنا سعادت ہے:

اس کے برخلاف ایک شخص میں بظاہر تو کوئی خاص قابلیت نہیں؛ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور بزرگوں کی صحبت کی وجہ سے ایمان واعمال، اخلاص واخلاق اور عاجزی وپرہیز گاری کے اوصاف سے متصف ہے، تو قابلیت نہ ہونے کے باوجود وہ قبولیت حاصل کرلیتا ہے، جو بہت بڑی سعادت ہے، غالبًا ایسے ہی مقبول بندوں کا تذکرہ حدیث مذکور میں کیا گیا، چنانچہ فرمایا:

"رُبَّ أَشۡعَثَ مَدۡفُوۡعٍ بِالۡأَبۡوَابِ، لَوۡ أَقۡسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ."

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں، جو اپنے آپ کو فنافی اللہ کرچکے، خود کو اللہ تعالیٰ کے لیے مٹا چکے، اب لوگ تو ان کی ظاہری خستہ حالی اور گمنامی کی وجہ سے اُنہیں اپنے دروازوں پر آنے سے بھی ہاتھ یا زبان سے روک دیتے ہیں، اُنہیں بظاہر عہدہ یا عزت اس لیے نہیں دیے جاتے کہ لوگوں کی نظروں میں وہ حقیر ہیں، جب کہ عاجز کے ناقص خیال میں حقیقت یہ ہے کہ جس طرح طبیب مریض کو مضر غذا سے بچاتا اور روکتا ہے، اسی طرح طبیب حقیقی بھی اپنے ان عزیز بندوں کو دنیا سے محفوظ رکھتا اور بچاتا ہے،

پس وہ اپنے کریم مولیٰ ہی کے در پر حاضر ہوتے ہیں، اُسی سے ساری امیدیں رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے اُنہیں ربِ کریم کی بارگاہ میں محبوبیت ومقبولیت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر کسی معاملہ میں قسم کھا بیٹھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کرے گا، یا ایسا نہیں کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم کی لاج رکھتا ہے اور ویسا ہی کردیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کو دنیا کی نظر میں ظاہری اور مادی قابلیت حاصل نہ ہو، مگر اُسے اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوبیت اور قبولیت حاصل ہو، تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ قیامت میں کامیابی قابلیت کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ قبولیت کی بنیاد پر نصیب ہوگی، پھر یہ بھی ایک سچی حقیقت ہے کہ صاحبو! حق تعالیٰ جب کسی کو اپنے فضل خاص سے نوازنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو قبولیت کے بعد خود بخود حاصل ہوجاتی ہے، اس لیے دانائے روم نے کہا کہ

دادِحق را قابلیت شرط نیست — بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی قبولیت کا واقعہ:

چنانچہ صحابہؓ وصلحاء میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ ایک غریب اور نابینا صحابی تھے، مگر حق تعالیٰ کے یہاں انہیں قبولیت کا ایسا مقام حاصل تھا کہ خود رحمت عالم ﷺ کو ان کی وجہ سے سورۂ عبس کی ابتدائی آیات نازل فرما کر متنبہ کیا گیا۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ مسجدِ حرام میں رحمت عالم ﷺ قریش کے کچھ بڑے سرداروں میں سے عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، ابی بن خلف اور عباس بن عبدالمطلب (جو حضور ﷺ کے چچا تھے اور اس وقت ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے ساتھ دین اسلام کی نہایت اہم گفتگو کمالِ توجہ سے فرما رہے تھے، آپ ﷺ کو ان سرداروں سے بڑی اُمید تھی کہ اگر یہ دین اسلام کو قبول کرلیں گے تو بمقتضائے "النَّاسُ عَلٰى دِيۡنِ مُلُوۡكِهِمۡ"

سارے شہر مکہ کے قبولِ اسلام کی توقع تھی، اسی دوران حضرت عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ زہریؓ وہاں تشریف لے آئے، جو نابینا تھے، جس کی وجہ سے ان کو ابن ام مکتوم بھی کہتے ہیں، ”مکتوم“ عربی زبان میں نابینا کو کہتے ہیں، اس مناسبت سے ان کی والدہ کو ام مکتوم کہتے تھے۔ نابینا ہونے کی وجہ سے اُنہیں حضور ﷺ کی مشغولیت کا پتہ نہ چل سکا، چنانچہ حاضر خدمت ہو کر عرض کیا: ”عَلِّمْنِي يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ تعالىٰ“ اے اللہ کے نبی! میں بڑی محنت اور مشقت سے پوچھتا پوچھتا آپ تک پہنچا ہوں، لہٰذا آپ میری طرف توجہ فرما کر مجھے کلام اللہ کی فلاں فلاں آیات و احکام سکھا دیجیے! حضور ﷺ کو اُن کا یہ طریقہ پسند نہ آیا، کیوں کہ وہ گفتگو کے درمیان آ گئے تھے، جس سے ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ ان کا جواب دیں تو حاضرین سے جو بات ہو رہی تھی وہ کٹ جاتی، اس لیے آپ ﷺ پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے، اور آپ ﷺ نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اعراض کیا، اور سردارانِ مکہ کے ساتھ محوِ کلام رہے۔

اس موقع پر مفسرین نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا یہ طرزِ عمل اجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آدابِ مجلس کے خلاف مداخلت کرے اس کو تنبیہ ہونی چاہیے، نیز نفع عام مقدم ہوتا ہے نفع خاص پر، اس لیے رحمت عالم ﷺ نے ان سرداروں کو اسلام کی دعوت دینا احکام کی دعوت پر مقدم رکھا کہ اس کا نفع عام ہے، اس لیے کہ اس سے ان کے علاوہ اوروں کے بھی مسلمان ہونے کی امید تھی، پھر یہ بات بھی ہے کہ اسلام کی دعوت قرآن کی تعلیم پر مقدم ہے، کیوں کہ وہ اصل ہے، اور یہ فرع، ساتھ ہی خیال مبارک میں یہ بات بھی تھی کہ یہ ام مکتومؓ تو میرے اپنے ہیں، بعد میں بھی آ کر معلوم کر سکتے ہیں، لیکن قریش کے سرداروں کو دعوتِ اسلام دینے کا جو سنہرا موقع آج ملا ہے، نہ معلوم یہ موقع بعد میں ملتا ہے یا نہیں، ان سب امکانات اور وجوہات کی وجہ سے حضور پاک ﷺ نے حضرت ابن اُم مکتومؓ سے اعراض فرمایا، لیکن اتنی بات بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی، اُسی وقت آپ ﷺ کی تربیت فرمانے کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَ هُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴾

(عبس: ۱ تا: ۱۲)

محبوبم! چہرہ تو پھیر لیا آپ نے ایک نابینا کے آنے سے، مگر آپ کی یہ ادا ہمیں پسند نہ آئی، آپ کیا جانیں کہ کون ہمارے نزدیک مقبول ہے اور کون مردود؟ ہم نے تو آپ کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے نا! اور رحمت کے زیادہ لائق تو کمزور، ضعیف اور نابینا ہی ہوتے ہیں، اُم مکتومؓ کی ظاہری آنکھ اگرچہ روشن نہیں، مگر دِل کی آنکھ اس قدر روشن ہے کہ انہوں نے اس سے آپ کے جمالِ جہاں آرا کا دیدار کر لیا ہے، اس لیے اس نابینا کا آپ کی ہدایت و فیض صحبت سے فائدہ اٹھانا یقینی امر ہے، جب کہ ان سرداروں کا قبولِ اسلام، پھر ان کی تابعداری میں پوری برادری کا قبولِ اسلام ایک امر موہوم ہے، لہٰذا موہوم بات کو یقینی بات پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ پھر اس مخلص کے دل میں حق کی طلب اور اصلاحِ نفس کی فکر ہے، اس لیے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے، اس کے برخلاف جن لوگوں کے دل میں حق کی طلب ہی نہیں، اور وہ اپنی اصلاح کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، حق کے طلبگاروں کے مقابلہ میں ان بے طلبوں کی فکر کرنا آپ کے شایانِ شان نہیں۔

غرض! ان آیات میں ام مکتومؓ کی وجہ سے حضور ﷺ کو تنبیہ فرمائی گئی، جس سے ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے بعد حضور ﷺ نے اُن سے معذرت فرمائی، اپنی چادر بچھا کر اس پر بٹھایا، اس کے بعد جب کبھی بھی حضرت ابن ام مکتومؓ مجلس میں حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ان کی بہت ہی تعظیم فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ ”مَرْحَباً بِمَنْ عَاتَبَنِيْ فِيْهِ رَبِّيْ!“ خوش آمدید اس شخص کو جس کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا۔ (تفسیر عزیزی جدید: ص: ۱۲۶، گلدستہ تفاسیر/ ج: ۷/ ص: ۵۴۱، انوار البیان/ ج: ۷/ ص: ۵۵۹)

قبولیت کے لیے صحبتِ اہل اللہ کا التزام اور دعا کا اہتمام ضروری ہے:

دیکھیے! رؤساءِ مکہ اور سردارانِ قریش بظاہر بہت ہی قابلیت والے تھے؛ مگر ایمان واعمال اور اخلاص واخلاق اور عاجزی و پرہیزگاری سے محروم تھے، اس لیے ان کی قابلیت کام نہ آئی، قبولیت حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کو مل گئی، جس کی وجہ سے کامیابی ان کا مقدر بن گئی، اور اللہ تعالیٰ کی جلالت کی قسم! حضرات صحابہؓ وصلحاء میں کا ایک بھی ساری دنیا کے قابل لوگوں سے بہتر ہے، اس لیے کہ اگر اللہ رب العزت کے یہاں قبولیت نہ ملے تو یہ مال، حسن وجمال اور کمال نتیجہ وانجام کے اعتبار سے سب بے کار ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ دلہن جس کو زیورات پہنا کر خوب سجایا سنوارا گیا، پھر اس کی خوب تعریفیں ہونے لگیں، تو اس نے کہا: مجھے جس دولہے کے لیے سجایا اور سنوارا گیا، اگر میں اسے پسند نہ آئی تو میری یہ تعریفیں کس کام کی؟ یہ حسن وجمال سب بے کار ہے، بالکل اسی طرح آج دنیا میں لوگ تو ہماری قابلیت کی داد دیں، تعریفیں کریں، علامۃ الدہر کہیں، مفتیٔ اعظم کہیں، مبلغ اسلام کہیں، اور جو چاہیں کہہ دیں، لیکن اگر- العیاذ باللہ العظیم- اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت نصیب نہ ہوئی تو یہ دنیا بھر کی تعریفیں کیا کام آئیں گی؟

معاملہ تو قبولیت کا ہے، اس لیے ہمیں اپنی قابلیت، صلاحیت اور علم وعمل پر ناز کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت ومحبوبیت حاصل کرنے کی فکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیوں کہ پتہ تو تب چلے گا جب مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہوگی۔ سچ ہی کہا ہے:

کون مقبول ہے، کون مردود ہے — بے خبر! کیا خبر تجھ کو کیا کون ہے؟
جب تلیں گے عمل سب کے میزان میں — تب کھلے گا کہ کھوٹا کھرا کون ہے؟

تاہم جیسے قابلیت کی کوشش کرنا اختیاری امر ہے، اسی طرح قبولیت کی کوشش بھی ایک اختیاری امر ہے، اس کے لیے ایمان واعمال، اخلاص واخلاق اور عاجزی و پرہیزگاری

اختیار کرنے کے ساتھ صحبتِ اہل اللہ کا التزام اور دعا کا اہتمام ضروری ہے، کیوں کہ صحبت اہل اللہ کے التزام اور دعاؤں کے اہتمام سے یہ چیز بآسانی حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے صحبت اہل اللہ کے متعلق قرآن کا فرمان ہے:

﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبة: ١١٩)

اور دعا کے متعلق قرآنِ پاک نے رحمٰن کے مقبول بندوں کی پہچان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا﴾ (الفرقان: ٧٤)

لہٰذا ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل کرنے کے لیے ایمان واعمال، اخلاص واخلاق اور عاجزی و پرہیزگاری اختیار کرنے کے لیے صحبتِ اہل اللہ اور دعا کا اہتمام کرنا چاہیے۔

یہ عاجز اپنے ربِ کریم کے حضور دست بستہ التجا کرتا ہے کہ یا اللہ! ہمارے اندر کوئی قابلیت نہیں، بس اعترافِ ذنوب کے سوا کچھ نہیں، اور ہمیں اپنے علم وعمل پر بھروسہ نہیں، آپ کی رحمت پر یقین ہے، لہٰذا ربِ کریم اپنی رحمت سے اور آج یومِ عرفہ کی برکت سے ہمیں اور ہماری نسلوں کو دارین میں شرفِ قبولیت عطا فرمادے۔ آمین یارب العالمین۔

یومِ عرفہ/منگل/۱۴۳۷ھ
مطابق: ۱۵/اکتوبر/۲۰۱۵ء

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆

(۳۳)

شہرت محمود ہے یا مذموم ؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ جُنۡدُبٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: "مَنۡ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰہُ بِہٖ، وَمَنۡ یُرَائِیۡ یُرَائِیۡ اللّٰہُ بِہٖ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:٤٥٤/ باب الریاء والسمعۃ/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص (اپنے کسی بھی طرح کے عمل سے) شہرت طلب کرے گا تو حق تعالیٰ اسے شہرت عطا فرمادیں گے، اور جو شخص دکھلاوے کے لیے کوئی عمل کرے گا تو حق تعالیٰ (قیامت کے دن) اس عمل کا (جو دنیا میں محض ریاکاری ودکھلاوے کے لیے کیا تھا خوب) اجر وثواب دکھلائیں گے (مگر اجر عطا نہ فرمائیں گے۔) العیاذ باللہ العظیم۔

حصولِ شہرت کے لیے غلط طریقہ اختیار کرنا ہلاکت ہے:

شہرت اور شہوت انسان کی فطرت میں داخل ہیں، اسی لیے فطری طور پر دنیا کا ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے شہرت حاصل ہو، اور اس کی شہوت بھی پوری ہو، اب سوال یہ ہے کہ شہوت اور شہرت فی نفسہ محمود ہیں یا مذموم؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اگر تکمیل شہوت اور حصولِ

شہرت کے لیے ناجائز اسباب وذرائع اختیار کیے جائیں، حدود سے تجاوز کیا جائے، تو پھر ان کے مذموم اور برا ہونے میں کوئی شک نہیں، کیوں کہ ایسی شہرت وشہوت کے نتیجہ میں ہمیشہ سے ہلاکت وجود میں آئی اور آتی ہے، اِس کا اشارہ ارشادِ ربانی سے ملتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا﴾ (مریم : ۵۹)

ترجمہ: پھر ان (مشہور نبیوں اور ان کی طرف منسوب مختلف لوگوں) کے بعد ان کی جگہ ایسے لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور شہوات کا اتباع کیا، ان کی ہلاکت وبربادی بہت جلد ان کے سامنے آئے گی۔

معلوم ہوا کہ حصولِ شہرت اور اتباعِ شہوت میں غلط طریقہ اختیار کرنا ہلاکت ہے، لیکن اگر تکمیلِ شہوت کے لیے جائز ذرائع واسباب اختیار کیے جائیں، یا کسی خوش قسمت کو ایمان وتقویٰ کی بنیاد پر من جانب اللہ قبولیت اور شہرت حاصل ہو جائے، نیز وہ اعتدال کا دامن بھی نہ چھوڑے، تو پھر یہ چیز مذموم نہیں؛ بلکہ محمود ہونے کے ساتھ اجر وثواب کا ذریعہ اور عنداللہ مقبول ہونے کی علامت بھی ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا﴾ (مریم : ۹۶)

بے شک جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہیں، اللہ رحمٰن ان کے لیے دلوں میں مقبولیت ومحبت پیدا کردے گا۔ غرض ایسی شہرت جو عنداللہ قبولیت کی وجہ سے منجانب اللہ نصیب ہوجائے اُس میں خیر ہوتی ہے۔

حصولِ شہرت کی وہ صورتیں جن میں خیر کم اور شر زیادہ ہے:

حصولِ شہرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں خیر کم اور شر زیادہ ہے، منجملہ ان کے ایک صورت یہ ہے کہ برائی کے کاموں کی وجہ سے کسی کو شہرت حاصل ہو، مثلاً کوئی شخص ڈاکہ زنی، ظلم وزیادتی، اور فلمی اداکاری کی وجہ سے مشہور ہوجائے، بقولِ شاعر: ''اگر بدنام کیا

تو کیا نام نہ ہوگا؟'' ظاہر ہے کہ ایسی دنیاوی شہرت کے مذموم اور عنداللہ بدترین ہونے میں کوئی شک نہیں، شہرت کی یہ وہ صورت ہے جسے ایک حدیث شریف میں ''وَ إِنْ كَانَ شَرًّا فَشَرٌّ'' جیسے جملہ سے بیان کیا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ذاتی شہرت کے لیے از خود یا اس کے مریدین اور ہم نشین وغیرہ ایسے ذرائع اور وسائل اختیار کریں کہ لوگوں میں مشہور ہو۔ مثلاً اسی مقصد کے تحت کسی جگہ اپنے نام سے گیٹ بنوادیا، یا مسجد، مدرسہ، ہسپتال وغیرہ بنوائی، یا عبادات میں محض حصولِ شہرت کے لیے اعتدال کا راستہ ترک کر کے انتہا پسندی اور افراط کا طریقہ اختیار کرے، حد سے زیادہ سخاوت اور نماز، روزہ وغیرہ کا اہتمام کرے، یہ کام اگر حصولِ شہرت کے لیے کیے تو یہ صورت بھی نہایت مذموم ہے، کیوں کہ یہ صورت ریاکاری کی ہے، جس میں کوئی خیر نہیں، نہ اس کا کوئی اجر وثواب رہے گا، حدیثِ مذکور میں اس کی مذمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''وَ مَنْ يُرَائِيْ يُرَائِيْ اللّٰهُ بِهٖ '' اور دکھلاوے کے لیے عمل کرنے والے کو عمل کا اجر تو دکھلایا جائے گا؛ مگر دیا نہ جائے گا۔ بلکہ حدیث میں ہے کہ ایسے لوگوں سے کہا جائے گا کہ ''جن کو دکھلانے کے لیے عمل کیا تھا اس کا اجر بھی ان ہی سے طلب کرو۔''

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ فُضَالَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ''إِذَا جَمَعَ اللّٰهُ النَّاسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ، نَادىٰ مُنَادٍ: '' مَنْ كَانَ أَشْرَكَ فِيْ عَمَلٍ عَمِلَهٗ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ أَحَدًا فَلْيَطْلُبْ ثَوَابَهٗ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ.'' (رواه أحمد، مشكوٰة/ص: ٤٥٤/ باب الرياء والسمعة/ الفصل الثانی)

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک منادی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا دے گا کہ ''دنیا میں جس شخص نے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جانے والا عمل غیر اللہ کے لیے کیا تھا، اُسے چاہیے کہ آج اس کا اجر بھی ان ہی سے طلب کر لے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ

تمام شرکاء میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے عمل پر کوئی اجر نہیں ہے۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

لہٰذا حصولِ شہرت کی یہ دوسری صورت بھی خیر سے خالی ہے، علاوہ ازیں حصولِ شہرت کی تیسری صورت یہ ہے کہ بلا کسی طلب کے ایمان وتقویٰ، اخلاص واخلاق اور علم وعمل، یا حسن قراءت وخطابت وغیرہ کی وجہ سے از خود شہرت تو حاصل ہوگئی؛ مگر احتیاط سے کام نہ لیا، جس کی وجہ سے کبر وغیرہ میں مبتلا ہوگیا۔ (العیاذ باللہ العظیم) تو یہ شہرت بھی دینی واخروی اعتبار سے مضرت اور نقصان کا ذریعہ ہے، اسی کو ایک حدیث اس طرح بیان کیا گیا:

''وَ إِنْ كَانَ خَيْرًا فَشَرٌّ''

یعنی اگر یہ آدمی نیک ہے تب بھی یہ نیک نامی اور شہرت اس کے لیے اچھی چیز نہیں ہے، کیوں کہ اس سے بسا اوقات انسان عجب وکبر جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہوکر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے محروم ہوجاتا ہے، لہٰذا شہرت بالذات خود کوئی اچھی چیز نہیں، اور نہ ہی اس کی تمنا کرنا درست ہے، بلکہ یہ وہ مرض ہے جو سالک سے سب سے اخیر میں نکلتا ہے، إِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ'' (رواه البيهقی، مشكوٰة/ص: ٤٥٥) جب تک خود اللہ تعالیٰ حفاظت نہ فرمائے اس کے شر سے محفوظ نہیں رہا جاسکتا۔

ایک واقعہ:

ہاں اگر کسی نے از خود اسبابِ شہرت تو اختیار نہیں کیے؛ بلکہ خاموشی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی میں منہمک رہا، جیسا کہ ہمارے اکابر کا حال تھا، اُن میں اخفاء بہت تھا، بہت کچھ ہونے کے باوجود از خود اپنے کو ظاہر نہ فرماتے تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ کا ایک واقعہ ہے، جن کے علم وفضل کا علمی دنیا میں آج بھی کافی شہرہ اور چرچا ہے، آپؒ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ کے ہم سبق تھے۔

آپؒ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک بوڑھا ملا، جو بوجھ لیے جا رہا تھا، مال وسامان کا بوجھ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بمشکل چل رہا تھا، حضرت مولانا مظفرحسین صاحبؒ نے یہ حال دیکھا، تو اس بوڑھے سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا، بوڑھے نے پوچھا: ''اجی! تم کہاں رہتے ہو؟'' آپؒ نے فرمایا: ''بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں'' اس نے کہا: ''وہاں مولوی مظفرحسین صاحب کوئی بڑے ولی ہیں'' اور یہ کہہ کر آپؒ کی بڑی تعریفیں کرنے لگا؛ مگر حضرتؒ نے فرمایا کہ ''اور تو اس میں کوئی بات نہیں؛ ہاں نماز پڑھ لیتا ہے!'' اس نے کہا: ''او میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟'' مولانا نے فرمایا: ''میں ٹھیک کہتا ہوں'' وہ بوڑھا آپ کے سر ہو گیا، اِتنے میں ایک شخص آ گیا، جو حضرتؒ کو جانتا تھا، اس نے بوڑھے سے کہا: ''بھلے مانس! حضرت مولانا مظفرحسین یہی ہیں'' اِس پر وہ بوڑھا مولاناؒ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ (از: ''حکایتوں کا گلدستہ''/ص:۱۶۵، مؤلفہ مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ) واقعی یہ حضرات اس شعر کے مصداق تھے جس میں شاعر نے کہا:

مجھے یوں ہی رہنے دو، میرا آرام یہی ہے
میرا نام ونشاں مٹا دو، میرا نام یہی ہے

شہرت کی وہ صورت جو علامتِ قبولیت ہے:

بہر کیف! جن لوگوں نے از خود اسبابِ شہرت اختیار نہیں کیے؛ بلکہ بڑی احتیاط اور خاموشی سے یادِ الٰہی اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مشغول رہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں شہرت عطا فرما دی، اور حصولِ شہرت کے بعد بھی پوری احتیاط سے رہے، تو یقیناً شہرت کی یہ صورت عنداللہ وعندالناس قبولیت کی علامت ہے، اس لیے کہ حدیث قدسی میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا، دَعَا جِبْرَئِيلَ، فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَانًا، فَأَحِبَّهُ، قَالَ: فَيُحِبُّهُ جِبْرَئِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي السَّمَاءِ،

فَيَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا، فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقُبُولُ فِي الْأَرْضِ." (رواه مسلم، مشكوٰة/ص:٤٢٥/ باب الحب في الله ومن الله) (حديث قدسي نمبر: ١٢)

حدیث قدسی میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت رکھتے ہیں، (اس کو ہدایت ورحمت سے نوازنا چاہتے ہیں) تو حضرت جبرئیل امینؑ کو بلا کر فرماتے ہیں: ''مجھے فلاں بندے سے محبت ہے، لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو'' تو حضرت جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر وہ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ ''فرشتو! اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں، اس لیے تم بھی اس سے محبت کرو'' اس اعلانِ عام کے بعد آسمان کے سارے فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ زمین میں بھی اس کی محبت ومقبولیت عام کر دی جاتی ہے۔

اب جو محبت وقبولیت زمینی نہیں؛ بلکہ آسمانی ہے، یعنی آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوئی ہے، وہی حقیقی اور دائمی ہوتی ہے، اور یہ محبت وقبولیت ایمان وتقویٰ کی بنیاد پر عموماً منجانب اللہ اولیاء اللہ کو نصیب ہوتی ہے۔

مقبول ہونے کے لیے مشہور ہونا ضروری نہیں:

لیکن یاد رکھو صاحبو! اللہ والا اور مقبول ہونے کے لیے مشہور ہونا کوئی ضروری نہیں، متقی ہونا ہی کافی ہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے: ﴿إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ﴾ (الأنفال: ٣٤) بے شمار اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے نہایت احتیاط اور خاموشی کے ساتھ گم نامی والی زندگی گذاری، لیکن عام لوگ انہیں جانتے نہیں، وہ عام لوگوں کے مابین بالکل ایسے رہے: "كَأَنَّ الْيَاقُوتَ بَيْنَ الْحَجَرِ" جیسے پتھر کے درمیان ہیرا ہوتا ہے، حالانکہ ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل رشک اولیاء میں ہوتا ہے، اسی کو ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ أَغْبَطَ أَوْلِيَائِي عِنْدِي لَمُؤْمِنٌ

خَفِيفُ الحَاذِ، ذُوْ حَظٍّ مِنَ الصَّلوٰةِ، أَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ، وَ أَطَاعَهٗ فِي السِّرِّ، وَ كَانَ غَامِضًا فِي النَّاسِ، لَا يُشَارُ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ، وَ كَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا، فَصَبَرَ عَلٰى ذٰلِكَ، ثُمَّ نَقَرَ بِيَدِهٖ، فَقَالَ: ''عُجِّلَتْ مَنِيَّتُهٗ، قَلَّتْ بَوَاكِيهِ، قَلَّ تُرَاثُهٗ.'' (رواه أحمد والترمذی وابن ماجه، مشکوة /ص:٤٤٢/کتاب الرقاق/ الفصل الثانی)

اولیاء اللہ (اولیاء اللہ کے احوال و الوان تو مختلف ہیں، لیکن ان) میں بہت ہی زیادہ قابلِ رشک زندگی ان اہلِ ایمان (اولیاء اللہ) کی ہے جن کا حال یہ ہے کہ دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے وہ بہت ہلکے پھلکے ہیں، مگر نماز، مناجات اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں ان کا خاص حصہ ہے، اس کے باوجود وہ ایسے نامعروف اور گم نام ہیں کہ آتے جاتے کوئی ان کی طرف انگلی سے اشارہ نہیں کرتا کہ یہ فلاں صاحب اور فلاں بزرگ ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق مع اللہ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت وغیرہ کا سارا معاملہ خلوت میں ہوتا ہے، پھر ان کی روزی بھی بقدرِ کفاف ہوتی ہے، یعنی اتنی روزی کہ زندگی کا انتظام چلتا رہے، نہ تنگی، نہ کشادگی؛ بلکہ آمدنی اور خرچ برابر ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور صابر و قانع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ تعجب کے لیے چٹکی بجائی اور فرمایا: ''جب ان کی موت کا وقت آیا تو ایک دم رخصت ہو گئے، اس حال میں کہ نہ پیچھے زیادہ مال چھوڑا، نہ زیادہ رونے والیاں۔

بلا شبہ اس طرح کے گمنام اولیاء اللہ کی زندگی بڑی قابلِ رشک ہے، آج بھی ہماری یہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں۔

خلاصہ:

اس فرمانِ عظیم الشان میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت بیان فرمائی کہ اگر آدمی کو بظاہر کوئی شہرت حاصل نہ ہو، وہ بالکل گم نامی والی زندگی گذارتا ہو (خواہ اپنے اختیار سے ہو، یا غیر اختیاری طور پر) مگر ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں استقامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی

اطاعت و عبادت میں لگا رہا، تو وہ گم نام ہونے کے باوجود قابلِ رشک اولیاء اللہ میں شمار ہوتا ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق ایسے لوگ ہی عموماً تحاسد، تباغض اور تقابل وغیرہ سے محفوظ رہتے ہیں، لہٰذا ضرورت ہے کہ اس دورِ پرفتن میں ہم از خود اسبابِ شہرت سے دور رہ کر خاموشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور اپنے فرائضِ منصبی میں مشغول رہیں، اس کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہرت اور مقبولیت میسر ہو جائے تو مکمل احتیاط سے کام لیں اور دعاؤں کا خوب اہتمام کریں کہ ربِ کریم ہمیں مقبولیت عطا فرمانے کے بعد محرومیت سے محفوظ رکھے۔

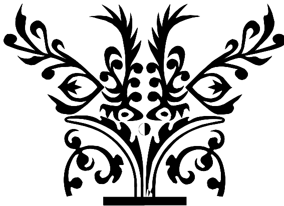
حق تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنے محبوب و مقبول بندوں میں شامل فرمائیں اور مقبولیت کے بعد مردودیت سے ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

۱۲/ ذی الحجہ/۱۴۳۴ھ

مطابق: ۱۸/ اکتوبر/۲۰۱۳ء، قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۴)

علماءِ حق کی پہچان اور ان کا مقام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ أُمَامَةَ البَاهِلِيِّ رضؓ قَالَ: " ذُکِرَ لِرَسُوۡلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم رَجُلَانِ، أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَ الآخَرُ عَالِمٌ، فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: " فَضۡلُ العَالِمِ عَلَی العَابِدِ کَفَضۡلِیۡ عَلٰی أَدۡنَاکُمۡ"، ثُمَّ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: "إِنَّ اللّٰہَ وَ مَلَائِکَتَهٗ وَ أَهۡلَ السَّمَاوَاتِ وَ الۡأَرۡضِ حَتّٰی النَّمۡلَةَ فِیۡ جُحۡرِهَا، وَ حَتّٰی الحُوۡتَ لَیُصَلُّوۡنَ عَلٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ الخَیۡرَ." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۳٤/کتاب العلم/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ راوی ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا، جن میں سے ایک عابد (عبادت گزار) اور دوسرا عالم تھا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عالم کو عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے کہ میری فضیلت تم میں سے اس شخص پر جو تم میں سب سے ادنیٰ درجہ کا ہو'' پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور آسمان وزمین کی تمام مخلوق حتیٰ کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں اس شخص کے لیے دعاءِ خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر (علم دین) کی تعلیم دیتا ہے۔

186

علماءِ حق کا وجود دنیا کی ضرورت:

حق تعالیٰ نے اِس کائنات کو اپنی یاد اور عبادت کے لیے سجایا ہے، دنیا کی یہ چمک دمک اور زیب وزینت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت ہی سے باقی ہے، جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا تو نظامِ عالم درہم برہم کردیا جائے گا کیوں کہ دنیا کا بھی یہ دستور اور اصول ہے کہ اگر کسی شہر میں باغیوں کی اکثریت ہوجائے تو پھر اس شہر کو تباہ کردیا جاتا ہے، اگرچہ حق تعالیٰ دنیا کے اس دستور کے مطابق اپنی رحمتِ کاملہ کی وجہ سے ایسا تو نہیں کرتے کہ جس علاقے میں اللہ تعالیٰ کے باغیوں کی اکثریت ہوجائے اسے تباہ کردیں، لیکن اگر دنیا کے سارے انسان اس کی بغاوت پر اُتر آئیں، جیسا کہ قیامت سے قبل ہوگا، تو پھر چوں کہ انسان کا مقصدِ تخلیق ہی فوت ہوجائے گا، لہٰذا دنیا کو بھی تباہ کردیا جائے گا، جیسے آج ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ اور شاندار کاریں جو بڑے شوق سے خریدی جاتی ہیں؛ مگر جب وہی عمدہ کاریں پرانی ہونے یا ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے بوسیدہ ہوجاتی ہیں اور اپنا مقصد پورا نہیں کرتیں، تو پھر ان کو کباڑ خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، یہی حال اس دنیا کا بھی ہوگا کہ جب اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا تو اس دنیا کو بھی ختم کردیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کی وجہ سے قائم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی معرفت کے بغیر نہیں ہوسکتی، جب کہ معرفت علم کے بغیر ممکن نہیں، اور علم علماءِ حق کے بغیر عموماً حاصل نہیں ہوتا، تو منطق کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دنیا بغیر عباداتِ الٰہی کے باقی نہیں رہ سکتی، اور عبادت معرفتِ الٰہی کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی، اور معرفت علمِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں، اور علم کا حصول علماءِ حق کے بغیر آسان نہیں، تو نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بغیر علماءِ حق کے باقی نہیں رہ سکتی، اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالی کسی کے محتاج نہیں، لیکن اس نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے، یہاں ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہے، ہر معلول کی کوئی نہ کوئی

علت ہے، ہر اثر کا کوئی مؤثر ہے، تو اس عالمِ اسباب میں تحت الاسباب یہ کہا جا سکتا ہے کہ علماء نہ ہوں گے تو علم نہ ہوگا، علم نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ہوگی تو اس کی عبادت نہ ہوگی، اس کی عبادت نہ ہوگی تو دنیا کو ختم کر کے قیامت قائم کر دی جائے گی، اس لیے علماءِ حق کا وجود ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں ہماری ایک دینی ضرورت کے علاوہ ہماری دنیوی ضرورت بھی ہے، دین ودنیا کے بقا اور تحفظ کے لیے علماءِ حق کا وجود انتہائی ضروری ہے۔

علماءِ حق ملت کے بڑے محسن ہیں:

علماءِ حق کی اہمیت اور ان کے مرتبہ ومقام کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں کتابِ ہدایت، علومِ نبوت اور حفظِ شریعت کے لیے بطورِ خاص منتخب فرمایا ہے، ارشاد باری ہے:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ (فاطر: ۳۲)

”پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے بطورِ خاص منتخب کیا۔“ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور علومِ نبوت کے بلا واسطہ وارث حضرات علماء ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں بھی ارشاد ہے کہ ”اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ“ (ترمذی، مشکوٰۃ: ۳۲) حاصل اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کے علوم کا مشغلہ اخلاص کے ساتھ نصیب فرمایا، یہ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور اولیاء ہیں۔ (معارف القرآن/ ج: ۷/ص: ۳۴۷)

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے حضراتِ علماء کو کتابِ ہدایت، علومِ نبوت اور شریعت کی حفاظت کے لیے بطورِ خاص منتخب فرمایا ہے، یوں تو دین وایمان اور قرآن کی حفاظت کرنا ہر مسلمان پر فرض اور ضروری ہے، لیکن عموماً علماءِ حق کے علاوہ اکثر لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں، الحمد للہ! علماءِ حق اپنی ذمہ داری کے مطابق دین وشریعت کے ہمیشہ سے محافظ وخادم

رہے ہیں، اس اعتبار سے بھی علماءِ حق ساری امت اور ملت کے بہت بڑے محسن ہیں، جیسے کسی بھی ملک کی سلامتی وحفاظت بظاہر سرحد پر موجود فوج سے ہوتی ہے ایسے ہی ملت کی سلامتی بظاہر علماء سے ہے، علماءِ ربانیین اللہ تعالیٰ کی فوج کے خوش نصیب سپاہی ہیں، اور عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ اور امتِ محمدیہ کو آفتابِ رسالت کے غروب ہونے کے بعد دینِ حق کی روشنی اُن ہی علماءِ حق کے چراغ سے حاصل ہوئی ہے، لہٰذا ان کا وجود تا قیامت ملت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

دانائے رومؒ فرماتے ہیں:

چونکہ شد خورشید و مارا کردہ داغ ☆ چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی جب سورج غروب ہوگیا اور ہم کو اپنی جدائی کا داغ دے گیا، تو اب اس کی جگہ چراغ کے استعمال کے سوا چارہ ہی کیا ہے، رحمتِ عالم ﷺ تو علم کے آفتاب وماہتاب ہیں، تو علماءِ حق اس آفتابِ علم کے روشن چراغ ہیں، آفتاب اور چراغ کی روشنی میں اگرچہ ظاہری طور پر زمین آسمان کا فرق ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور علماء معصوم نہیں، انبیاء عالمِ وحی ہوتے ہیں؛ جب کہ علماء عالمِ شریعت ہوتے ہیں، انبیاءِ کرام اللہ تعالیٰ کے براہِ راست شاگرد ہوتے ہیں؛ جب کہ علماء اللہ تعالیٰ کے شاگرد نہیں؛ بلکہ انبیاء کے وارث ہوتے ہیں، اسی لیے نبوی علوم کے انوار ایک ایسے روحانی تار کے ذریعہ ان کے قلوب تک پہنچتے ہیں، جس کا ایک سرا حضور ﷺ کے قلبِ اطہر میں ہے، تو دوسرا سرا ان علماءِ کرام کے دلوں میں ہے، لہٰذا آفتابِ نبوت کے بعد اب یہی علماءِ حق اس کے نائب اور علمِ نبوت کے ضامن اور محافظ ہیں، جن سے نورِ ہدایت اور علمِ شریعت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

علماءِ حق کی خاص پہچان:

لیکن پہلے علماءِ حق کو بھی پہچانئے! علماءِ حق کی خاص پہچان قرآنِ کریم نے یہ بیان فرمائی ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ۲۸)

علماءِ حق کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ خشیتِ باری کی صفت سے بطورِ خاص متصف ہوتے ہیں، آیتِ کریمہ میں لفظِ "إِنَّمَا" کی وجہ سے آیتِ کریمہ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے علماء کے علاوہ اور کوئی نہیں، کیوں کہ "إِنَّمَا" حصر کے لیے آتا ہے، مگر ابن عطیہؒ وغیرہ ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ لفظِ "إِنَّمَا" جیسے حصر کے لیے آتا ہے ایسے ہی کسی چیز کی خصوصیت بتانے کے لیے بھی آتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے کہ خشیتِ الٰہی کا وصف علماء کے علاوہ میں بھی ہوتا ہے، لیکن علماء کا یہ وصفِ خاص ہے، اس کے بغیر محض مختلف قسم کے علوم وفنون پڑھنے؛ بلکہ ان میں مہارت حاصل کر لینے سے بھی کوئی شخص عند اللہ عالم نہیں بن سکتا۔

حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ مولوی اُسی کو کہتے ہیں جو متقی بھی ہو، اور جو متقی نہیں، جس میں خشیتِ باری نہیں وہ مولوی کیسا؟ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

خشیت اللہ را نشانِ علم داں   آیت یخشی اللہ در قرآن بخواں

اللہ تعالیٰ کے خوف کو علم کا نشان اور اس کی خاص پہچان اور شان سمجھو! کیوں کہ خود قرآنِ کریم نے آیتِ کریمہ: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ میں اس کی گواہی دی ہے۔

صاحبو! درحقیقت علم وہی ہے جس کے ساتھ خشیتِ الٰہی کا نور ہو، ورنہ وہ "إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَجَهْلًا" کا مصداق ہوگا، اور ایسا علم نہ صرف بے سود ہے، بلکہ مضر بھی ہے، جو شخص جتنا بڑا عالم ہوگا وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں حضور ﷺ سے بڑا کوئی عالم نہیں، تو حضور ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا بھی کوئی نہیں، جیسا کہ حدیثِ پاک میں وارد ہے:

"وَاللّٰهِ! إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهٗ." (متفق علیه، مشکوٰۃ ۲۷)

خدا کی قسم! میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ خوف کرتا ہوں، حضور ﷺ کے بعد صحابہ، صلحاء اور علماء کا بھی یہی حال ہوتا ہے، وہی سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، اسی لیے انہیں بارگاہِ الٰہی سے خشیتِ الٰہی کا بطورِ انعام تمغہ (امتیازی اور اعزازی نشان) اور سند ملی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ یہ علماءِ حق کی سب سے بڑی خوبی اور خاص پہچان ہے۔

ایک واقعہ:

یہی وجہ ہے کہ علماءِ حق کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے جہاں اُن کے علمی کمالات نظر آتے ہیں وہیں ان کے خوفِ الٰہی کے واقعات بھی ملتے ہیں، مثلاً حضرت ربیع بن خثیمؒ ایک جلیل القدر تابعی اور تاریخ اسلام کے عظیم رجالِ کار اور علماءِ حقانی وربانی میں سے ہیں، اور مشہور صحابیِ رسول ﷺ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، حضرت ابن مسعودؓ اُنہیں دیکھ کر فرماتے تھے کہ "واللہ! اگر رسول اللہ ﷺ آپ کو دیکھتے تو ضرور آپ سے محبت فرماتے، آپؒ ایک دن اپنے استاد کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے جارہے تھے، لبِ دریا لوہاروں کی بھٹیاں تھیں، جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، وہ دیکھ کر اُنہیں قرآنِ کریم کی ایک آیت یاد آ گئی، جس میں ارشاد ہے:

﴿إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا﴾ (الفرقان: ۱۲)

یعنی دوزخ جب ان جہنمیوں کو دور سے دیکھے گی تو وہ جہنمی اس کا جوش وخروش سنیں گے۔ اس پر انہیں دوزخ کا خطرناک منظر یاد آ گیا، اور خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (تعلیقات رسالۃ المسترشدین: ۱۲۴، از: "کتابوں کی درسگاہ میں": ۴۵)

ان کا وہ حال ہوتا ہے جو کسی شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

کبھی آہ لب سے نکل گئی، کبھی اشک آنکھ سے ڈھل گئے
یہ تمہارے غم کے چراغ ہیں، کبھی بجھ گئے، کبھی جل گئے

علماءِ حق کی علامت:

غرض اہلِ علم کی امتیازی شان اور علماءِ حق کی خاص پہچان خشیتِ الٰہی کے وصف سے متصف ہونا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک ہی وصف علماءِ حق اُن تمام اوصاف کا جامع اور مجموعہ ہے جو امام غزالیؒ نے ''علماءِ آخرت'' کے عنوان میں بیان فرمائے ہیں، نفعِ عام کے پیشِ نظر یہاں اُن کا نقل کرنا مناسب ہے، آپؒ فرماتے ہیں کہ علماءِ حق یا علماءِ آخرت کی چند علامات یہ ہیں:

(۱) وہ اپنے علم سے دنیا نہ کماتے ہوں، کیوں کہ علم کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ دنیا کی فنائیت وحقارت کا احساس ہو، اور آخرت کی عظمت اور اس کا استحضار ہو۔

(۲) ان کے قول وعمل میں تعارض وٹکراؤ نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو نیکی کا حکم دیں اور خود ہی اس پر عمل نہ کریں، ارشادِ باری ہے:

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (البقرة: ٤٤)

یہ کیا غضب ہے کہ اوروں کو تو نیک کاموں کا حکم کرتے ہو اور خود اپنی ہی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت کعبؓ سے پوچھا کہ ''مَنْ هُمْ أَرْبَابُ الْعِلْمِ؟'' اہلِ علم اور علماءِ حق کون ہیں؟ تو فرمایا: ''اَلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ'' جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں، (یعنی جن کے قول وعمل میں تعارض نہ ہو) پھر سوال فرمایا کہ ''فَمَا أَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ؟'' علماء کے دلوں سے علم کو کونسی چیز نکال دیتی ہے؟ ''قَالَ: الطَّمَعُ'' (رواه الترمذي، مشكوٰة: ٣٧) فرمایا: دنیا کا لالچ علم کو دلوں سے نکال دیتا ہے۔

(۳) ایسے علوم وامور میں اخلاص کے ساتھ مشغول ہوں جو آخرت میں

کارآمد اور نفع بخش ہوں، اور ایسے علوم وامور سے اجتناب واحتراز کریں جو آخرت کے اعتبار سے نفع بخش نہ ہوں؛ بلکہ نقصان دہ ہوں۔

(۴) کھانے، پینے اور لباس کی نزاکتوں اور عمدگیوں کی طرف متوجہ نہ ہوں؛ بلکہ ان چیزوں میں میانہ روی اختیار کریں، اور بزرگوں کے سادہ طرزِ عمل کو اختیار کریں۔

(۵) امراء وحکام سے حتی الامکان دور رہتے ہوں، اگر ان کے ساتھ کسی صحیح غرض سے تعلق ہو تو تملق نہ ہو، ان کی چاپلوسی ہرگز نہ کریں، ورنہ فتنہ میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔

(۶) اصلاحِ قلب اور اصلاحِ باطن کی بہت فکر اور اہتمام کریں، اس کے بغیر نہ علم میں بصیرت پیدا ہوسکتی ہے نہ برکت۔

(۷) خرافات، رسومات، بدعات اور معاصی سے بہت ہی زیادہ احتیاط اور اہتمام سے بچتے رہیں، اور اگر کبھی بشریت کے تقاضے سے کوئی غلطی بھی ہو جائے تو فوراً توبہ کی طرف متوجہ ہوں، اور ظاہر بات ہے کہ مذکورہ تمام اوصاف وعلامات خوفِ الٰہی کے بغیر مشکل ہیں، اس لیے قرآنِ کریم نے علماءِ حق کا وہ بنیادی وصف بیان فرمایا جو دیگر اوصاف وعلامات کو شامل ہے۔

علماءِ حق کے لیے دنیا میں مقبولیت اور آخرت میں مغفرت ہے:

ان علامات، صفات اور اوصاف سے جو علماء متصف ہیں وہی دراصل علماءِ خیر، علماءِ حق اور علماءِ آخرت ہیں، کتاب وسنت میں ان کے بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ان کے لیے حق تعالیٰ کی جانب سے دنیا میں مخلوق کے درمیان مقبولیت ومحبوبیت اور آخرت میں بے حساب مغفرت کا وعدہ ہے، مثلاً مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''علماءِ حق کی فضیلت عابدین پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ پر۔'' مطلب یہ

ہے کہ جس طرح رحمتِ عالم ﷺ کی عظمت وفضیلت کا اندازہ ایک ادنیٰ امتی کے مقابلہ میں نہیں لگایا جا سکتا، اسی طرح عالم کی فضیلت کا اندازہ عابد کے مقابلہ میں نہیں لگایا جا سکتا۔ (دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے)

پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بلا شبہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور آسمان وزمین کی تمام مخلوق حتیٰ کہ چیونٹیاں اور مچھلیاں بھی ان کے لیے دعاءِ خیر کرتی ہیں۔“ کسی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

مچھلیاں پانی میں، ذرّے خاک میں، برگ وشجر نیک عالم کو دعا دیتے ہیں ہر شام وسحر

ظاہر ہے کہ جب اتنی ساری مخلوق جن میں لاتعداد معصوم فرشتے بھی ہیں ایک عالمِ دین کے لیے دعاءِ خیر اور دعاءِ مغفرت کرتے ہیں، تو پھر ان کی مغفرت کیوں نہ ہوگی، ضرور ہوگی، اور اس کی تائید دوسری احادیثِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عَنْ سَخْبَرَةَ الْأَزْدِيِّ رضی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى." (رواه الترمذی، مشکوٰة: ۳۴ / الفصل الثانی)

یعنی جس خوش نصیب نے (صدقِ نیت سے) علم طلب کیا تو یہ طلبِ علم اس عالمِ دین کے گذشتہ (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ علماء نے اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھی نیت سے علم طلب کرنے والے علماءِ حق کو گناہوں سے بچنے کی اور گذشتہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں گے، اور پھر دنیا میں علماءِ حق کو حق تعالیٰ اپنی مخلوق میں مقبولیت عطا فرمائیں گے تو آخرت میں مغفرت سے مالا مال فرمائیں گے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی ہے:

عَنْ ثَعْلَبَةَ بْنِ الْحَكَمِ الصَّحَابِيِّ رضی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِلْعُلَمَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِذَا قَعَدَ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ لِفَصْلِ عِبَادِهٖ: "إِنِّيْ لَمْ أَجْعَلْ عِلْمِيْ وَحِلْمِيْ فِيْكُمْ، إِلَّا وَأَنَا أُرِيْدُ أَنْ أَغْفِرَ لَكُمْ عَلٰى مَا كَانَ فِيْكُمْ، وَلَا أُبَالِيْ." (رواه

الطبرانی فی الکبیر ورواته ثقات، کما فی الترغیب: ۱/ ۱۰۱)

قیامت میں حق تعالیٰ اپنی (شان کے مطابق) کرسیِ خاص پر تشریف فرما ہوں گے، پھر علماء سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمائیں گے کہ ”میں نے اپنے علم وحلم سے تمہیں اس لیے نوازا تھا کہ میں چاہتا تھا کہ تمہاری کوتاہیوں کے باوجود تم سے درگذر کروں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ (حدیث قدسی نمبر:۱۳)

حضرت امام محمدؒ کا واقعہ:

حضرت امام محمدؒ کے متعلق منقول ہے کہ وفات کے بعد کسی نے اُنہیں خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ ”آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟“ فرمایا: ”مجھ سے کہا گیا: ”کیا چاہتے ہو؟“ تو میں نے عرض کیا: یا ”اللہ! میں تو صرف معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں بس!“ ارشاد ہوا کہ ”اے محمد! اگر ہمیں تم کو عذاب دینا ہوتا تو یہ علم عطا نہ کرتے۔“ صاحبو! جب خوابوں کی تعبیر کے علم پر سیدنا یوسف علیہ السلام کو دنیا کا تخت مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے علم پر حضرات علماء کو جنت کا تخت کیوں نہ ملے گا، واقعی اگر علماء اپنے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ بیدار ہو جائیں اور مطلوبہ صفات سے متصف ہو جائیں تو پھر حق تعالیٰ اُنہیں دنیا میں مقبولیت اور آخرت میں مغفرت اور جنت سے نوازکر دارین میں سرخ روئی عطا فرمائیں گے۔ اَللّٰهم اجعلنا منهم.

اخیر میں بارگاہِ الٰہی میں عرض ہے کہ اے اللہ! دنیا میں علماءِ حق کی صفات سے ہمیں اپنے کرم سے متصف فرما کر آخرت میں علماءِ حق میں شامل فرما لیجئے۔ آمین یا رب العالمین۔

۹/ ذی الحجہ/ شب جمعہ/ ۱۴۳۳ھ، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۳۵)

حقوقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "كُلُّ أُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ، إِلَّا مَنْ أَبٰی، قِیْلَ: "وَمَنْ أَبٰی؟" قَالَ: "مَنْ أَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ أَبٰی."

(رواه البخاری، مشکوٰۃ/ ص:۲۷/ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی؛ مگر وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس نے میرا انکار کیا، پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! انکار کرنے والا کون ہے؟'' فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ (امتی) جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے میرا انکار کیا۔''

حقوقِ مصطفیٰ ﷺ کی اہمیت:

اللہ رب العزت نے ہمیں بلا کسی استحقاق کے محض اپنی عنایت سے جس عظیم الشان

اور جلیل المرتبت نبی ﷺ کی امت میں پیدا فرمایا اس کا شکر اور تقاضا یہ ہے کہ اس نبی کے جو حقوق ایک امتی ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے ہیں، ہم اُنہیں جانیں اور اُنہیں ادا کرنے کا پورا اہتمام کریں، حقوقِ مصطفیٰ ﷺ کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اُنہیں جانے اور ادا کیے بغیر نہ ہمارے ایمان واعمال میں کمال پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہم رحمت عالم ﷺ کی ہدایات وتعلیمات سے کما حقہ فائدہ اٹھا کر دارین کی سرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں۔ حقوقِ مصطفیٰ ﷺ کی اسی عظمت واہمیت کے پیش نظر علماءِ امت نے قرآن وحدیث کی روشنی میں انہیں بالتفصیل بیان کیا، جن میں سے چار حقوق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پہلا حق تصدیق رسالت:

امت محمد ﷺ پر حقوقِ مصطفیٰ ﷺ میں سے پہلا حق تصدیق رسالت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لایا جائے، جس طرح اللہ رب العزت کی ربوبیت والوہیت اور اسلام کی حقانیت پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح رحمت عالم ﷺ کی نبوت ورسالت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر کامل اور مکمل ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (النساء: ۱۳۶)

اے حسنِ ازل سے پیمانۂ وفا باندھنے والو! اے اپنے معبود کی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کرنے والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لا کر اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرو۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ (الفتح: ۸-۹)

میرے محبوب! ہم نے آپ کو (دین حق کی) گواہی دینے والا اور (اہل ایمان کے

لیے جنت کی) خوشخبری دینے والا اور (بے ایمان کے لیے جہنم سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تا کہ (اے ایمان والو!) تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر (کامل اور مکمل) ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کو بزرگ سمجھو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

یہ پہلا حق ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا، اُسے ادا کیے بغیر تو کلمہ بھی مکمل نہ ہوگا، دیکھیے نا! اگر کوئی شخص ''لا الہ الا اللہ'' کا تو اقرار کرے؛ لیکن ''محمد رسول اللہ'' پر ایمان نہ لائے، تو نہ اس کا کلمہ مکمل ہے، نہ ایمان معتبر ہے، کلمہ اور ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت پر بھی ایمان لایا جائے، اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا اور آخری رسول مان کر آپ ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کے صحیح اور سچا ہونے کا یقین رکھے، کیوں کہ جس طرح آپ ﷺ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی ہدایات اور تعلیمات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اس سلسلہ میں ہمارا یقین یہ ہو کہ ہماری آنکھ غلط دیکھ سکتی ہے، کان غلط سن سکتے ہیں، زبان غلط چکھ سکتی ہے، ہاتھ چھونے اور محسوس کرنے میں غلطی کر سکتے ہیں؛ لیکن جو ہدایات وتعلیمات صحیح اور مستند طریقہ پر رحمت عالم ﷺ سے ثابت ہیں وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان و یقین ایسا ہی تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہے کہ حضور ﷺ کے تین صاحب زادوں میں حضرت قاسم اور حضرت عبد اللہ (جن کو طاہر و طیب بھی کہا جاتا ہے) تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھے، لیکن تیسرے صاحب زادے حضرت ابراہیم حضور ﷺ کی ام ولد حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے تھے، جب حضرت ابراہیم کا بھی انتقال ہو گیا تو حضرت ماریہ بہت زیادہ رنجیدہ ہوئیں، حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ کیوں اتنی حزین وغمگین ہو؟ ہمارا بیٹا تو جنت کے باغوں میں ٹہل رہا ہے، آؤ! میں تم کو جنت میں ٹہلتا ہوا دکھلا دوں، اس پر حضرت ماریہ نے عرض کیا:

نہیں، مجھے نہیں دیکھنا، مجھے اب صبر آ گیا، بعد میں کسی نے اس کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا: اگر میں دیکھ لیتی تو ایمان بالغیب نہ رہتا، کیوں کہ میرا ایمان و یقین یہ ہے کہ آنکھوں کا دیکھا ہوا غلط ہو سکتا ہے، لیکن حضور ﷺ کا فرمان غلط نہیں ہو سکتا۔ (خطباتِ منوّر: ۳/۱۶۲)

ہمارا بھی ایمان و یقین ایسا ہی ہونا چاہیے، مثلاً آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات ہیں کہ سچ میں نجات اور جھوٹ میں ہلاکت ہے، وغیرہ، اب حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں؛ مگر ان ہدایات وتعلیمات کے سچا ہونے پر ہمارا یقین ہو، اور اسی کے مطابق عمل بھی ہو، تو زندگی میں ایک صالح انقلاب پیدا ہوگا، اور یہ ایمانِ کامل کی علامت ہونے کے ساتھ ایمان واعمال میں حلاوت کا سبب بھی ہے۔

حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رضی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ رَسُوْلًا." (مسلم، مشکوٰۃ المصابیح / ص:۱۲)

ترجمہ: جس نے دل سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اسلام کی حقانیت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو کما حقہ مان لیا، اس نے ایمان کی حلاوت کو پالیا۔

اس کے برخلاف جس شخص کا آپ ﷺ پر ایمان مکمل نہیں؛ بلکہ کھوکھلا ہے، دوسرے لفظوں یوں کہیے کہ رسول ﷺ کی ذات پر ایمان ہے؛ مگر رسول اللہ ﷺ کی بات پر ایمان نہیں، یا کمزور ایمان ہے، تو وہ یہی سوچے گا کہ آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات جو بھی ہوں؛ مگر لذت حرام میں، کثرت سود میں اور نفع جھوٹ میں ہے، (نعوذ باللہ من ذلك) ظاہر ہے کہ ایسا شخص آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات سے کیسے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ جس کا آپ ﷺ کی ذات اور ہدایات پر مکمل ایمان نہیں۔ اس لیے آپ ﷺ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا و آخری رسول مان کر آپ ﷺ کی تمام ہی ہدایات

کے صحیح ہونے کا مکمل یقین رکھیں اور ان کے مطابق ساری زندگی عمل کریں، امت محمدیہ پر حقوقِ مصطفیٰ ﷺ میں سے پہلا حق یہی ہے۔

دوسرا حق عظمت:

دوسرا حق امتِ محمدیہ پر حقوقِ مصطفیٰ ﷺ میں سے جو آیت کریمہ میں بیان ہوا وہ یہ ہے کہ ہمارے سینوں میں آپ ﷺ کی بے پناہ توقیر اور عظمت ہو، کیوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر کامل اور مکمل ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت بھی ضروری ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ﴾ (الفتح : ۹)

ایمان کے ساتھ عظمت اس لیے بھی ضروری ہے کہ نبی اور امتی کا تعلق محض قانونی نہیں؛ بلکہ ایمانی و روحانی بھی ہے، اور اس تعلق میں نمایاں پہلو تعظیم و توقیر کا ہے، اسی کے پیشِ نظر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾

(الحجرات : ۱-۲)

ان آیات میں بطورِ خاص اہل ایمان کو دو آداب تلقین فرمائے گئے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے قول و عمل میں سبقت نہ کرو۔ یہی عظمت کا تقاضا ہے۔

(۲) اور دوسرا ادب یہ تلقین کیا گیا کہ اپنی آواز کو پیغمبر ﷺ کی آواز سے پست رکھو کہ یہ ادب و عظمت کے خلاف ہے، ان آداب و آیات کے نازل ہونے کے بعد حضرات صحابہ ؓ کا حال یہ تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ باوضو حاضر

ہوتے، اور مجلس نبوی میں اس طرح سکون سے بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں، مجلس نبوی کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے صحابیٔ رسول ﷺ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”كَاَنَّ عَلٰى رُؤُوْسِنَا الطَّيْرَ.“ (ابن ماجه، مشكوٰة/ص:١٤٩/ باب دفن الميت)

”گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے تھے۔“ یعنی انتہائی سکون اور خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

اگر حضرات صحابہ کسی بات پر حضور ﷺ کی خفگی و ناراضگی محسوس کرتے تو فوراً کہتے: ”میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔“ (مجھے سب کچھ منظور ہے؛ مگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی ہرگز گوارا نہیں)

”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَ غَضَبِ رَسُوْلِهٖ.“ (مشكوٰة / ص:٣٢)

حتیٰ کہ جب حضور ﷺ سے بات کرنے کی نوبت آتی تو آواز بھی اتنی پست ہوتی کہ صرف حضورِ اکرم ﷺ ہی ان کی بات سن سکیں، اور انداز بھی ایسا گویا راز کی باتیں کی جارہی ہیں۔ (تفسیر انوار البیان ص ۱۶۷)

واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ ؓ کے دل میں رحمت عالم ﷺ کی جو عظمت تھی اور ان کے عمل سے ادب و احترام کا جو اظہار ہوتا تھا، انسانی تاریخ میں کہیں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی، اور اس بات کا اعتراف بہت پہلے رئیس مکہ عروہ بن مسعود ثقفی (جو بعد میں مسلمان ہو گئے، انہوں) نے کیا، جب انہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرات صحابہ ؓ کے دلوں میں عظمتِ رسول ﷺ کا بے پناہ جذبہ دیکھا، تو اسے مکہ واپس جا کر اپنی قوم کے سامنے اس طرح بیان کیا:

”اَيْ قَوْمِ! لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَى الْمُلُوْكِ، وَ وَفَدْتُ عَلٰى قَيْصَرَ وَ كِسْرٰى وَ النَّجَاشِيِّ، وَاللّٰهِ! اِنْ رَاَيْتُ مَلِكًا قَطُّ يُعَظِّمُهٗ اَصْحَابُهٗ مَا يُعَظِّمُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ

ﷺ مُحَمَّدًا، وَاللّٰهِ ! إِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ، فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَ جِلْدَهٗ، وَ إِذَا أَمَرَهُمُ ابْتَدَرُوْا أَمْرَهٗ، وَ إِذَا تَوَضَّأَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْءِهٖ، وَ إِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهٗ، وَ مَا يُحِدُّوْنَ إِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهٗ."

(بخاری/ص:۳۷۹ / المجلد الأول/ باب الشروط فی الجهاد والمصالحة)

ترجمہ: اے لوگو! (اللہ کی قسم) میں بادشاہوں اور قیصر وکسریٰ ونجاشی کے درباروں میں گیا ہوں، مگر بخدا! میں نے کبھی کہیں کسی بھی بادشاہ کو ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے درباری اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی کہ محمد ﷺ کے صحابہ اُن کی کرتے ہیں، حد یہ ہے کہ آپ کا تھوک بھی ان کے ہاتھ پر ہی گرتا ہے، جسے وہ اپنے چہرے اور بدن پر مل لیا کرتے ہیں، جب ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ اس کو بجالانے میں جلدی کرتے ہیں، جب آپ وضو کرتے ہیں تو آپ کے مستعمل پانی کو لینے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو عظمت کے پیش نظر آپ کے سامنے اپنی آواز کو پست کرلیتے ہیں، وہ آپ کی طرف تیز نظر سے دیکھتے تک نہیں۔

غرض، حضرات صحابہؓ کے مقدس دلوں میں رحمت عالم ﷺ کی بے پناہ عظمت تھی، اور جیسے آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں حضرات صحابہؓ آپ ﷺ کی توقیر وتعظیم کرتے تھے ایسے ہی ہمارے لیے آج بھی آپ ﷺ کی توقیر وتعظیم ضروری ہے۔

عظمتِ رسول ﷺ کا تقاضا:

آج عظمتِ رسول ﷺ کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پہنچائے ہوئے تمام احکام اور ارشاد فرمودہ کلام (جو صحیح اور مستند طریقوں سے ثابت ہو اس) کی عظمت ہمارے سینوں میں ہو، اور جس طرح آپ ﷺ کی موجودگی میں حکم تھا کہ ﴿لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ آپ ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو، کہ یہ عظمت اور ادب کے خلاف ہے، اسی طرح آج آپ ﷺ کے روضۂ اقدس کے پاس آواز بلند کرنا، حتیٰ کہ بلند

آواز سے صلوٰۃ وسلام پیش کرنا عظمت وادب کے خلاف ہے۔ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ یہ دربار ہے نبی کا ☆ خطرہ ہے بہت سخت یہاں بے ادبی کا

نیز جب آپ ﷺ کلام فرماتے تھے تو اسے ادب وعظمت سے سننا واجب تھا، اسی طرح آج بھی جب آپ ﷺ کا کلام یعنی حدیث وغیرہ سنائی اور بیان کی جائے تو ادب وعظمت کے ساتھ اسے بھی سننا ضروری ہے، اس موقع پر شور وشغب کرنا اور بلا کسی عذر کے چلے جانا خلافِ ادب بلکہ محرومی ہے۔

الحمد للہ! ہمارے علماء نے اس کا بہت اہتمام کیا، چنانچہ امام مالکؒ جیسے جلیل القدر محدث وفقیہ کا حال یہ تھا کہ جب حدیث کا درس دینا ہوتا تو غسل کرکے تشریف لاتے، اچھے کپڑے زیب تن فرماتے، عمدہ خوشبو لگاتے، اور بہت ہی وقار اور احترام کے ساتھ حدیث کا درس دیتے۔

ایک مرتبہ دورانِ درسِ حدیث ایک بچھو کپڑے میں گھس گیا، بچھو نے پشت میں کئی ڈنک مارے، تکلیف کی شدت سے آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا؛ لیکن درسِ حدیث کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا، آپؒ نے اسے عظمتِ حدیث کے خلاف سمجھا، درس ختم ہونے کے بعد جب کرتہ کے اندر دیکھا تو بچھو اور اس کا ڈنک نظر آیا۔

(الدیباج المذہب/ص:۱۹، از:"پیام سیرت"/ص:۲۵۹)

گویا ان کے یہاں بچھو کے کاٹنے کی تکلیف تو معمولی چیز تھی؛ مگر کلامِ مصطفیٰ ﷺ کی عظمت بڑی اہم بات تھی۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اسی طرح جمعیت علماءِ ہند کے صدر اور متحدہ ہندوستان کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ایک بڑا نصیحت آموز واقعہ ہے کہ آپؒ جامعہ امینیہ دہلی میں دورۂ

حدیث شریف پڑھاتے تھے، وہاں ایک سال دورہ میں مولوی عبدالحق نامی طالب علم نے ایک خواب دیکھا، درسِ حدیث کی مسند پر مفتی صاحب کی جگہ حضور ﷺ تشریف فرما ہیں، ریش مبارک سفید ہے اور مسلم شریف کی ایک حدیث پر محدثانہ کلام فرما رہے ہیں، صبح طالب علم نے اجازت لے کر حضرت سے جب خواب بیان کیا تو سنتے ہی مفتی صاحب اپنی مسند سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: مولوی عبدالحق! قبلہ رُخ کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہو کہ واقعی تم نے اس طرح خواب دیکھا ہے، جب انہوں نے حکم کے مطابق کیا تو فوراً مفتی صاحب مسند سے ہٹ کر سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا: ''مولوی عبدالحق! خواب تو سچا ہے، مگر تمہارا ایمان کمزور ہے، لہٰذا اس کی فکر کرو، کیوں کہ تم نے حضور ﷺ کی داڑھی سفید دیکھی ہے، حالاں کہ وہ سیاہ تھی۔'' اس کے بعد مفتی صاحبؒ ادب اور عظمت کی وجہ سے اس مسند پر نہ بیٹھے، معاملہ اگرچہ خواب کا تھا، لیکن بات ادب وعظمت کے اعلیٰ مقام کی تھی۔ (کرنیں:۷۹)

صاحبو! حضور ﷺ کی یہ تعظیم بھی تقویٰ کی اہم علامت ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم میں شعائر اللہ کی تعظیم کو دل کے تقویٰ کی علامت قرار دیا گیا، چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج: ۳۲)

اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم دل کے تقویٰ کی نشانی ہے۔ اب یہ شعائر اللہ کیا ہیں؟ تو اس سلسلہ میں مختلف اقوال منقول ہیں، اتنی بات ضرور ہے کہ ہر وہ چیز جو ہدایت وعبادت کا ذریعہ ہے وہ شعائر اللہ میں داخل ہے، منجملہ ان کے چار چیزیں نہایت اہم ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں چار چیزیں اعظم شعائر اللہ سے ہیں یعنی اللہ کے شعائر میں چار چیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے:

۱- کلام اللہ ۲- حضرت محمد رسول اللہ ۳- کعبۃ اللہ ۴- نماز۔ ان کی تعظیم وہی کرے گا جس کا دل تقویٰ سے مالا مال ہوگا۔ (گلدستۂ تفاسیر/ج:۶/ص:۵۵۲)

معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی عظمت دل کے تقویٰ کی زبردست علامت ہے،

اگر پہلے حق کی ادائیگی کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا، تو اس حق کی ادائیگی کے بغیر تقویٰ مکمل نہیں ہو سکتا۔

تیسرا حق محبت:

اس کے بعد امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر حقوقِ مصطفیٰ ﷺ میں سے تیسرا اہم حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ سے ایسی محبت کی جائے جو اپنی ذات، اہل وعیال، مال ومنال اور سب سے بڑھ کر ہو، قرآن پاک میں اس حق کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبۃ: ۲۴)

میرے محبوب! اپنی امت کو بتلا دیجیے کہ تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبت کسی اور کی نہیں ہونی چاہیے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے،'' اور فرمایا:

''یہ محبت ہر عزیز اور پیاری چیز کی محبت پر مقدم ہے۔''

(تفسیر قرطبی/ج:۸/ص:۹۵، از: ''نبی کریم ﷺ سے محبت اور اس کی علامتیں'' ص:۲۲)

اس لیے کہ محبت کے چاروں اسباب جمال، کمال، اتصال اور نوال کامل اور مکمل طور پر آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں موجود تھے، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ محبت آپ ﷺ سے کی جائے، آپ ﷺ سے ایسی محبت کی جائے جیسے حضرات صحابہؓ نے کر کے دکھلائی۔ واقعہ یہ ہے کہ رحمت عالم ﷺ سے شرعی، طبعی، عقلی، اختیاری اور غیر اختیاری غرض ہر طرح سے سب سے زیادہ اور سب سے سچی محبت رکھنے والے بلا مبالغہ حضراتِ صحابہؓ ہی تھے، ان کی محبت میں فدائیت اور فنائیت تھی، اللہ تعالیٰ

اوراس کے رسول ﷺ سے زیادہ انہیں کوئی محبوب نہ تھا، شاعر کہتا ہے:

آپ کی جس میں ہو نہ محبت　　دل ہے وہ ایمان سے خالی
حبِ نبی ہے سب سے مقدم　　**صلی اللّٰہ علیه و سلم**

حضراتِ صحابہؓ کے مقدس قلوب حضور اقدس ﷺ کی محبت سے کس قدر لبریز تھے اس کا اندازہ ان کی سیرت سے لگایا جاسکتا ہے، ان کے حالات میں عجیب واقعات ملتے ہیں۔

محمد مصطفیٰ ﷺ کے محبین کا حسین تذکرہ:

اگر اس موقعہ پر محمد عربی ﷺ کے محبین کا بطورِ نمونہ حسین تذکرہ کیا جائے تو سر فہرست سیدنا صدیق اکبرؓ کا نام نمایاں ہوگا، ابتداءِ اسلام کا ایک مثالی واقعہ یہ ہے کہ آپؓ کو دینِ حق کے خاطر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، آپؓ کے چہرے پر پھٹے ہوئے جوتوں سے مسلسل ضربیں لگائی گئیں اور سینہ پر سوار ہوکر اس قدر مارا گیا کہ چہرے کے اعضاء اور خدوخال کی تمیز مشکل ہوگئی، قبیلہ کے لوگ آپؓ کو اس حال میں ایک کپڑے میں ڈال کر گھر لائے، بے ہوشی طاری تھی، موت کا اندیشہ تھا، مگر شام کے وقت جب انہیں ہوش آیا، تو اپنی فکر نہ کی، سب سے پہلے یہی پوچھا: ''میرے محبوب ﷺ کا کیا حال ہے؟'' جب آپ ﷺ کی خیریت کی خبر سنائی گئی تب بھی اطمینان نہ ہوا، کہا:

" فَإِنَّ لِلّٰهِ عَلَيَّ أَنْ لَا أَذُوقَ طَعَامًا، وَ لَا أَشْرَبَ شَرَابًا، أَوْ آتِيَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ." (البداية و النهايه/ج:۲/ص:۲۹۰)

اللہ کی قسم! میں اس وقت تک کھانے پانی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب تک حضور اکرم ﷺ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن نہ کرلوں۔

ایسے ہی محبین میں حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابیؓ بھی تھے، آپؓ تو نہایت مخلص صحابی تھے؛ مگر آپؓ کا والد منافق تھا، اور آپؓ پر اپنے والد کا منافق ہونا بھی ظاہر ہوگیا تھا،

ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں یہ افواہ پھیلی کہ حضورِ اکرم ﷺ عبداللہ بن ابی کے نفاق کی وجہ سے اس کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر حضرت عبداللہؓ خود حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ''حضور! سننے میں آیا ہے کہ آپ میرے والد کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، اگر آپ کا یہ منشا ہو تو میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے ابھی خدمت اقدس میں پیش کرتا ہوں۔''

اسی طرح اس سلسلہ میں اس خاتون کا حیرت انگیز واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس کو غزوۂ اُحد کے موقع پر باپ، بھائی اور پھر شوہر کی شہادت کی خبر دی جاتی رہی؛ مگر وہ ان سب کو نظر انداز کر کے رسول اللہ ﷺ کی خیریت پوچھتی رہیں، بالآخر جب انہیں آپ ﷺ کی خیریت سنائی گئی، تو اب زیارت کے لیے بے چین ہوگئیں، پھر زیارت کے بعد جب آپ ﷺ کو سلامت پایا، تو کہنے لگیں: "كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ." (البداية والنهاية/ج:۳/ص:۱۸۹)

میرے محبوب! آپ کے سلامت ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے، یقیناً ان حضرات صحابہؓ کے نزدیک اپنی ذات سے، باپ سے اور اہل وعیال سے زیادہ آپ ﷺ محبوب تھے، ہمیں حضور ﷺ سے محبت کا طریقہ وسلیقہ حضرات صحابہؓ سے ہی سیکھنا چاہیے، پھر انہوں نے محبت میں آپ ﷺ کے مرتبہ ومقام کا بھی لحاظ رکھا، اور آپ ﷺ کی پسند و ناپسند کا بھی، لہٰذا ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ ہماری محبت کے ہرگز محتاج نہیں، ہم گنہگار آپ ﷺ سے محبت کریں یا نہ کریں، اس سے آپ ﷺ کی عظمت ورفعت میں کوئی فرق آنے والا نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ تو حبیب اللہ ہیں، اور اسی پر بس نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کے سچے محبوب کو اپنا محبوب بنانے کا فیصلہ فرمالیا ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ۳۱)

''اے میرے محبوب! آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میرا

اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اپنا محبوب بنالیں گے۔‘‘

اس لیے آپ ﷺ کو تو ہماری محبت کی ضرورت نہیں؛ البتہ ہمیں حصولِ ثمرات اور دارین کی نجات کے لیے آپ ﷺ سے محبت کی بہت ہی زیادہ ضرورت ہے۔

حبِ نبوی کے ثمرات وفوائد:

چنانچہ حضورِ اکرم ﷺ کی محبت کے ثمرات وفوائد میں سے ایک اہم ثمرہ وفائدہ دنیا میں ایمان کی حلاوت ہے، اور دوسرے آخرت میں حضورِ اکرم ﷺ کی معیت ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الإِيمَانِ، مَن كَانَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِواهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْداً لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ، كَما يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ." (متفق عليه، مشكوٰة / ص: ١٢)

ایمان کی حلاوت اور مٹھاس اس خوش نصیب نے حاصل کرلی جس میں تین خصلتیں موجود ہوں:

۱- اوّل یہ کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہو۔

۲- دوم یہ کہ جس کسی سے بھی محبت کرے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے محبت کرے۔

۳- سوم یہ کہ جس خوش نصیب کو اللہ تعالیٰ نے کفر کے اندھیرے سے بچا کر نورِ ایمانی سے منور فرمایا وہ اسلام چھوڑنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

یہاں ایمان کی حلاوت کے حصول کے جو اسباب بیان فرمائے ان میں پہلا ہی سبب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی سچی محبت ہے، اس محبت کے نتیجہ میں عبادات و اعمال میں ایک طرح کی حلاوت نصیب ہوگی، حتیٰ کہ پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا مندی کے خاطر ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرنا بھی آسان ہوجائے گا۔ آج اگر ہمیں عبادات واعمال میں مزہ نہیں آتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ہماری محبت میں کچھ خامی ہے، اسی لیے کہا ہے:

محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
جو لوگ محمد کے وفادار نہیں ہیں
اللہ کی رحمت کے وہ حق دار نہیں ہیں
حاصل ہے جنہیں عشق محمد کا خزانہ
کونین کی دولت کے وہ طلبگار نہیں ہیں

حبِ نبوی کا دوسرا اہم ثمرہ اور فائدہ آخرت میں یہ ہوگا کہ اس کے نتیجہ میں رحمتِ عالم ﷺ کی معیت نصیب ہوگی۔ حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے: ’’یارسول اللہ! قیامت کب آنے والی ہے؟‘‘ آپ نے فرمایا: ’’تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟‘‘ عرض کیا: "إِنِّي أُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ." ’’میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ." (متفق عليه، مشكوٰة/ص:٤٢٦ / باب الحب في الله ومن الله) جس کی محبت تمہارے دل میں ہے تمہیں قیامت میں اس کی معیت ملے گی۔

پتہ چلا کہ دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہے تو کل قیامت میں ان ہی کی معیت نصیب ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی دولت اور کیا ہوسکتی ہے۔

(رزقنا اللّٰہ تعالیٰ إیاہ)

لیکن یاد رکھو کہ حبِ رسول ﷺ کی سب سے بڑی علامت آپ ﷺ کا اتباع و اطاعت ہے، اس کے بغیر محبت دراصل منافقت ہے

نہ کر دعویٰ محبت کا، اطاعت گر نہیں تجھ میں
سند تیری محبت کی، یہی معلوم ہوتی ہے

چوتھا حق اطاعت:

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ امت محمدیہ پر حقوقِ مصطفیٰ ﷺ میں سے چوتھا حق آپ کی اطاعت و اتباع کرنا ہے، یعنی آپ ﷺ کے دیے ہوئے تمام احکام کو قبول کرنا اور ان کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ میں عمل کرنا، اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا، اس حق کو بھی قرآنِ کریم میں کئی مواقع پر بیان کیا گیا، ایک مقام پر فرمایا

﴿وَ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

اس آیت کریمہ میں اسی حق کو بیان کیا گیا ہے، اب یہاں اطاعت واتباع کا فرق بھی سمجھ لینا چاہیے، کہ اطاعت کا مطلب ہے دیے ہوئے حکم کی تعمیل کرنا، مگر اتباع کا مطلب پیروی کرنا، خواہ اس کام کا باقاعدہ حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔ اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت محبت کی علامت ہے، تو اتباع انتہائی محبت یعنی عشق کی علامت ہے، اس کے بغیر محبت کا دعویٰ محض دکھلاوا بلکہ منافقت ہے، وہی محبت معتبر ہے جس کے ساتھ آپ ﷺ کی کامل اطاعت اور مکمل اتباع بھی ہو، اور حضور پاک ﷺ سے ایسی محبت جو اطاعت واتباع کے ساتھ ہو اس کا ایک بہت بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوتی ہے، دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ گناہوں کی معافی اور مغفرت ملتی ہے، اور تیسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ یہ اطاعت حصولِ جنت کا سبب ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۳۱)

محبوبم! کہہ دیجیے! کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو اور اس کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے جو تمہارے بس میں نہیں؛ البتہ اگر تم میری اطاعت اور اتباع کرلو، تو اس کے نتیجہ میں خود رب العالمین تم سے محبت کرنے لگے گا، پھر تمہارے گناہوں کو بھی معاف کردے گا، کہ وہ بڑا ہی غفور ورحیم ہے۔

آیت کریمہ میں حضور اکرم ﷺ کے اتباع پر دو عظیم فوائد یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور گناہوں کی مغفرت بیان فرمائے گئے۔ دوسرے مقام پر حضور اکرم ﷺ کی اطاعت پر جنت کی بشارت آئی ہے۔

جس کی تفصیل روایتوں میں اس طرح ہے کہ حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو بھی دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضور ﷺ سے بہت ہی زیادہ محبت تھی، ایک مرتبہ خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''یارسول اللہ! آپ مجھے میری جان اور اہل و عیال سے بھی بہت ہی زیادہ عزیز ہیں، سچی بات یہ ہے کہ گھر بیٹھے جب آپ کی یاد آتی ہے تو مجھے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک حاضر خدمت ہو کر دیدار سے مشرف نہ ہو جاؤں، لیکن جب میں اپنی اور آپ کی موت کا تصور کرتا ہوں تو اس خیال سے فکر مند ہو جاتا ہوں کہ آپ تو جنت کے سب سے اعلیٰ مقام پر ہوں گے، اور مجھے اپنے بارے میں کچھ معلوم نہیں، پھر اگر جنت میں اللہ کے فضل سے داخل کر بھی دیا گیا، تو آپ کے اور میرے مقام میں بہت فرق ہوگا، لہٰذا وہاں آپ کا دیدار نہ ہو سکے گا، اور جس جنت میں آپ کی زیارت نہ ہو، وہ جنت بھی کس کام کی!'' اس موقع پر یہ آیت کریمہ لے کر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ (النساء: ۶۹)

اس آیت میں اطاعت کرنے والوں کے لیے جنت کی بشارت آئی ہے۔ (معالم التنزیل:۱/۴۵۰،از:تفسیر انوارالبیان:۱/۶۴۷)

مذکورہ حدیث میں بھی اسی کی وضاحت ہے،فرمایا:"کُلُّ أُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبٰی" میری تمام امت (اجابت) جنت میں داخل ہوگی؛مگر وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس نے انکار کیا، آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ وہ کون آدمی ہے جس نے انکار کیا؟ فرمایا:"مَنْ أَطَاعَنِیْ دَخَلَ الجَنَّةَ" جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا،اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے دراصل میرا انکار کیا۔

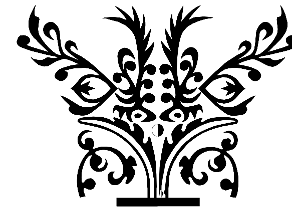
معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی اطاعت واتباع اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت، مغفرت، اور دخولِ جنت کا ذریعہ ہے، اور اِن چیزوں کا حصول آپ ﷺ کے حقوق کو ادا کیے بغیر ممکن نہیں، اس لیے دارین کی سرخروئی حاصل کرنے کے لیے حقوقِ مصطفیٰ ﷺ کو مکمل طور پر ادا کرنا لازم اور ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائیں۔آمین یا رب العالمین

۱۶/ جمادی الاولیٰ/۱۴۳۴ھ

مطابق:۲۹/ مارچ/۲۰۱۳ء، قبل الجمعۃ، بزم صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَهُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۶)

شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ عِظَمَ الجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ البَلَاءِ، وَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَ مَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ." (رواه الترمذی و ابن ماجه، مشکوٰۃ/ص: ۱۳۶/ باب عیادة المریض)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بڑی جزاء بڑی بلا (آزمائش) کے ساتھ ہوتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنا دوست بنالیتا ہے تو اس کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر جو مصائب وبلیات میں بھی (اللہ تعالیٰ سے ناراض ہوکر شکوہ شکایت نہیں کرتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے وہ) راضی رہتا ہے، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوجاتی ہے، اور جو آزمائش میں (اللہ تعالیٰ سے) ناراض ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہوجاتے ہیں۔(اللّٰهم إنا نسئلك العفو و العافيه)

شانِ مصطفیٰ ﷺ در سورۃ الضحیٰ:

اللہ رب العزت نے رحمت عالم ﷺ کو اپنی خاص عنایت ورحمت سے جوشان

اورمرتبہ ومقام عطا فرمایا، ساری کائنات میں اس کی کوئی نظیر ومثال نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ اس لیے شانِ مصطفیٰ ﷺ کو بیان کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے دنیا کی اعلیٰ ترین خوشبو مشک وعنبر وغیرہ کی توصیف وتعریف بیان کرنا، جس طرح یہ چیزیں اپنی تعریف کی محتاج نہیں، اسی طرح سرکارِ دوعالم ﷺ بھی ہماری تعریف کے محتاج نہیں، لہٰذا ہم اگر ان کی تعریف وتوصیف کریں تو اس سے شانِ مصطفیٰ ﷺ میں اضافہ ہوجائے ایسا نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ کا مرتبہ ومقام تو پہلے ہی سے نہایت ہی عظیم الشان ہے، اسی لیے شاعر اسلام سیدنا حسان ؓ نے کیا خوب فرمایا:

مَا إِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِي ☆ ولٰكِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِي بِمُحَمَّدٍ

میں اپنے مضمون اور بیان سے تو شانِ مصطفیٰ ﷺ میں اضافہ کرنے والا نہیں ہوں؛ البتہ شانِ مصطفیٰ ﷺ کو بیان کرنے سے میرے بیان کی قدر ومنزلت ضرور بڑھ جائے گی، کیونکہ شانِ مصطفیٰ ﷺ وہ عظیم الشان عنوان ہے جس کو صحابہ کرام ؓ اور ساری امت کے صلحاء، فقہاء، علماء، اولیاء اور عشاق سے بڑھ کر بہترین طریقے پر خود رب العالمین نے اپنے کلام مبین میں مختلف مقامات پر بیان فرمایا، تب ہی تو حضرت حالیؒ نے کہا ہے کہ ”ہمہ قرآن درشانِ محمد“ سارے قرآن میں محمد ﷺ کی شان نظر آتی ہے، اس لیے شانِ مصطفیٰ ﷺ کو بیان کرنے کے لیے قرآن سے بہتر اور کوئی کتاب ہو نہیں سکتی، قرآنِ کریم نے محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان کو مختلف مقامات پر جس حسن وخوبی کے ساتھ انداز وعنوان بدل بدل کر بیان کیا ہے، ان میں ایک مقام سورۃ الضحیٰ ہے۔

سورۃ الضحیٰ کا شانِ نزول:

یہ سورت خاص اس موقع پر نازل ہوئی جب کہ مشرکین مکہ نے شانِ مصطفیٰ ﷺ میں توہین کی۔ ویسے علماءِ مفسرین نے اس کے شانِ نزول میں مختلف واقعات بیان فرمائے ہیں۔

منجملہ ان کے ایک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب بعثت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے مشرکین مکہ کو توحید کی دعوت دینا شروع کیا، تو اس وقت سعادت مندوں نے تو آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کرلیا؛ لیکن شقاوت پسندوں نے آپ ﷺ کی تردید وتکذیب کی، اور اسی سلسلہ کو مزید تقویت دینے کے لیے انہوں نے ایک گروپ تیار کرکے خاص مدینہ کے اہل کتاب یہود کے پاس بھیجا، (جس میں بطورِ خاص عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث بھی شامل تھے) کہ ہمارے یہاں ہمارے ہی ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، ہم نے اس کی تردید وتکذیب کی ہے، تم لوگ اہل کتاب ہو، تمہارے پاس آسمانی کتابوں کا علم ہے، اور تم نبیوں کی علامتوں سے بھی واقف ہو، اس لیے تم ہمیں کوئی ایسی تدبیر بتلاؤ جس سے ہم اس کی نبوّت کو آزماسکیں۔ اس پر یہودیوں نے انہیں تین سوال کرنے کو کہا، کہ اگر وہ مدعیٔ نبوت ان سوالات کے جوابات دے دیں تو چوں کہ نبی کے علاوہ اور کوئی ان سوالات کے جوابات نہیں دے سکتا، اس لیے اس مدعیٔ نبوت کی تصدیق وتکذیب کا امتحان اسی سے ہوسکتا ہے، وہ تین سوال یہ ہیں:

(۱) سکندر ذوالقرنین کون تھے؟ اور ان کے حالات کیا تھے؟

(۲) اصحابِ کہف کا قصہ کیا ہے؟

(۳) روح کی حقیقت کیا ہے؟

چنانچہ مشرکین مکہ نے آکر حضور اکرم ﷺ سے یہ تین سوال پوچھے، جواباً حضور ﷺ نے وحیِ الٰہی پر بھروسہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”کل آنا، میں ان سوالات کے جوابات دوں گا“ اس موقع پر آپ ﷺ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی، جس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے رک گیا، بعض روایات میں دس دِن اور بعض میں چالیس دنوں تک کا ذکر ہے، یہ بات حضور ﷺ کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھی، اس پر مزید غم والم کا باعث یہ ہوا کہ دشمنوں نے بالخصوص ابولہب اور اس کی بیوی اُمِ جمیل

نے طعنہ دینا شروع کیا کہ "إنَّ مُحَمَّدًا وَدَّعَهُ رَبُّهُ وَ قَلٰی." محمد کو اس کے رب نے ناراض ہوکر چھوڑ دیا ،ان وحشت انگیز باتوں اورطعنوں سے حضور ﷺ کے غم و پریشانی میں اوراضافہ ہوگیا،محبت پر جب چوٹ پڑتی ہے تو انسان کو بہت تکلیف ہوتی ہے نا! یہاں بھی ایسا ہی ہوا، حضور ﷺ کو ساحر کہا گیا، آپ ﷺ نے برداشت کرلیا ،مجنون کہا گیا، آپ ﷺ نے برداشت کرلیا،اوربھی بہت کچھ کہا گیا، جسے برداشت کرلیا گیا؛لیکن یہ جملہ اورطعنہ کہ ''محمد کے رب نے اُسے چھوڑ دیا اوراس سے ناراض ہوگیا'' آپ ﷺ کے لیے ناقابل برداشت تھا، یہ وقت آپ ﷺ کے لیے سخت آزمائش کا تھا،اورحقیقت تو یہ ہے کہ جو جتنا بڑا ہوگا اوراللہ تعالیٰ کی محبت میں بڑھا ہوا ہوگا،اُس کی آزمائش بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی؛ لیکن پھر جتنی بڑی آزمائش ہوگی اتنا ہی بڑا انعام بھی ملے گا۔جیسا کہ حدیث مذکور میں اسی حقیقت کا انکشاف فرمایا گیا ہے،حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہی ہوا ،انقطاعِ وحی کی بڑی آزمائش کے بعد آپ ﷺ انعامات سے نوازے گئے؛ البتہ انعامات سے نوازے جانے سے قبل آپ ﷺ کو توجہ دلانے کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (الکھف:۲۳)

میرے محبوب! کسی بھی کام کے بارے میں کبھی یہ نہ کہو کہ میں یہ کام کل کرلوں گا، ہاں، یہ (کہو کہ) اللہ تعالیٰ چاہے گا تو (کروں گا)۔ اسی کے ساتھ تینوں سوالات کے جوابات دینے کے لیے فرمایا:

﴿ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ﴾ (بنی إسرائیل : ۸۵)

یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں،تو کہہ دو کہ''روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے۔

رہی بات اصحابِ کہف کے واقعہ کی، تو فرمایا:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ (الکھف : ۱۳)

ہم تمہارے سامنے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔پھر سورۂ کہف میں اس کو بیان کرتے ہوئے اخیر میں ذوالقرنین کے واقعہ کا تذکرہ فرمایا:

﴿ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴾ (الکھف: ۸۳)

یعنی آپ کو تنبیہ فرما کر تسلی بخش جوابات بھی عطا فرمائے ،اس کے بعد مشرکین کے وحشت انگیز طعنوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الضحیٰ نازل فرما کر عظیم الشان انعامات کے ذریعہ شانِ مصطفیٰ ﷺ میں مزید چار چاند لگادیے۔(مستفاد از:تفسیر عزیزی جدید/ پارۂ عم:۴۹۴)

﴿وَالضُّحٰی﴾ :

اس سورت کی ابتداء میں رب العالمین نے محبوبِ رب العالمین کی شایانِ شان دو قسمیں کھائی ہیں،جن میں سے ایک ہے:"وَالضُّحٰی" جس کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ میرے محبوب! قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی، ''ضحیٰ'' کہتے ہیں چاشت کے وقت کو،صبح جس وقت سورج کچھ بلند ہوجاتا ہے اس وقت کی قسم کھانے کا حقیقی راز تو حکیمِ مطلق ہی جانتا ہے؛مگر علماء نے مختلف نکات اس میں بیان فرمائے ہیں،جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح سورج کے طلوع ہوتے ہی ساری تاریکیاں ختم ہوجاتی ہیں،اسی طرح میرے محبوب! آپ کی نبوت کا سورج طلوع ہوتے ہی کفر وشرک اورضلالت وجہالت کی ساری تاریکیاں ختم ہوجائیں گی،سورج کے طلوع ہوتے ہی سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں،تو آپ کی نبوت کے سورج کے طلوع ہوتے ہی حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک جتنے بھی لاڈلے اور پیارے ہیں ان کی نبوت ورسالت کی روشنی ماند پڑ گئی ہے،سورج روشنیوں کا بادشاہ ہے تو آپ عظمتوں کے بادشاہ ہیں،سورج طلوع ہونے کے بعد اس کی روشنی بڑھتی ہے،اسی طرح آپ کی نبوت ورسالت کا سورج طلوع ہونے کے بعد اب کوئی چاہے نہ چاہے؛مگر اس کے نور سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ پرنور ہوجائے گا،"وَالضُّحٰی" مجھے قسم ہے چڑھتے ہوئے سورج کی ،جیسے سورج کی روشنی کو بڑھنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی،اسی

طرح میرے محمد کی رسالت کی روشنی کو دنیا کی کوئی طاقت بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔

﴿وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (یوسف : ۲۱)

اوراللہ تعالیٰ کو اپنے کام پر پورا قابو حاصل ہے، لیکن بہت سے لوگ جانتے نہیں ہیں۔

﴿وَالَّیْلِ إِذَا سَجٰی﴾ :

دوسری قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”وَ الَّیْلِ إِذَا سَجٰی“ اور رات کی قسم! جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔ایسا اندھیرا جس میں نہ چاند ہو نہ چاندنی، نہ شمع ہو نہ روشنی، اس طرح کی سیاہ گھپ کالی رات گویا وحی کے رکنے کا نمونہ ہے، تو دن اور رات کی قسم کھا کر یوں تسلی فرمائی کہ ہم کبھی دِن کو بڑھاتے ہیں اور رات کو گھٹاتے ہیں، اور کبھی رات کو بڑھاتے ہیں اور دِن کو گھٹاتے ہیں، اس گھٹانے بڑھانے میں کسی کی محبت وعداوت یا رضا مندی وناراضگی کو دخل نہیں؛ بلکہ خاص حکمت ہوتی ہے، اسی طرح نزولِ وحی کے معاملہ کو بھی سمجھنا چاہیے کہ کبھی نزولِ وحی میں کچھ وقفہ وتاخیر ہوتی ہے، تو کبھی مسلسل فیضان جاری رہتا ہے، اس میں بھی خاص ہماری حکمت ومصلحت ہوتی ہے۔

اور بعض فرماتے ہیں کہ ”الضُّحٰی“ سے مراد تو رحمت عالم ﷺ کا رخِ انور اور چہرۂ روشن ہے، جب کہ ”وَ الَّیْلِ“ سے مراد آپ ﷺ کی زلفوں کی سیاہی ہے۔(تفسیر عزیزی جدید/ صفحہ:۵۰۰) گویا یہ محبوبانہ اندازِ بیان ہے، جو آپ ﷺ کی عظمتِ شان کو بڑھانے کے لیے اختیار کیا گیا۔

﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی﴾ :

ان دونوں قسموں کا مطلب یہ ہوا کہ میرے محبوب! یہ مشرکین جو تمہیں طعنہ دیتے ہوئے کہتے ہیں نا! کہ محمد کو اس کے رب نے چھوڑ دیا اور ناراض ہو گیا۔ ”وَ الضُّحٰی وَ الَّیْلِ إِذَا سَجٰی“ مجھے تیرے رُخِ روشن کی قسم! جو دن کے مانند روشن ہے اور تیری کالی زلفوں کی قسم

ہے جو رات کے مانند سیاہ ہیں، ”مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی“ تیرے رب نے تجھے چھوڑا بھی نہیں اور تیرے رب نے تجھ سے منھ موڑا بھی نہیں، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تیرا رب تجھے اس قدر نواز کر ناراض ہوجائے اور چھوڑ دے! تجھے تو اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب تو پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گیا تھا، تجھے تو اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب چھ سال کی عمر میں ماں کا سایۂ شفقت ورحمت تیرے سر سے اٹھ گیا تھا، تجھے تو اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب آٹھ سال کی عمر میں دادا بھی ساتھ چھوڑ کر چل بسے تھے، تجھے تو اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب تو شعبِ ابی طالب اور طائف وغیرہ میں بظاہر بے سہارا ہو گیا تھا، اب تو تو خاتم الانبیاء شمس الضحٰی، بدر الدُجیٰ اور محبوبِ کبریا ہے، اب تیرا رب تجھے اس قدر نوازنے کے بعد کیسے چھوڑ سکتا ہے۔”مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی“ ان کے وحشت انگیز طعنوں سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارا اور تمہارا تعلق ٹوٹے گا نہیں؛ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اور بڑھتا چلا جائے گا۔

﴿وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی﴾ :

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ﴿وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی﴾ تیرے لیے آنے والا وقت گزرے ہوئے وقت سے زیادہ بہتر ہوگا، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس ایک آیت میں گویا اللہ تعالیٰ نے کوزے میں سمندر کو بھر دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے محبوب! تیرا تو ہر آنے والا حال گزرے ہوئے حال سے بہترین ہوگا، تیرا عالمِ ارواح سے بطن مادر میں جانا بہتر تھا تو بطن مادر سے ولادت باسعادت کا ہونا بہترین ثابت ہوا، تیرا بچپن کا زمانہ بہتر تھا؛ لیکن تیری نورانی جوانی بچپن سے بہترین ثابت ہوئی، تیرا کنوارا پن بہتر تھا تو شادی کرنا بہترین، پھر اولاد کا ہونا اس سے زیادہ بہتر ثابت ہوا، تیرا غارِ حرا میں بیٹھ کر عبادت کرنا بہتر تھا، مگر تجھے نبوت کا ملنا اس سے زیادہ بہتر ہوا، تیرا سفر شام وطائف بھی بہتر تھا؛ لیکن سفر معراج تو اس سے بھی بہتر ہوا، تیری مکی زندگی بھی بہتر تھی؛ لیکن مدنی زندگی اس سے بھی بہتر ہوئی، پھر تیرا مدینہ سے مکہ میں فتحِ مکہ کے موقع پر آنا اور بہتر تھا؛ لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آنا اس

سے زیادہ بہتر ثابت ہوا، تیرا دنیا میں رہنا بہتر تھا؛ لیکن دنیا سے پردہ فرمانا اس سے بھی زیادہ بہتر ہوا، یہ ہے ﴿وَ لَلاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولٰى﴾ کا مطلب۔

ایک تفسیر اس کی یہ بھی ہے کہ یہاں آخرت سے دارِ آخرت مراد ہے، اور یہ بھی بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی کیا ہے کہ آخرت آپ ﷺ کے لیے دنیا سے بہتر ہے، یعنی میرے محبوب! تیری قبر کی زندگی دنیا کی زندگی سے بہتر، حشر کی زندگی قبر سے بہتر ہے، پھر مقامِ محمود کا ملنا اس سے بھی بہتر، پھر شفاعتِ کبریٰ کے منصب سے نوازا جانا اس سے بہتر، پھر حوضِ کوثر پر آبِ کوثر تقسیم کرنا اس سے بہتر، پھر اپنے مولیٰ سے تیرا آخرت میں اس وقت تک راضی نہ ہونا جب تک ایک ایک کلمہ پڑھنے والا جنت میں داخل نہ ہوجائے یہ اس سے بھی بہتر ہے۔ ﴿وَ لَلاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولٰى﴾ سبحان اللہ! کیا شانِ مصطفیٰ ﷺ ہے!

﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ :

اب دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ بالآخر اس بہتری کے سلسلہ کا اختتام کہاں ہوگا؟ تو ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ میرے محبوب! تیرا رب تجھے اس قدر نوازے گا کہ تو راضی ہوجائے گا، پھر تیری کوئی آرزو اور امید باقی نہ رہے گی۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ دشمنوں نے کہا تھا نا! کہ محمد کو اس کے رب نے ناراض ہوکر چھوڑ دیا، تو اس کے جواب میں گویا فرمایا کہ اے میرے محبوب! ناراض اور بیزار ہوکر چھوڑ دینا کیسے ہوسکتا ہے، ابھی تو تیرا رب تجھے دنیا اور آخرت میں اس قدر نعمتوں اور عظمتوں سے نوازے گا کہ تو بھی راضی ہوجائے گا۔

صاحبو! یہ وعدۂ الٰہی اپنے اندر عطا وبخشش کے اعتبار سے اتنی وسعت رکھتا ہے کہ ہما شما کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل، کیونکہ وعدہ کرنے والا رب العالمین ہے، تو جس سے وعدہ کیا گیا وہ رحمۃ للعالمین ہے، رب العالمین رحمۃ للعالمین سے وعدہ کرتا ہے کہ میں تجھے خوش

کردوں گا، تجھے اتنا عطا کروں گا کہ تو راضی ہوجائے گا، غور کیجیے! ساری مخلوق تو اپنے خالق کو راضی کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے، لیکن ہمارے آقا ﷺ نے اپنے مولیٰ کو اس قدر راضی کیا کہ اس نے وعدہ کرلیا کہ میں بھی اب تجھے اس قدر عطا کروں گا کہ تو راضی ہوجائے گا۔

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی تو رحمت عالم ﷺ نے حضرات صحابہؓ سے فرمایا کہ میں اُس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک کہ اپنی امت (اجابت) میں سے ہر شخص کو جنت میں داخل نہیں کرالوں گا۔ (تفسیرعزیزی جدید/ص:۵۰۳)
حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "إِذًا لَا أَرْضٰى وَ وَاحِدٌ مِنْ أُمَّتِيْ فِي النَّارِ." (قرطبی، از: گلدستۂ تفاسیر: ۶۴۸) جب تک میری امت میں سے ایک فرد بھی جہنم میں رہے گا میں راضی نہ ہوں گا۔

بس یہی ہم غریبوں اور گنہگاروں کے لیے قیامت کے دن امید کی ایک کرن ہوگی، اسی لیے بعض علماءِ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ سب سے زیادہ امید آفریں ہے، حتیٰ کہ آیت کریمہ: "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" سے بھی زیادہ۔ (تفسیر مظہری، از: "گلدستۂ تفاسیر"/ص: ۶۴۹)

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ :

اس کے بعد آگے وعدے کی پختگی پر بطورِ دلیل کے گذشتہ زمانہ کے تین عظیم الشان انعامات واحسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا، پھر ٹھکانا عطا کیا، ابھی تو آپ بطنِ مادر ہی میں تھے کہ والد ماجد حضرت عبداللہ وفات پاگئے، اس حال میں کہ انہوں نے کوئی مال وجائیداد بھی نہ چھوڑی تھی، جس سے آپ کی پرورش ہوسکے، پھر جب آپ چھ سال کے ہوئے تو والدۂ ماجدہ حضرت آمنہ بھی انتقال فرماگئیں، اور اس کے بعد جب کہ آپ کی عمر آٹھ برس کی ہوئی تو دادا حضرت عبدالمطلب بھی وفات پاگئے، ماں باپ اور دادا کے فوت ہوجانے سے گویا آپ تین طرح

سے یتیم ہوگئے، ایسی حالت میں اندیشہ تھا کی یہ یتیم بچہ ضائع ہوجائے؛ مگر ہم نے آپ کو دُرِ یتیم بنا کر تربیت کی ایسی صورت پیدا کی کہ تربیت بھی آپ ﷺ کی دُرِیتیمی پر ناز کرتی ہے، والد کے انتقال کے بعد ماں اور دادا کے دل میں ایسی محبت ڈالی کہ شفقت پدری کی کمی پوری ہوگئی، پھر ان کے انتقال کے بعد چچا ابو طالب کے دل میں ایسی محبت ڈالی کہ حقیقی اور صلبی اولاد سے بھی اتنی محبت نہیں ہوتی۔

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوٰى﴾ میرے محبوب! جس نے آپ کو یتیمی کے زمانے میں نہیں چھوڑا، وہ اب آپ کو نبوت کے زمانے میں کیونکر چھوڑ دے گا، اس آیت میں گویا "مَا وَدَّعَكَ" کی تاکید ہے۔

﴿وَ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى﴾:

آگے دوسرے انعام واحسان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف اور بے خبر پایا تو راستہ دکھایا، بات اصل میں یہ ہے کہ جب رحمتِ عالم ﷺ بالغ ہوئے، اس کے بعد عقل ودانائی کے کمال تک پہنچے، تو آپ ﷺ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ بتوں کی پوجا پاٹ اور کفر وجاہلیت کی تمام رسوم بالکل بے اصل اور انتہائی بے ہودہ کام ہیں، یہ اصل دین نہیں ہے (چنانچہ اب آپ ﷺ کو اصل دین کی جستجو ہوئی، تو بڑے بوڑھوں سے سنا کہ ہمارا اصل دین دین ابراہیمی ہے) اب آپ ﷺ پر یہ فکر سوار ہوگئی کہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے مطابق عبادت کروں، اور جو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اس کے مطابق زندگی گزاروں، (مگر نہ تو دین ابراہیمی کی پوری تفصیلات کسی کو یاد تھیں، نہ وہ کسی کتاب میں محفوظ تھیں) جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی بے چینی وبے قراری بڑھتی چلی گئی، ایسے عالم میں چند باتیں دھندلی سی کچھ لوگوں کو یاد چلی آتی تھیں، مثلاً ذکر وتسبیح کے کلمات، اعتکاف اور غسل جنابت، مناسکِ حج اور خلوت (مع الحق) وغیرہ، آپ نے ان ہی پر عمل شروع کردیا؛ مگر آپ ﷺ کی بے قراری

ابھی بھی مکمل طور پر ختم نہ ہوئی، اسی دوران اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت سے نوازا اور دین حق کی تفصیلات سے آپ ﷺ کو واقف اور باخبر کیا گیا، تب آپ ﷺ کی وہ بے قراری دور ہوگئی جو دین حق کی تلاش میں آپ ﷺ کو لاحق تھی، اسی کو یہاں فرمایا: ﴿وَ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى﴾ (تفسیر عزیزی جدید/ص:۵۰۸) یعنی آپ وحی نازل ہونے سے پہلے شریعت کے احکام سے ناواقف تھے، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ شریعت عطا فرمائی، اور دین حق سے واقفیت عطا فرمائی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ میں کچھ ایسے واقعات بھی بیان کئے ہیں جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کسی سفر کے دوران راستہ بھول گئے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر آپ ﷺ کو راستہ بتایا، تو اس طرف بھی اشارہ ممکن ہے۔ غرض اس سے بھی یہی مقصود ہے کہ تیرے رب نے تجھے اس وقت بھی نہیں چھوڑا، لہٰذا اب بھی نہیں چھوڑے گا۔

﴿وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى﴾:

اس کے بعد ایک اور انعام واحسان کا ذکر کیا فرمایا: ﴿وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا، پھر غنی اور بے پرواہ کردیا۔ جس کی ابتداء سیدنا خدیجہؓ کے مال میں بطورِ شرکتِ مضاربت کے تجارت کرنے سے ہوئی، پھر وہ آپ ﷺ کی صداقت، امانت اور اخلاق سے متاثر ہوکر جب آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں تو سارا مال ہی آپ ﷺ پر وقف فرمادیا، بیوی کی وفات کے بعد آپ ﷺ کو ایسا دوست سیدنا صدیق اکبرؓ کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کے مالی تعاون نے آپ ﷺ کو فارغ البال کردیا، اس کے بعد جب جہاد کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت سے آپ کو مالا مال کردیا، عسر سے یسر تک کے ان ہی حالات کو ﴿وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى﴾ میں بیان فرمایا، اگرچہ ان میں بعض باتیں اس سورتِ مقدسہ کے نازل ہونے کے بعد پیش آئیں؛ لیکن جو چیز علمِ الٰہی میں ہو وہ ایسی ہی ہے گویا واقع ہوچکی ہے، اس لیے اس ضمن میں ان احسانات کا ذکر بجا ہے۔

نیز غِنا کے ان ظاہری اسباب کے علاوہ آپ ﷺ کو جو باطنی غِنا و بے نیازی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی، جسے قناعت کہتے ہیں، وہ تو ایسی تھی کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں، آپ ﷺ کا دنیا سے بے رغبتی کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ کے لیے پتھر اور سونا برابر تھا۔ (عزیزی:۵۱۲) یہ اسی غِنا کا اثر تھا کہ منجانب اللہ پہاڑ کو سونا بنا دیے جانے کی پیش کش کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے لیے فقرِ اختیاری کو پسند فرمایا۔ (مشکوٰۃ/ص:۵۲۱)

غرض ان انعامات و احسانات کا تذکرہ اسی لیے کیا گیا کہ ہم نے آپ کو ایسے ایسے حالات میں تو چھوڑا نہیں، اب کس طرح چھوڑ دیں گے۔

﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾:

ان تین عظیم الشان انعامات و احسانات کو بیان فرما کر شکر کی تعلیم کے طور پر فرمایا: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ اب جو یتیم ہیں تم ان پر سختی نہ کرنا، کیوں کہ آپ نے سختی کا زمانہ دیکھا ہے، آپ کو یتیمی کی بے بسی اور لاچاری سے اچھی طرح واقفیت ہے، آپ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ ایک یتیم کی آنکھیں معمولی سی بات پر بھی برس پڑتی ہیں، اس کا دل آزردہ وشکستہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ تو جو یتیم ٹھہرا، ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾ تو اس نعمت کا شکر یہی ہے کہ میرے پیارے! ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ یتیم کے ساتھ نازیبا سلوک نہ کرنا۔ یہاں اگرچہ خطاب آپ ﷺ کو ہے؛ لیکن اس میں ساری امت کو یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم و نصیحت ہے، حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ حضور ﷺ یتیموں سے بہت محبت فرماتے، اور اپنی امت کو بھی اس طرف متوجہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک حدیث شریف ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ هٰكَذَا، وَ أَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَ الْوُسْطٰى، وَ فَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا." (رواه البخاری، مشکوٰۃ/۴۲۲/ باب الشفقة والرحمة على الخلق)

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، اور آپ ﷺ نے

اپنی شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرما کر ان کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھا، یعنی اتنی قربت ہوگی۔ اور ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِينَ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ يُحْسَنُ إِلَيْهِ، وَ شَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِينَ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ يُسَاءُ إِلَيْهِ." (رواه ابن ماجه، مشکوٰة :۴۲۳/ باب الشفقة والرحمة على الخلق/ الفصل الثانی)

مسلمانوں کا سب سے بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، اور سب سے بدترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جائے۔

ایک اور حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيمٍ، لَمْ يَمْسَحْهُ إِلَّا لِلّٰهِ، كَانَ لَهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهُ حَسَنَاتٌ." (رواه أحمد والترمذی، مشکوٰة/ص:۴۲۳)

جس نے اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے (صرف) کسی یتیم کے سر پر (محبت و شفقت) سے ہاتھ پھیرا، تو اس کے ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے عوض اسے کئی نیکیاں ملیں گی۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "جب یتیم روتا ہے تو عرشِ الٰہی کانپ اٹھتا ہے، اب جو یتیم کی دلداری کر کے خاموش کرے گا، گویا اس نے ہلتے ہوئے عرش کو ٹھہرا دیا۔" (تفسیر عزیزی جدید/ص:۵۱۷)

صاحبو! دنیا کے یتیموں کو یہ فضائل حضورِ پاک ﷺ کی یتیمی ہی کے طفیل ملے ہیں ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ پر جب آپ ﷺ نے عمل کیا، تو یتیموں کا مقام بڑھ گیا۔

﴿وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾:

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ جو سوال کرنے والا ہو اُسے جھڑکنا نہیں، خواہ سائل دنیا کا ہو یا دین کا، مال کا ہو یا علم کا، اس ارشاد پر آپ ﷺ نے

ساری زندگی اس قدر اہتمام سے عمل کیا کہ آپ ﷺ کے در پر آنے والا کوئی سائل کبھی محروم واپس نہیں ہوا، حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: "مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شَيْئًا قَطُّ، فَقَالَ: "لَا"". (متفق عليه، مشكوٰة/ ص:۵۱۹/كتاب الفضائل)

آپ ﷺ نے کبھی کسی سائل کے جواب میں "لَا" (نہیں) فرمایا، فرزدق شاعر نے اسی بات کو حضرت علی زین العابدینؒ کی مدح میں کہا تھا:

مَا قَالَ : "لَا"، إِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاؤُهٗ نَعَمُ

ممدوح نے کبھی زندگی میں "لا" نہیں فرمایا سوائے تشہد کے، اگر تشہد نہ ہوتا تو ان کا "لا" بھی "نعم" ہی ہوتا۔

آپ ﷺ نے ﴿وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى﴾ کی نعمت کے شکر میں ﴿وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ پر عمل کا حق ادا کر دیا۔

﴿وَ أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾:

اخیر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَ أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ اور جو تمہارے رب کی نعمت ہے اس کا تذکرہ کرتے رہیے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہ کفار جنہوں نے وحشت انگیز طعنہ دیا تھا نا! آپ اس طعنہ کے جواب میں اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کھول کھول کر کیجیے! اگر انہیں ذرا بھی سمجھ اور شعور ہے تو وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جب رب نے تجھے اس قدر انعامات وعظمتِ شان سے نوازا ہے، تو وہ تجھے چھوڑ کیسے سکتا ہے۔

دوسرا مطلب یہاں نعمت سے سب سے بڑی نعمت نبوت اور کلامِ ہدایت یعنی قرآنِ کریم مراد ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی عظمتِ شان بڑھانے کے لیے آپ پر اپنا کلام عظیم الشان بشکل قرآن نازل فرمایا، آپ اس کی تشریح وتفصیل کر دیجیے! اسی سے آپ ﷺ کی بات اور کلام حدیث کہلائی، آپ ﷺ نے اپنے اللہ کی نعمتوں کو جو

بیان کرنا شروع کیا وہ حدیثیں کہلائیں، اور اس سے کتبِ احادیث کے گلدستے تیار ہوئے، یہاں بھی تحدیث بالنعمۃ کا حکم آپ ﷺ کو دے کر امت کو بھی اس کی تلقین فرمائی، اسی سے علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو نعمتوں سے نوازا ہو، تو بشرطِ اخلاص اس کا اظہار مستحب ہے، کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے، جنانچہ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي الْأَحْوَصِؓ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: "أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، وَ عَلَيَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ، فَقَالَ لِيْ: "أَلَكَ مَالٌ؟ قُلْتُ: "نَعَمْ"، قَالَ: "مِنْ أَيِّ الْمَالِ؟" قُلْتُ: "مِنْ كُلِّ الْمَالِ، قَدْ أَعْطَانِيَ اللّٰهُ مِنَ الْإِبِلِ وَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ وَ الْخَيْلِ وَ الرَّقِيْقِ"، قَالَ: "فَإِذَا آتَاكَ اللّٰهُ مَالًا فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ كَرَامَتِهٖ." (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة/ص:۳۷۵/كتاب اللباس)

حضرت ابوالاحوصؒ نے اپنے والد سے روایت کی (جن کا نام مالک بن نضر تھا) کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں اس حالت میں حاضر ہوا کہ میں گھٹیا درجہ کا کپڑا پہنے ہوئے تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے پاس مال ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں!" فرمایا: "کس قسم کا مال ہے؟" میں نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا مال مجھے عنایت فرمایا ہے، اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، غلام وغیرہ، بحمد اللہ! سب موجود ہیں"، تب آپ ﷺ فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس قدر نعمتوں سے نوازا ہے، تو پھر اس کی نعمت کا اثر بھی آپ پر نظر آنا چاہیے۔"

معلوم ہوا کہ تحدیث بالنعمۃ اپنے حال، مال اور افعال کے ذریعہ ہونی چاہیے، شرط وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار مقصود ہو، تحدیث بالنعمۃ کے نام پر ریا کاری، بڑائی اور خودستائی مقصد نہ ہو۔

بہرکیف! اس سورتِ مقدسہ میں شانِ مصطفیٰ ﷺ کو نہایت نرالے انداز میں بیان فرما کر طعنہ دینے والوں پر واضح کر دیا کہ پیارے! آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا بھی

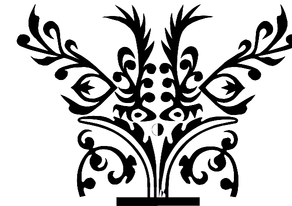
نہیں اور آپ سے منھ موڑا بھی نہیں، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس میں آپ ﷺ کے سچے وارثین علماءِ دین اور سچے متبعین کے لیے بھی آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ یہ تسلی ہے کہ اگر ہم آپ ﷺ کی تعلیمات وہدایات پر ہم عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ دارین میں نہ ہمیں چھوڑے گا، نہ ہی ہم سے منہ موڑے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نبیٔ پاک ﷺ کا سچا وارث وعاشق بنا کر اپنی دائمی رضائے دارین عطا فرمادیں۔ آمین یارب العالمین۔

۲۴/ جمادی الثانیہ/ ۱۴۳۵ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۲۵/ اپریل/ ۲۰۱۴ء
(بزمِ صدیقی بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



207

(۳۷)

فضائل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَ أَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ، وَ أَوَّلُ شَافِعٍ وَ أَوَّلُ مُشَفَّعٍ."

(رواه مسلم، مشکوٰة: ۵۱۱/ باب فضائل سید المرسلین ﷺ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن (بھی) میں (ہی) اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، اور پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہوگی، (کھلے گی) اور میں پہلا سفارش کرنے والا (بھی) ہوں گا، اور میں ہی پہلا وہ شخص ہوں گا جس کی سفارش قبول کی جائے گی۔

وہ جس کے لیے محفلِ کونین سجی ہے فردوسِ بریں جس کے وسیلہ سے بنی ہے
وہ ہاشمی، مکی، مدنی العربی ہے وہ میرا نبی، میرا نبی، میرا نبی ہے

والشمس ضحیٰ چہرۂ انور کی جھلک ہے واللیل سجیٰ گیسوئے حضرت کی لٹک ہے
عالم کو ضیا جس کے وسیلے سے ملی ہے وہ میرا نبی، میرا نبی، میرا نبی ہے

احمد ہے، محمد ہے، وہی ختم رُسل ہے — مخدوم ومربی ہے، وہ ہی والیٔ کل ہے
اس پر ہی نظر سارے زمانے کی لگی ہے — وہ میرانبی، میرانبی، میرانبی ہے

اللہ کا فرمان: "أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ" — منسوب ہے جس سے: "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"
جس ذات کا قرآن میں بھی ذکر جلی ہے — وہ میرانبی، میرانبی، میرانبی ہے

مزمل ویٰسین ومدثر وطٰہٰ — کیا کیا نئے القاب سے مولیٰ نے پکارا
کیا شان ہے اس کی کہ جو اُمی لقبی ہے — وہ میرانبی، میرانبی، میرانبی ہے

وہ ذات کہ جو مظہر لولاک لما ہے — جو صاحب رفرف شب معراج ہوا ہے
اَسریٰ میں امامت جسے نبیوں کی ملی ہے — وہ میرانبی، میرانبی، میرانبی ہے

کس درجہ زمانہ میں تھی مظلوم یہ عورت — پھر کس کی بدولت ملی اُسے عزت و رفعت
وہ محسن و غمخوار، ہمارا ہی نبی ہے — وہ میرانبی، میرانبی، میرانبی ہے

گروہِ انبیاء ورُسل علیہم السلام میں سب سے زیادہ فضیلت آپ ﷺ کو ملی:

خالق کائنات اور مالک ارض وسماوات کی ساری مخلوق میں سب سے مقدس اورمبارک طبقہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے، تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب، منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں، اوران میں سے ہرایک کی نبوت ورسالت پر بلاکسی تفریق وتنقیص کے ایمان لاناضروری ہے، جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:

﴿ آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَ الْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵)

یہ رسول ﷺ (خود بھی) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پراوررسولوں پرایمان لائے ہیں، (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں)

اور یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام میں فرقِ مراتب کے باوجود اس گروہ کا ہر فرد اللہ رب العزت کے نزدیک مقام ومرتبہ میں باقی تمام انسانوں سے بدرجہا برتر وبہتر ہے، کیونکہ ربِ کریم نبوت ورسالت کے ساتھ اُنہیں کارِنبوت کوکماحقہ اداکرنے کے لیے بہت سے انعامات، عطیات اور خصائص وفضائل سے نوازتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں جو رفعت، فوقیت اور فضیلت اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول جناب محمد ﷺ کو عطا فرمائی وہ کسی کو نہیں ملی ہے، جس کا اعلان جابجا قرآن نے فرمایا۔

رب العالمین کی جانب سے رحمۃ للعالمین ﷺ کو ملنے والے تین ایوارڈ:

مثلاً سورۂ "أَلَمْ نَشْرَحْ" میں حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمودہ تین عظیم خصوصی انعامات وعطیات بیان فرمائے ہیں: شرحِ صدر، وضع وزر اور رفع ذکر۔

ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِىْ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾

کیا ہم نے تمہارے خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ اور ہم نے تم سے تمہارا وہ بوجھ اتار دیا ہے، جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی (جھکادی تھی، کیونکہ ابتداءً جب آپ ﷺ کو نبوت کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی، تو آپ ﷺ نے اس سے زبردست بوجھ محسوس فرمایا، لیکن

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وہ حوصلہ عطا فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ نے مشکل سے مشکل کام بھی انتہائی اطمینان اور سکون کے ساتھ انجام دیے، اس میں اسی کا تذکرہ ہے) اور ہم نے تمہارے خاطر تمہارے تذکرے کو اونچا کیا، ان آیات میں فضائل مصطفیٰ ﷺ کو نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ ''أَلَمْ نَشْرَحْ'' کا شانِ نزول:

بعض مفسرین نے اس کا شانِ نزول اس طرح بیان کیا کہ ''ایک دن رحمت عالم ﷺ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: ''اے اللہ! تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقامِ خُلت پر فائز کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ کلام سے نوازا، حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا اور پہاڑ مسخر کر کے ان کو عزت بخشی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو انسانوں، جنوں پانی، آگ اور ہوا پر حکومت سے سرفراز فرمایا، تو الٰہی! میرے لیے اس طرح کی امتیازی خصوصیت اور فضیلت کیا مقرر کی گئی ہے؟'' اس کے جواب میں یہ سورتِ مبارکہ نازل فرمائی گئی۔ (تفسیر عزیزی جدید: ۵۲۱/ پارۂ عم)

پھر یہ سورت چوں کہ مکی ہے اس لیے مفسرین کے اقوال کے مطابق بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ معراج سے پہلے کا ہوگا، وجہ یہ ہے کہ معراج کے بعد تو اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو ایسے خصائص وفضائل سے نوازا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کو ان کا عشر عشیر (سوواں حصہ) بھی عطا نہیں ہوا۔

لیکن ان آیات میں بھی جن تین فضائل مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی نہایت ہی عظیم ہیں، اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ تینوں فضائل، خصائص اور انعامات اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو بن مانگے اور بغیر درخواست کیے عطا فرمائے ہیں، بعض اوقات ایک چیز استاذ اپنے شاگرد کو، والد اپنے بیٹے کو، بڑا اپنے چھوٹے کو درخواست کرنے اور مانگنے پر عطا کرتا ہے، جب کہ بعض اوقات بغیر درخواست کے ایک استاذ اپنے شاگرد

اور بڑا اپنے چھوٹے کو اس کی محنت، خدمت، اور صلاحیت کی بنیاد پر خوش ہو کر کوئی چیز بطورِ ایوارڈ اور انعام کے عطا کرتا ہے، یہاں یہ فضائل اللہ تعالیٰ نے اسی طرح آپ ﷺ کو عطا فرمائے گویا یہ تین ایوارڈ ہیں جو رب العالمین نے بلا درخواست کے رحمۃ للعالمین ﷺ کو عطا فرمائے۔

''شرحِ صدر'' کی حقیقت اور فضیلت:

فرمایا: ''أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ'' کیا ہم نے تمہارے خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا، یہ پہلا انعام وایوارڈ ہے، جو حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بن مانگے عطا فرمایا، حالانکہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو یہ انعام درخواست کرنے پر عطا کیا گیا، قرآن کہتا ہے کہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دعوت وتبلیغ کے لیے فرعون کے پاس جانے کا حکم ملا:

﴿ اِذْهَبْ إِلىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغىٰ﴾ (طه : ۱۹)

تب آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کی: ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ الٰہ العالمین! میرا سینہ کھول دیجیے! مجھے شرحِ صدر عطا کیجیے! معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو شرحِ صدر کے لیے درخواست کرنی پڑی، اور یہاں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو بغیر درخواست کے شرحِ صدر سے نوازا گیا۔

''أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ'' یہ استفہام تقریری ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ اس کو جانتے اور مانتے ہیں کہ ہم نے آپ کا سینہ کھول دیا۔ شرحِ صدر سے مراد یہاں حقیقۃً سینہ کھولنا ہے جسے ''شق صدر'' کہتے ہیں، جو آپ ﷺ کی خصوصیات ومعجزات میں سے ہے۔

روایاتِ صحیحہ اور احادیثِ معتبرہ سے واضح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے تحت چار مرتبہ حضرت جبرئیل ومیکائیل کے ذریعہ آپ ﷺ کے سینہ کو چاک کروا کر پاک صاف فرمایا، پہلی مرتبہ بچپن میں جب کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک چار سال کی تھی، اور آپ ﷺ دائی حلیمہ کی پرورش میں تھے، اس کی حکمت یہ تھی کہ اس عمر کے بچوں میں

لہوولعب اور لایعنی کاموں کی جو دلچسپی ہوتی ہے وہ آپ ﷺ میں نہ رہے۔

دوسری مرتبہ بلوغ کے قریب، جب کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک دس سال تھی، یہ اس لیے کہ جوانی کے لوازمات میں سے جوشِ شہوت اور جوشِ غضب بھی ہے، آپ ﷺ کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے اس عمر میں دوسری مرتبہ شق صدر کیا گیا۔ تیسری مرتبہ واقعۂ بعثت کے وقت آپ ﷺ کے قلب مبارک کی مزید صفائی اور اس کی تقویت کے لیے پھر آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا گیا، تا کہ قلب مبارک اسرارِ وحیِ الٰہی اور علومِ ربانی کا تحمل کر سکے۔ اور چوتھی مرتبہ واقعہ معراج کے وقت شق صدر کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ قلب مبارک عالم ملکوت کی سیر اور تجلیات الٰہیہ وآیاتِ ربانیہ کا تحمل کر سکے۔ (مستفاد از: سیرۃ المصطفیٰ ص:۳۷ تا ۸۴، وتفسیر عزیزی جدید/ص:۵۲۸ تا ص۵۳۲)

غرض! آیت کریمہ میں ''شرحِ صدر'' سے شق صدر کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کے سینۂ اطہر کو کھولا اور اسے نورِ ہدایت ونبوت، کتاب وحکمت، علم ومعرفت اور دعوت ایمان واحکام اور استقامت سے بھر دیا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کا مقدس سینہ نورِ ہدایت کا خزینہ اور علوم ومعارف کا گنجینہ بن گیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایک بہت بڑا ایوارڈ اور انعام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو محض اپنے لطف سے عطا فرمایا، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق آپ ﷺ کی برکت سے امت محمدیہ کے ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی یہ انعام دیا گیا، جس کی طرف اشارہ قرآن میں اس طرح فرمایا:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ﴾ (الأنعام: ۱۲۵)

جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت تک پہنچانے کا ارادہ کر لے اُسے شرحِ صدر عطا کرتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ (جس کی وجہ سے اسے حق وہدایت اور نیکی سے رغبت وفرحت اور باطل وگمراہی سے نفرت ووحشت ہوتی ہے)۔ اللّٰهم اجعلنا منهم.

ان حقائق سے ''شرحِ صدر'' کی حقیقت اور فضیلت معلوم ہوئی، جس سے اللہ تعالیٰ

نے آپ ﷺ کو اور پھر آپ ﷺ کے طفیل امت کے ہدایت یافتہ لوگوں کو نوازا۔

''وضعِ وِزر'' کی حقیقت اور فضیلت:

آگے دوسرے ایوارڈ وانعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴾

اور ہم نے تم سے تمہارا وہ بوجھ اتار دیا ہے جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی، یہ ''وضع وزر'' دراصل شرحِ صدر ہی کا اثر ہے، جب شق صدر فرما کر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سینہ کو علوم ومعارف کا خزینہ بنا دیا، تو آپ ﷺ کے حساس دِل سے وہ تمام بوجھ جنہوں نے آپ ﷺ کو بوجھل بنا دیا تھا مٹ گئے اور آپ ﷺ کا مبارک دل پورے طور پر مطمئن ہو گیا۔

وہ بوجھ کیا ہے؟ اس کی تفسیر میں حضرات مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں:

(۱) بعض فرماتے ہیں کہ ''وزر'' سے مراد نزولِ وحی یا نبوت کی ذمہ داری کا بوجھ ہے، ابتداءً نبوت میں وحی کا اثر بھی آپ ﷺ پر شدید ہوتا تھا، اور اس میں آپ ﷺ کو جو ذمہ داری ساری دنیا میں کلمۂ حق پھیلانے اور کفر وشرک کو مٹا کر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو توحید پر جمع کرنے کی سپرد کی گئی تھی یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جب یہ ذمہ داری ڈالی گئی تو آپ علیہ السلام نے پہلی ہی رات رب العالمین سے یہ درخواست کر دی تھی:

﴿ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ أَهْلِیْ هٰرُوْنَ أَخِی اشْدُدْ بِهٖ أَزْرِیْ﴾ (طٰہٰ: ۲۹-۳۰)

''اور میرے لیے میرے خاندان ہی کے ایک فرد کو مددگار مقرر کر دیجیے، یعنی ہارون کو جو کہ میرے بھائی ہیں۔'' باوجودیکہ آپ علیہ السلام پر ساری انسانیت کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی، جب کہ سرکارِ دوعالم ﷺ پر قیامت تک کی انسانیت کی ذمہ دری ڈالی گئی، چوں کہ

آپ ﷺ کا مقام بڑا ہے، تو کام بھی بڑا ہے، پھر اسی کے ساتھ سب کاموں میں حکم یہ تھا کہ ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (هود:۱۲۲) جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق تم سیدھے راستے پر ثابت قدم رہو۔ یعنی آپ امر الٰہی کے مطابق استقامت پر رہیں، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان بات نہ تھی، اس کا بارِ عظیم رحمۃ للعالمین ﷺ محسوس فرماتے تھے، اور بعض روایاتِ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی گھنی داڑھی مبارک میں کچھ سفید بال آ گئے، تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ اس آیت: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ نے مجھے بوڑھا بنادیا، تب رب العالمین نے محض اپنے فضل خاص سے ''وضعِ وزر'' سے نواز کر آپ ﷺ کی تمام تر ذمہ داریوں کو آسان بنادیا اور اس طرح آپ ﷺ کی نبوت کا آفتاب عالمتاب بن کر ساری فضا میں چھا گیا، اور ہدایت کے نور سے ساری کائنات کا ذرّہ ذرّہ روشن ہو گیا۔

بہرحال یہ تھا وہ بوجھ جس کو آپ ﷺ سے ہٹا دینے کی بشارت: ﴿وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ میں دی گئی۔

(۲) ''وِزر'' کی ایک تفسیر یہ بیان کی گئی کہ اس سے مراد وہ جائز اور مباح کام ہیں جن کو بعض اوقات رحمت عالم ﷺ نے قرین حکمت و مصلحت سمجھ کر اختیار تو کر لیا؛ لیکن بعد میں ان کا خلافِ اولیٰ ہونا معلوم ہوا، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کے آنے پر آپ ﷺ کو ان کے نہ آنے کا خیال، یا بعض منافقین کی جانب سے جہاد میں نہ جانے کی اجازت مانگنے پر آپ ﷺ کا اجازت دینا، یا بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے والی رائے سے آپ ﷺ کا موافقت کرنا وغیرہ، جن کا آپ ﷺ کی حساس طبیعت پر بہت ہی اثر ہوا تھا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں بشارت سنا کر وہ بوجھ آپ ﷺ سے ہٹا دیا کہ ایسی چیزوں پر آپ سے مواخذہ نہ ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت سورۂ فتح کی آیت: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ﴾ (الفتح : ۲) کے ہم معنی ہے، اور مطلب یہ ہے

کہ وہ معمولی قسم کی بھول چوک جو بلا ارادہ یا خطاءِ اجتہادی کے طور پر آپ ﷺ سے صادر ہوئی، جس کا بوجھ آپ ﷺ محسوس کرتے تھے، ہم نے وہ بوجھ بھی آپ ﷺ سے ہٹا دیا، اور سب کچھ معاف کر دیا۔ (مستفاد از: ''معارف القرآن'' ص: ۷۷۱ و تفسیر انوار البیان/ ص: ۶۴۲)

(۳) بعض فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کو اپنی امتِ عاصی کا غم اس قدر تھا کہ اس سے آپ ﷺ بوجھل ہو گئے تھے، تو رب العالمین نے آپ ﷺ کو شفیع المذنبین بنا دیا، آپ ﷺ کو شفاعت کا مقام عطا فرما کر اس بوجھ اور غم کو ختم فرما دیا، آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (مستفاد از: ''تفسیر عزیزی جدید'' ص: ۵۳۴)

اس سے واضح ہو گیا کہ رب العالمین کی جانب سے رحمۃ للعالمین ﷺ کو یہ جو دوسرا انعام وایوارڈ عطا کیا گیا وہ صرف آپ ﷺ ہی کے لیے نہیں؛ بلکہ امت کے لیے بھی انمول عطیہ ہے۔

''رفعِ ذکر'' کی حقیقت اور فضیلت:

اس کے بعد اس سورتِ مبارکہ میں آپ ﷺ کے تیسرے انعام وایوارڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ اور ہم نے تمہارے خاطر تمہارے تذکرے کو اونچا کیا۔

غور کیجیے! رب کریم نے نبی کریم ﷺ سے صرف وعدہ نہیں کیا کہ ہم تمہارا نام اور مقام بلند کریں گے؛ بلکہ فرمایا: ہم نے بلند کر دیا، اور آج سے نہیں؛ بلکہ ازل سے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی عظمت ورفعت کو جاننے کے لیے ہمیں کائنات کے احوال و آثار کو پیش نظر رکھتے ہوئے تخلیق کائنات کے آغاز اور اختتام بلکہ حشر ونشر اور اس کے بعد کے مراحل کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ اور غور وفکر کے مراحل کا تذکرہ بذاتِ خود ایک دفتر ہے، اور چونکہ مضمون کو زیادہ طویل بھی نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا اُسے مختصر کرتے ہوئے

ہم سب سے پہلے آغازِ کائنات کی طرف چلتے ہیں:

(۱) ذخیرۂ احادیث طیبہ میں یہ روایت متعدد کتابوں میں ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا، کئی لوگوں نے اس پر ضرور کلام کیا ہے؛ لیکن محدثین نے اس کے متعلق "غَرِیْبٌ سَنَدًا، لَا مَتْنًا" کہتے ہوئے اس مضمون کی توثیق بھی کر دی ہے، علاوہ ازیں اس موقع پر وہ روایت بھی پیش نظر رہے جس میں یہ ذکر کیا گیا:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:" قَالُوْا:" یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! مَتٰی وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ: " وَ آدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ ص:۵۱۳/ باب فضائل سید المرسلین ﷺ)

صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا کہ حضور! آپ کے لیے نبوت کس وقت سے ثابت ہے؟ تو فرمایا: ''ابھی حضرتِ آدم علیہ السلام روح اور جسد کے درمیان تھے، یعنی ان کا پتلا زمین پر ابھی تو بے جان ہی پڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کا فیصلہ فرما لیا تھا، یہ سبقت اور تقدم سے کنایہ ہے، اس روایت سے بھی آپ ﷺ کی اولیت ثابت ہوتی ہے، مزید ایک روایت میں مذکور ہے کہ ''میں تخلیق میں سب نبیوں سے پہلے اور بعثت میں سب سے آخری ہوں۔''

طینت جس کی سب سے مطہر — بعثت جس کی سب سے مؤخر
خلقت جس کی سب پہ مقدم — صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

ان حقائق سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اولیت کا جو مقامِ رفیع حاصل ہے وہ رفعتِ ذکر ہی کا ایک حصہ ہے، چنانچہ اب جب بھی تخلیق کائنات یا تخلیق آدم کا تذکرہ آئے گا تو حضرت محمد ﷺ کا تذکرہ ضرور آئے گا، اور اس طرح وعدۂ ربانی ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِکْرَكَ ﴾ کا عملی ظہور ہوگا۔

(۲) تخلیق انسانیت کے بعد حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی بعثت ہوئی

ہے، حضور ﷺ سے پہلے نبیوں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک رہا، اب تمام نبیوں اور رسولوں پر تو ان کے زمانہ کے لوگوں اور امتیوں کو ایمان لانا ضروری تھا؛ لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا مقامِ عظیم عطا فرمایا کہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر نبیوں اور رسولوں کو بھی ایمان لانا ضروری ہے، جس کا تذکرہ قرآنِ کریم کی ایک آیت: ﴿وَ إِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ﴾ (آل عمران: ۸۱) میں ہے۔

چنانچہ شیخ ابوالحسن تقی الدین سبکیؒ کا مستقل رسالہ ہے، جو آیت بالا کی تفسیر سے متعلق ہے، جس کا نام "التعظیمُ والمنۃُ فی لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" ہے، اس میں مفسرین کا یہ قول منقول ہے کہ ''رسولِ مُصدِّق'' سے مراد اِس جگہ ہمارے نبی ﷺ ہیں، اور کوئی نبی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد نہ لیا ہو کہ محمد ﷺ کو میں مبعوث کروں گا، اگر وہ تمہارے زمانہ میں آئیں تو تم ان پر ایمان لانا، اور ان کی مدد کرنا، اور اپنی امت کو بھی اس کی وصیت کرنا۔'' اس کے بعد آگے لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اور اخذِ میثاق میں نبی اکرم ﷺ کی جس عظمت شان کا بیان ہے وہ پوشیدہ نہیں، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں آپ ﷺ کی بعثت ہوتی تو آپ ﷺ ان کے لیے بھی مرسل ہوتے، اور اس طرح سے آپ ﷺ کی نبوت ورسالت تمام مخلوق کو عام ہوگئی، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر آخری زمانہ تک، اور اس طرح سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں سب آپ ﷺ کی امت میں داخل ہیں، اور آپ ﷺ کا ارشاد: "بُعِثْتُ إِلَی النَّاسِ کَافَّةً" صرف ان ہی لوگوں سے متعلق نہیں جو آپ ﷺ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک ہوں گے؛ بلکہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جو آپ ﷺ سے پہلے تھے، اور اس سے آپ ﷺ کے ارشاد: "کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ" کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے۔'' (مستفاد از: ''انوار البیان'' ص:۴۶۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ ان کی قوم وعلاقہ اور امت تک محدود تھا؛ لیکن آپ ﷺ کی بعثت کائنات کے آغاز سے اختتام تک ہے، اس

لیے ساری کائنات میں آغاز سے اختتام تک ہر زمانہ میں آپ ﷺ کا تذکرہ ہوتا رہے گا، تو یہ بھی ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ ہی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اوجِ شرف کا بدر وہی ہے بزمِ رُسل کا صدر وہی ہے
بدرِ منور، صدرِ مکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

(۳) ویسے ہمارے جمہور مفسرین نے عام طور پر اس کی شرح میں اذان و خطبہ اور نماز و تشہد کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے، کیونکہ ساری کائنات میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اُن تمام جگہوں میں پنجوقتہ نمازوں کا اعلان بذریعۂ اذان ہر جگہ ہونا طے ہے، تو اذان میں اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کے ساتھ محمد ﷺ کی ہمہ گیر رسالت کا اعلان بھی ہوتا ہے، پھر نماز جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، جس میں التحیات واجب ہے، اس میں محمد ﷺ کا تذکرہ ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد ہی حضور ﷺ پر مستقل درود کو مسنون قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی آپ ﷺ کی رفعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس سے آگے بڑھئے، حمد صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ کا پہلا ہی جملہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ ہے، مگر خطبہ خواہ جمعہ کا ہو یا عیدین اور نکاح کا، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام کو امت کا عام معمول بنا کر حضور ﷺ کی رفعت کا ایک اور ثبوت گویا مہیا فرما دیا گیا۔

(۴) آخر میں میدانِ حشر کا بھی ذرا تصور کر لیجئے! اس دن بھی آپ ﷺ کو وعدۂ ربانی ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ کی گویا تکمیل کرتے ہوئے عظمت و فضیلت اور سیادت سے آپ ﷺ کو نوازا جائے گا، جیسا کہ حدیث مذکور میں اس کا تذکرہ ہے، اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو منصب شفاعت کبریٰ سے بھی نوازا جائے گا، سب کو اس شفاعت کے لیے آپ ﷺ کی جستجو ہوگی، پھر شفاعت کے بعد آپ ﷺ ہی جنت کے دروازے کھلوائیں گے، حدیث میں ہے:

" أَنَا أَوَّلُ شَافِعٍ، وَ أَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَ لَا فَخْرَ، وَ أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُحَرِّكُ

حِلَقَ الْجَنَّةِ، فَيَفْتَحُ اللّٰهُ لِيْ، فَيُدْخِلُنِيْهَا، وَ مَعِيَ فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَ لَا فَخْرَ، وَ أَنَا أَكْرَمُ الْأَوَّلِيْنَ وَ الْآخِرِيْنَ عَلَى اللّٰهِ، وَ لَا فَخْرَ." (رواہ الترمذی والدارمی، مشکوٰۃ/ص:۵۱۳)

میں قیامت کے دن پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا، اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کی شفاعت قبول کی جائے گی؛ مگر میں یہ فخر سے نہیں کہتا، اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جو جنت کے حلقات کو حرکت دے گا، تو حق تعالیٰ اُسے میرے لیے کھول دیں گے، اور مجھے اس میں داخل فرمائیں گے، تو میرے ساتھ (اپنے مراتب کے لحاظ سے) فقراءِ مسلمین (جو انصار و مہاجرین میں سے) ہوں گے داخل ہوں گے، اور میں یہ بات فخر سے نہیں کہتا، اور اولین و آخرین (حضرت انبیاء و رسل علیہم السلام) میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ اکرم و عظمت والا میں ہوں، مگر یہ بات میں فخر سے نہیں کہتا۔" (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ کا جو انعام عطا فرمایا ہے اس کے اظہار کے لیے کہتا ہوں)

ان حقائق کے بعد اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ از اول تا آخر آغازِ انسانیت کا مرحلہ ہو، یا میدانِ قیامت کا، ایمان و اعمال کی بحث ہو، یا شریعت کے احکام کی، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہر جگہ ہے، اور جب تک ایمان، اسلام اور مسلمان ہیں آپ ﷺ کا تذکرہ ہوتا رہے گا، اور یہی مفہوم ہے فرمانِ الٰہی: ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ کا۔

گر چشم بصیرت ہو تو بے شک دیکھے جو حد ہو تصور کی واں تک دیکھے
جو کوئی رفعتِ محمد کو سمجھنا چاہے وہ شانِ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" دیکھے

حق تعالیٰ آپ ﷺ کی شانِ رفعت کے طفیل ہمیں بھی صحیح امتی بنا کر دارین میں رفعت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۱۲/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۵ھ
مطابق: ۱۴/ مارچ/ ۲۰۱۴ء/ بزمِ صدیقی، بڑودا

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

(۳۸)

علم اور اہل علم کی عظمت وفضیلت

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (سورة المجادلة : ١١)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ ایمان والے ہیں، اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے گا۔

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ، وَ وَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ وَ اللُّؤْلُؤَ وَ الذَّهَبَ."

(ابن ماجه والبيهقي في شعب الإيمان، مشكوة/ص:٣٤)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور نااہل کو علم سکھانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص خنزیر کے گلے میں جواہرات اور موتی اور سونے کا ہار ڈالے۔''

انسان کی عظمت علم وفہم کی وجہ سے ہے:

اللہ رب العزت نے اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں موجود بے شمار مخلوق پر انسان کو عظمت وفضیلت عطا فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (بنی إسرائيل : ٧٠)

یقیناً ہم نے اولادِ آدم کو بڑی عظمت وفضیلت عطا فرمائی، اور اُنہیں خشکی وتری میں (بر وبحر میں) سواریاں مہیا کیں، اور اُنہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا فرمایا، اور اُنہیں بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی۔

یہ فضیلت وعظمت انسان کو اس کی جسمانی طاقت وقوت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں تو اونٹ اور اس کی طرح اور بھی مخلوق ہے جو جسمانی طاقت وقوت میں انسان سے بڑھی ہوئی ہے، اور نہ ہی انسان کی عظمت وفضیلت اس کی ظاہری جسامت کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ ہاتھی اور اس جیسی بہت سی مخلوق جسامت میں انسان سے کہیں زیادہ ہے، اِسی طرح انسان کی عظمت اس کی شجاعت کی وجہ سے بھی نہیں، وجہ یہ ہے کہ شیر اور اس کے مانند بہت سی مخلوق شجاعت میں انسان سے بڑھ کر ہے، نیز انسان کی عظمت اس کی ظاہری شکل وصورت کی وجہ سے بھی نہیں، اس لیے کہ بہت سے پرندے اللہ تعالیٰ نے ایسے پیدا فرمائے ہیں جو بہت ہی خوبصورت اور ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بڑے حسین ہیں، حتیٰ کہ انسان کی عظمت محض عبادت کی وجہ سے بھی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف انسان ہی نہیں؛ بلکہ جنات، ملائکہ بلکہ ہر مخلوق کرتی ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ إِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (بنی إسرائيل : ٤٤)

''کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو؛ لیکن تم لوگ ان کی تسبیح وتحمید کو سمجھتے نہیں ہو۔''

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عظمت وفضیلت تو عطا فرمائی، لیکن عظمت انسانی کا انحصار اور دار ومدار نہ اس کی طاقت وقوت پر ہے، نہ جسامت و شجاعت پر ہے، حتیٰ کہ نہ شکل وصورت پر ہے، نہ محض عبادت پر؛ بلکہ عظمت انسانی کا اصل

انحصار اور دارومدار اس علم وفہم اور عقل وشعور پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے صرف انسان کو عطا فرمایا ہے، جب کہ دوسری مخلوق حتیٰ کہ ملائکہ بھی اس سے محروم ہیں۔

علم کے بغیر عمل مشکل ہے:

اللہ رب العزت نے انسان کو علم وفہم اور عقل وشعور عطا فرما کر ساری مخلوق میں عظمت اسی لیے عطا فرمائی کہ انسان کو زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنانا تھا، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾ (الأنعام: ۱۶۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا، اور خلیفہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام واوامر پر خود بھی عمل کرے، اور اپنی بساط واستعداد کی حد تک دوسروں سے بھی ان پر عمل کرانے کی مبارک سعی وکوشش کرے۔

ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کے پاس علم وفہم اور عقل وشعور بھی ہو، کیونکہ علم وفہم کے بغیر اللہ تعالیٰ کے اوامر واحکام پر عمل نہیں ہوسکتا، اسی لیے علماءِ محققین کے یہاں یہ عجیب وغریب مسئلہ زیر بحث آیا کہ "مَا الفرضُ قَبْلَ الفرضِ؟" وہ کون سا فرض ہے جو فرض سے پہلے فرض ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا: "العلمُ قبلَ العَمَلِ." (مرقاۃ) فرائض واحکام پر عمل سے قبل ان کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز سے پہلے نماز کا، زکاۃ سے پہلے زکاۃ کا، روزہ سے پہلے روزہ کا، حج وقربانی سے پہلے حج وقربانی کا، تجارت وملازمت سے پہلے ان کا، اسی طرح نکاح وغیرہ سے پہلے نکاح وغیرہ کا، غرض! ہر حکم پر عمل سے قبل اس کا ضروری علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۷۳)

اس آیت کریمہ میں ناواقف لوگوں کو علم حاصل کرنے کا صریح حکم دیا گیا ہے، جس کو حدیثِ مذکور میں غالباً اس طرح بیان فرمایا کہ " طَلَبُ العِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ"، یعنی ہر اس شخص پر جو مسلمان ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ اسلام قبول کر کے اس نے ساری زندگی اسلامی تعلیمات وہدایات کے مطابق گزارنے کا عزمِ مصمم کرلیا ہو، اس کے لیے دین اسلام کے احکام کا ضروری علم حاصل کرنا خواہ اہل علم کی صحبت وسماع کے ذریعہ ہو، یا نوشت وخواند (لکھنے پڑھنے) کے ذریعہ ہو، بہرکیف! اسلامی احکام کا ضروری علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اس کے بغیر نہ وہ دین اسلام کے احکام پر عمل ہوسکتا ہے اور نہ خلافت ارضی کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

علم کی فرضیت کی تفصیل:

پھر اس فرضیت علم کی بھی تفصیل ہے، علماءِ محققین کے بقول علمِ دین کا کچھ حصہ تو فرضِ عین ہے، مثلاً ہر مسلمان مرد وزن پر اتنا علم سیکھنا فرض ہے جس سے عقائد کی تصحیح، طہارت ونجاست سے متعلق مسائل، عباداتِ واجبہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج) کی تفصیل، حلال وحرام کی تمیز اور اُن معاملات کے احکام معلوم ہوجائیں جو روزمرّہ پیش آتے ہیں، اور جن سے بار بار واسطہ پڑتا رہتا ہے، مثلاً تاجروں کو بیع کی صحت وفساد اور سود کے مسائل، ملازمین کو ملازمت، کاشتکاروں کو زراعت وغیرہ کے احکام، یا جب ایک آدمی نکاح کرنے کا ارادہ کرے تو نکاح، طلاق اور عدّت وغیرہ کے مسائل، غرضیکہ اللہ تعالیٰ جس انسان کے ذمہ جو کام لگائے، یا جن کو وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے ان تمام کاموں کے احکام ومسائل کا علم اس انسان کے ذمہ فرض ہے۔

اس کے علاوہ قرآن وحدیث کے معانی، مطالب اور مفاہیم اور ان سے جو احکام ومسائل مستنبط ہوتے ہیں وغیرہ، ایسی تمام باتوں کا علم فرضِ کفایہ ہے، اس لیے ہر شہر کے مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اپنے شہر میں کسی کو ایسا عالم دین بنائیں یا اس کو بلوائیں جو ان

تمام مسائل سے واقف ہو، اور بوقتِ ضرورت فتویٰ بھی دے سکے، اگر ایسا نہیں کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے، کسی شہر میں ایک آدمی بھی اس علم کے حصول کے لیے تیار ہو جائے یا ایسے عالم کا انتظام ہو جائے تو سب کے ذمہ سے فریضہ ساقط ہو جائے گا، یہی فرضِ کفایہ کا مفہوم ہے۔ (اشرف المشکوٰۃ:۲/۳۲۹)

ایمان کے بعد بہت ہی عظیم نعمت علم ہے:

یہی وجہ ہے کہ جس وقت حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد اولادِ آدم کو اپنی خلافت عطا فرما کر عزت وعظمت دینے کا ارادہ فرمایا، تو قرآن کہتا ہے کہ پہلے اُنہیں علم وفہم سے نوازا گیا، اور پھر خود ہی علم کی تعلیم دی، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (البقرة : ۳۱)

’’حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو (بطورِ الہام والقاء کے) علم الاسماء سے نوازا‘‘ کائنات کی تمام مخلوق پر عظمت وفضیلت عطا کرنے کے لیے، تمام چیزوں کا علم بھی عطا کیا، اور فرشتوں میں چوں کہ اس کی استعداد نہ تھی اسی لیے اس علم سے فرشتے محروم رہے، جیسا کہ خود ہی انہوں نے اقرار کیا:

﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرة : ۳۲)

’’اُن ملائکہ نے کہا: ’’آپ کی ذات پاک ہے، ہمارے پاس وہی علم ہے جس کی صلاحیت آپ نے ہم میں پیدا فرمائی، بلاشبہ آپ ہی علیم وحکیم ہیں۔‘‘ قرآن کے بیان کے مطابق بھی اسی علم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر عظمت وفضیلت عطا فرمائی، سجدۂ تعظیمی کروایا، تاکہ ساری مخلوق جان لے کہ انسانی عظمت وفضیلت کا راز ایمان اور علم میں ہے، معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد بہت عظیم نعمت علم ہے۔

علم والے کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا:

ان حقائق کے باوجود اگر کوئی انسان سرے سے علم وایمان ہی سے محروم رہے تو

قرآن کہتا ہے کہ پھر ایسے انسان تو حیوان سے بھی زیادہ بدتر ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی کوئی عظمت وفضیلت نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ (الأعراف : ۱۷۹)

لیکن جس خوش نصیب انسان کے پاس دولت ایمان تو ہے؛ مگر دولت علم نہیں، تو چوں کہ علم اور ایمان میں گہرا ربط اور تعلق ہے، وہ اس طرح کہ علم کے بغیر انسان احکامِ الٰہی اور ایمانی تقاضوں کو کما حقہ پورا نہیں کرسکتا، اور ایمان میں یقین کی کیفیت بھی پیدا نہیں ہوسکتی، اور ایمان کے بغیر علم لائق اعتبار نہیں، لہٰذا ایمان وعلم کے بغیر عظمت نہیں مل سکتی، اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس ایمان والے کا بھی وہ مقام نہیں جو علم والے بندے کا ہوتا ہے، اسی کو ایک دوسرے مقام پر قرآن نے یوں بیان فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر : ۹)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب! آپ کہہ دیجئے کہ عالم وجاہل برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟ عالم کے مقابلہ میں ایک جاہل کی حیثیت ہی کیا ہے؟ حدیث پاک میں تو یہاں تک فرمایا کہ ایک عالم کے مقابلہ میں جاہل ہی نہیں؛ بلکہ عابد (غیر عالم) کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ فرمایا: ”فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى أَدْنَاكُمْ.“ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۳٤) ”ایک عالم باعمل کو (بے علم) عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی فضیلت مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر حاصل ہے۔“ یعنی جس طرح معلم اعظم رحمت عالم ﷺ کی عظمت شان کا اندازہ ایک ادنیٰ شخص کے مقابلہ میں نہیں لگایا جاسکتا، اسی طرح ایک عالم ربانی کی عظمت شان کا اندازہ عابد کے مقابلہ میں نہیں لگایا جاسکتا۔ لہٰذا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دین وایمان کے ساتھ علم دین کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا ہو ان کی عظمت شان کا کیا کہنا؟ درحقیقت یہی لوگ دارین میں عزت وعظمت کے حقدار ہیں۔

قیامت میں علماء کا مقام:

جیسا کہ خود حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ﴾ (المجادلة:۱۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم بھی عطا کیا گیا، حق تعالیٰ ان کے درجات کو بہت بلند کرے گا۔ اس وعدۂ الٰہی کے مطابق آخرت میں حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد علماء کو سب سے بلند درجات سے نوازا جائے گا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " یَشْفَعُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ثَلَاثَةٌ: الْأَنْبِیَاءُ، ثُمَّ الْعُلَمَاءُ، ثُمَّ الشُّهَدَاءُ." (ابن ماجه، مشكوٰة/ص:٤٩٥/ باب الحوض والشفاعة)

قیامت کے دن (اول مرحلے میں) تین مقدس جماعتیں شفاعت کریں گی، سب سے پہلے حضرات ابنیاء ورسل علیہم السلام، پھر حضرات علماءِ اسلام، ان کے بعد شہداءِ اسلام، پھر ان کی شفاعت کی برکت سے ہم میں سے کتنوں کی قسمت بدل جائے گی، کتنے ہی جہنمی جنتی بن جائیں گے، علاوہ ازیں اس موقع پر محدثین فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں "ثُمَّ" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علماءِ اسلام کا مقام شہداءِ اسلام سے بھی اونچا ہے، کیونکہ حدیث میں حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد علماء کا تذکرہ ہے، پھر شہداء کا، اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو حافظ شیرازیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میزان عدل میں "مِدادُ العلماءِ ودمُ الشُّهداءِ" یعنی علماء کے قلم کی روشنائی اور خونِ شہداء کا بھی وزن کیا جائے گا تو خونِ شہداء پر علماء کی روشنائی وزنی ہوگی۔ (مظاہر حق جدید/ص:۱۷۸)

یہ ہے ﴿ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ﴾ کی ایک مثال۔ ویسے اس وعدۂ الٰہی کا اصل تعلق تو دار الجزاء سے ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا؛ مگر رب العالمین علم دین کی برکت سے دنیا میں بھی حقیقی و سچی عظمت اور عزت حضرات علماء کو عطا فرماتے ہی ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے علم وعمل میں مخلص ہوں، اور وہ اوصاف پیدا کریں

جو ایک عالم میں مطلوب ہیں۔

دنیا میں بھی اصل عزت علم ہی سے ملتی ہے، مال و جمال سے نہیں:

شاید اسی لیے حضرت شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

بنی آدم از علم یابد کمال   نہ از حشمت و جاہ و مال ومنال

کہ انسان کی عظمت اور اس کا اصل کمال تو (ایمان اور) علم سے ہے، مال ومنال اور حسن وجمال سے نہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہی ہے، قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں، مثلاً دیکھئے کہ حضرت لقمان حکیمؒ کا تذکرہ موجود ہے، ان کے علم وحکمت سے لبریز نصائح قرآن نے بیان فرما کر گویا ان کی عظمت شان میں چار چاند لگا دیے، حالاں کہ آپ کے پاس نہ مال ومنال تھا، نہ حسن وجمال تھا، انہیں یہ عظمت وعزت کیوں ملی؟ قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾ (لقمان: ۱۲)

ہم نے لقمان کو (ایمان کے علاوہ) علم وحکمت سے نوازا۔ تو اسی سے ان کی عظمت وعزت بڑھ گئی، اسی طرح قرآن کریم میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی مثال سے بھی یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی عظمت مال ومنال اور حسن وجمال سے نہیں ہوتی؛ بلکہ ایمان اور علم دین سے ہوتی ہے، کیونکہ حسن وجمال میں اگر چہ سیدنا یوسف علیہ السلام بے مثال تھے؛ مگر جب تک آپ کو علم عطا نہیں ہوا اس وقت تک آپ کا کیا حال تھا؟ قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ ﴾ (یوسف: ۲۰)

غلاموں کی طرح معمولی قیمت میں بکتے رہے، انتہا یہ ہے کہ آپ علیہ السلام اسی غلامانہ حالت میں اپنے بے مثال حسن وجمال کے باوجود جیل تک جا پہنچے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم سے نوازدیا:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ (یوسف: ۲۲)

تو اسی علم کے طفیل آپ کو دنیا میں بھی وہ عظمت وعزت ملی کہ جیل سے سیدھے قصر شاہی میں جا پہنچے۔

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ :

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾

نا اہل و بے عمل علماء کے لیے وعید:

صاحبو! بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے اور رہے گا، اگر اہل ایمان خلوصِ نیت و سچی طلب ومحنت کے ساتھ علم دین حاصل کریں، پھر اس کی حفاظت کے ساتھ اس پر عمل کریں، یعنی اہل ایمان حصول علم کے بعد اپنے اندر مطلوب اوصاف پیدا کرلیں تو آج بھی حقیقی عظمت وعزت ان علماءِ عاملین وکاملین ہی کے لیے ہے اور رہے گی۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: "لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوْا الْعِلْمَ، وَ وَضَعُوْهُ عِنْدَ أَهْلِهٖ، لَسَادُوْا بِهٖ أَهْلَ زَمَانِهِمْ، وَ لٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِأَهْلِ الدُّنْيَا، لِيَنَالُوْا بِهٖ مِنْ دُنْيَاهُمْ، فَهَانُوْا عَلَيْهِمْ." (مشکوۃ/ص: ۳۷/ کتاب العلم، بحوالہ: ابن ماجہ)

اگر علماء علم کی حفاظت کریں (جس کے لیے علم پر عمل اور علمی شغل ضروری ہے) اور علم کو قدر دانوں ہی کے سامنے پیش کریں، تو یقیناً وہ اپنے علم کی وجہ سے اہل زمانہ کے سردار بن جائیں گے، دلوں کے بے تاج بادشاہ بن جائیں گے، لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا، بلکہ علم کو دنیاداروں اور نااہل لوگوں پر دنیا کے لالچ میں خرچ کیا، تو ذلیل ہوں گے۔

نا اہل وہ لوگ ہیں جن کا دل رذائل سے بھرا ہوا ہو، تو چوں کہ دل علم کا برتن ہے، اس لیے جن کا دل رذائل سے پاک نہیں ایسے نا اہل و بے عمل نام نہاد لوگوں کو علم کی تعلیم دینا ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کے گلے میں سونے جواہرات کا ہار ڈال دیا جائے، اس سے ان کی عظمت نہیں بڑھ جاتی، بلکہ اس ہار کی توہین ہوتی ہے، ٹھیک یہی حال ان نا اہل اور بے عمل نام

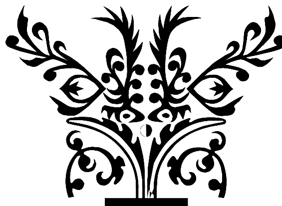
نہاد علماء کا ہے، یہ علم ان کے لیے کوئی عظمت نہیں؛ بلکہ یہ علم ان کے خلاف حجت ثابت ہوگا، عاجز کے خیالِ ناقص میں ان کی مثال اس گیدڑ کے مانند ہے جو اُڑتا تو آسمانوں میں ہے؛ مگر کھاتا مردار ہے۔ العیاذ باللہ۔ ضرورت ہے اس بات کی کہ اہل ایمان علم وعمل سے عظمت دارین حاصل کریں۔

اللہ پاک توفیق عطا فرما کر اپنے کرم سے ہمیں دارین کی عظمتوں کا حقدار بنائے۔

۱۲/ رجب المرجب/ ۱۴۳۵ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۱۶/ مئی/ ۲۰۱۴ء
(بزمِ صدیقی بڑودا)

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۳۹)

اولیاء اللہ کی پہچان اور شان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: " إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ: " مَنۡ عَادٰی لِیۡ وَلِیًّا فَقَدۡ آذَنۡتُهٗ بِالۡحَرۡبِ، وَ مَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبۡدِیۡ بِشَيۡءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افۡتَرَضۡتُ عَلَیۡهِ، وَ مَا یَزَالُ عَبۡدِیۡ یَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ، حَتّٰی أُحِبَّهٗ، فَإِذَا أَحۡبَبۡتُهٗ کُنۡتُ سَمۡعَهُ الَّذِیۡ یَسۡمَعُ بِهٖ، وَ بَصَرَهُ الَّذِیۡ یُبۡصِرُ بِهٖ، وَ یَدَهُ الَّتِیۡ یَبۡطِشُ بِهَا، وَ رِجۡلَهُ الَّتِیۡ یَمۡشِیۡ بِهَا، وَ إِنۡ سَأَلَنِیۡ لَأُعۡطِیَنَّهٗ، وَ لَئِنِ اسۡتَعَاذَنِیۡ لَأُعِیۡذَنَّهٗ، وَ مَا تَرَدَّدۡتُ عَنۡ شَيۡءٍ أَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیۡ عَنۡ نَفۡسِ الۡمُؤۡمِنِ، یَکۡرَهُ الۡمَوۡتَ، وَ أَنَا أَکۡرَهُ مَسَاءَتَهٗ، وَ لَا بُدَّ مِنۡهُ." (رواه البخاری، مشکوٰۃ/ص:۱۹۷/ باب ذکر اللّٰه عزّ وجلّ والتقرب إلیه)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہو، تو میں اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہوں، اور جن عبادتوں کے ذریعہ میرا بندہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں میرے نزدیک محبوب ترین عبادت وہ ہے جس کو میں نے (مامورات ومنہیات کے طور پر) فرض کیا ہے، اور میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا بہت ہی زیادہ قرب حاصل کرلیتا ہے،

219

حتیٰ کہ پھر تو میں اس کو محبوبیت کا وہ مقام عطا کرتا ہوں کہ میں اس کا (گویا) کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں، اور اگر وہ کسی چیز سے میری پناہ میں آنا چاہتا ہے تو میں اس کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں، اور میں جو کام کرنے والا ہوں اس میں مجھے کبھی ایسا تردد نہیں ہوتا جیسا کہ مومن کی جان (قبض کرنے) کے بارے میں ہوتا ہے، (کیونکہ) وہ موت کو ناگوار محسوس کرتا ہے، تو میں (بھی) اس کی ناگوار چیز کو ناگوار محسوس کرتا ہوں، جب کہ موت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔'' (حدیث قدسی نمبر:۱۳)

تمہید:

اللہ جل شانہ کی سنت وعادت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ جب بھی انسانوں میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے، تو ان کی اصلاح کے لیے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو جس کو نبی اور رسول کہتے ہیں مبعوث فرماتے ہیں، یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم النبیین بنا کر اب تا قیامت نبوت کا دروازہ تو بند کردیا، لیکن انسانوں کی صلاح فلاح کے لیے ولایت کا دروازہ کھول دیا، اس لیے گویا ہدایت کا جو کام پہلے نبوت کے راستے سے ہوتا تھا اب وہ ولایت کے راستے سے ہوتا رہے گا، کیونکہ نبوت کا دروازہ بند ہوا، ولایت کا نہیں، اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آسکتا؛ لیکن ولی تو ضرور ہوسکتا ہے، یہ اسی کا اثر ہے کہ آج اگرچہ قحط الرجال کا دور ہے، جس میں انسان تو بہت ہی ارزاں وسستا ہوگیا؛ مگر انسانوں میں انسانیت اتنی مہنگی ہوگئی کہ ڈھونڈنے سے کہیں کہیں نظر آتی ہے، اس حقیقت کو ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا:

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: " سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوۡلُ: "إِنَّمَا النَّاسُ کَالۡإِبِلِ الۡمِائَةِ، لَا تَکَادُ تَجِدُ فِیۡهَا رَاحِلَةً." (مشکوٰۃ/ص:۴۵۸، بحواله: صحیحین)

انسانوں کی مثال ان اونٹوں کے مانند ہے جو بہت زیادہ تعداد میں ہیں، (کیونکہ حدیث میں "المائة" کا جو لفظ ہے وہ تحدید کے لیے نہیں؛ بلکہ تکثیر کے لیے ہے) لیکن ان میں سواری (سفر کی مشقت برداشت کرنے اور کام آنے) کے قابل ایک بھی نہیں ہوتا۔

یہی حال اس زمانے کا بھی ہے کہ بہ ظاہر انسانوں سے تو آج بھی ساری زمین بھری پڑی ہے؛ لیکن کام کے حقیقی انسان جن میں انسانیت ہو، ایسے بہت کم ہیں، اس حقیقت کے باوجود ربِ کریم اپنے فضل وکرم سے ہر دور میں انسانیت کی ہدایت کے لیے اپنے ایسے مخصوص بندوں کو پیدا فرماتے ہیں جو انسانیت کی آبیاری کا حیات بخش کام کرتے رہتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر میں ہر سال بارش کے بے شمار قطرات گرتے ہیں، جو کسی شمار اور کسی حساب میں نہیں ہوتے؛ لیکن ان ہی میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوشِ صدف میں پل کر ایسا قیمتی موتی بن جاتے ہیں جن کی قیمت بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتیں ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ یہی حال دنیا میں پیدا ہونے والے ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی خاص شمار میں نہیں ہوتے؛ لیکن ان ہی میں چند ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے اچھے اعمال واخلاق اور اوصاف کی وجہ سے فرشتوں میں بھی قابلِ رشک ہوا کرتے ہیں یہی لوگ خاصانِ خدا، علماء، صلحاء اور اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، بقولِ شاعر:

جہاں میں روز ہوتے ہیں، بہت اہلِ ہنر پیدا مگر مدتوں میں ہوتا ہے کوئی صاحب نظر پیدا

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

کمالِ عشق ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا ہزاروں میں کوئی مجنوں، کوئی فرہاد ہوتا ہے

قرآن میں اولیاء اللہ کی پہچان:

ان خاصانِ خدا علماء، صلحاء اور اولیاء اللہ کی پہچان اور شان اجمالی طور پر قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمائی:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ○ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ○ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ○﴾ (یونس:٦٢ تا ٦٤)

''یاد رکھو! جو اولیاء اللہ ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے خوشخبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اللہ تعالیٰ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، یہی زبردست کامیابی ہے۔''

آیت کریمہ کا ایک ایک لفظ قرآنِ کریم کی جامعیت کی بہترین دلیل ہے، فرمایا: "أَلَا"......لوگو! دنیا والو! اللہ والوں کو پہچانو! "إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ"، کیا مطلب؟ تو ''اولیاء'' کے دو مطلب بیان کیے: ایک یہ کہ لفظ ''اولیاء'' ولایت سے بنا ہے، اور ولایت ایمان کے بعد اتباعِ شریعت کا نام ہے، تو ایمان اور اتباعِ شریعت کے بغیر کوئی شخص اولیاء اللہ میں کبھی شامل نہیں ہوسکتا، اولیاء اللہ کی اصلی پہچان یہی ہے کہ وہ مومن اور متبع شریعت ہو، جو ایمان والا ہر حال میں شریعت کا اتباع کرے وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، خواہ اس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہو، اور خواہ وہ صوفیہ کے کسی سلسلہ میں شامل نہ ہو۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شخص آپ کی ولایت کی شہرت سن کر حاضر خدمت ہوا، کچھ مدت تک رہنے کے بعد بھی جب آپؒ کی کوئی کرامت ظاہر ہوتے نہیں دیکھی، تو سوچا کہ یہ اللہ کے ولی نہیں ہوسکتے، لہٰذا کسی اور کے پاس جانا چاہیے، جانے سے قبل حاضر ہوکر صاف صاف بتلا دیا کہ ''میں آپ کی ولایت کی شہرت سن کر آیا تھا؛ مگر افسوس! میں نے اس مدتِ قیام میں آپ سے کوئی کرامت نہیں دیکھی، جس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ولایت کی شہرت غلط ہے۔'' تب آپؒ نے فرمایا: ''اچھا، یہ بتلاؤ کہ اس مدتِ قیام میں تم نے مجھے خلافِ شریعت کسی کام کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا؟'' اس نے کہا: ''نہیں'' فرمایا: ''بھائی! یہی دراصل ولایت کی علامت ہے۔'' غرض! اولیاء اللہ کی پہلی علامت ایمان

اور اتباعِ شریعت ہے، جیسا کہ اگلی آیت: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''اولیاء'' ولی سے ماخوذ ہے، اور ولی عزیز، قریب اور دوست کو کہتے ہیں، اور ولی سے مراد وہ خوش نصیب ہے جو مامورات ومنہیات میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہو، یعنی جن باتوں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے حکم دیا ان پر عمل کرتا ہو، اور جن سے منع کیا ان سے بچتا ہو، اسی کو دوسرے لفظوں میں شریعت کا اتباع کرنا کہتے ہیں، تو بات وہی ہے کہ ایمان اور اتباعِ شریعت اور کثرتِ عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا روحانی قرب حاصل کرنے والا اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، جس کا حدیث مذکور میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ گویا اولیاء اللہ کی دوسری علامت ایمان اور اتباعِ شریعت کے علاوہ کثرتِ عبادت ہے، اس کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کا عزیز، قریب اور دوست بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے تقرب میں ترقی کر کے وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے کان، آنکھ، زبان اور اعضاء اللہ تعالیٰ کی منشاومرضی کے مطابق کام کرتے ہیں، اسی کو حدیث مذکور میں ''كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ ......الخ'' کے ذریعہ بیان فرمایا۔

علاوہ ازیں حدیث پاک میں اولیاء اللہ کی ایک اور پہچان یہ بیان کی گئی:

'' خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ إِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ.'' (مسند أحمد، والبيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة المصابيح/ص:٤١٥)

اللہ تعالیٰ کے بہترین (بلکہ قریب ترین) بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آجائے۔ کیونکہ اولیاء اللہ ایمان واتباعِ شریعت اور اس کے بعد نفل عبادت کی مشغولیت اور ذکر اللہ کی کثرت سے تعلق مع اللہ کے اس مرتبہ ومقام کو پہنچ جاتے ہیں کہ انوارِ الٰہی کے آثار ان کے اقوال واحوال میں نمایاں ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں دیکھ کر اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آنے لگتی ہے۔

اولیاء اللہ کی شان میں چند اشعار:

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باش اگر اہل دلی

ولی میں اللہ تعالیٰ کا نور ظاہر ہوتا ہے، اگر تو خود صاحب دل ہے تو اچھی طرح دیکھنے والا بن۔

اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے — نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر — انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی
ان ہی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے — ان ہی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں — پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں پر لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ پائیں — اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

غرض! اولیاء اللہ کی تیسری پہچان یہ ہے کہ انوارِ الٰہی کے آثار ان کے چہروں پر نظر آتے ہوں۔ قرآن نے اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ (الفتح: ٢٩)

ان کی علامت سجدے کے اثر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں آثار سے مراد وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع وخضوع سے ہر متقی وعبادت گزار کے چہرہ پر مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ (پیشانی پر جو نشان سجدہ کا پڑتا ہے وہ مراد نہیں۔) (گلدستۂ تفاسیر/ص:۵۴۳)

صاحبو! واقعی جب انسان نیک اور متقی بن جاتا ہے تو اس کی نیکی اور تقویٰ کا نور تو دل میں ہوتا ہی ہے؛ لیکن اس کی رونق چہرے پر ہوتی ہے، اس کی ولایت کا نور باطن سے ظاہر ہو کر چہرے کو بھی پرنور کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے اسے دیکھتے ہی دل بے اختیار پکار اٹھتا

ہے کہ یہ اللہ کا ولی ہے۔ اس لیے حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں: "اَلَّذِیْنَ إِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ." کہ انہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آ جائے، ان کی صحبت سے اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھ جائے۔

اولیاء اللہ کی شان:

ان ہی کی شان میں قرآن کہتا ہے: ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ "اولیاء اللہ پر کوئی خوف بھی نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔" خوف تو اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ لوگ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے پھر اسے کسی اور کا خوف نہیں ہوا کرتا، اور کسی بات سے رنجیدہ اس لیے بھی نہیں ہوتے کہ انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ ہر اچھی بری تقدیر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ وہ کسی چیز سے عام لوگوں کی طرح نہ خوف زدہ ہوتے ہیں، نہ غم زدہ، کیونکہ ان کا سرپرست اور والی براہِ راست اللہ تعالیٰ ہوتا ہے: ﴿وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ ظاہر ہے کہ جن کا والی اور سرپرست اللہ تعالیٰ ہو، اُنہیں کیا خوف اور کیا غم! ان سے دشمنی کرنے والے سے اللہ تعالیٰ نے خود جنگ کا اعلان کیا ہے۔

یا پھر اس کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ اس خوف و غم کا اصلاً تعلق آخرت سے ہے، یہ لوگ آخرت میں بالکل بے خوف و بے غم اور خوش و خرم ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَأُنَاسًا مَا هُمْ بِأَنْبِيَاءَ وَ لَا شُهَدَاءَ، يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَ الشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ"، قَالُوْا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ؟" قَالَ: "هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ، وَ لَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا، فَوَاللّٰهِ! إِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ، وَ إِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ، لَا يَخَافُوْنَ إِذَا خَافَ النَّاسُ، وَ لَا يَحْزَنُوْنَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ، وَ قَرَأَ

هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (أبوداؤد، مشكوٰة/ص: ٤٢٦)

حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: "اللہ کے کچھ بندے (اولیاء اللہ) ایسے ہیں جو اگرچہ نبی اور شہید نہیں ہیں؛ لیکن قیامت کے دن قربِ الٰہی کی وجہ سے ان پر حضرات انبیاء و شہداء بھی رشک یعنی تعریف یا تعجب کریں گے" صحابہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہمیں بتائیے کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "وہ ایسے لوگ ہیں جو (اسلامی احکام کے اتباع اور) اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، حالانکہ ان میں کوئی خونی رشتہ یعنی قرابت اور مال دولت کا معاملہ نہ ہوگا، پس اللہ کی قسم! قیامت کے دن بھی ان کے چہرے پرنور اور منور ہوں گے اور وہ (عرشِ الٰہی کے زیرِ سایہ) نور کے منبروں پر (یا نفس نور پر) متمکن ہوں گے، وہ لوگ اس وقت بھی خوف زدہ اور غم زدہ نہ ہوں گے جب کہ دوسرے لوگ خوف زدہ اور غم زدہ ہوں گے، پھر حضور ﷺ نے بطورِ دلیل یہی آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اولیاء اللہ کے لیے بشارت:

مزید اولیاء اللہ کی شان بیان کرتے ہوئے قرآنِ ذی شان نے ارشاد فرمایا:

﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ﴾

اولیاء اللہ کے لیے دنیوی اور اخروی زندگی میں بشارت ہے۔ دنیا میں اس طرح کہ انہیں قربِ الٰہی کی وجہ سے وہ قلبی سکون ملتا ہے جو بادشاہوں کو اپنے محلات میں نہیں ملا کرتا۔ حکیم اختر صاحبؒ فرماتے ہیں:

وہ شاہِ دو جہاں جس دل میں آئے　　مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے وہ پائے

علاوہ ازیں دنیوی بشارت کا ایک مصداق ان کی منجانب اللہ مخلوق کے مابین

مقبولیت بھی ہے، جو انہیں اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کے ساتھ محبت وتعلق کی وجہ سے نصیب ہوتی ہے۔

یا پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول دنیا کی بشارت یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے بشارت لے کر آتے ہیں اور حق تعالیٰ کی رضامندی کی خوشخبری سناتے ہیں، اور آخرت میں بشارت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی روح پرواز کرتی ہے تو اسے عالمِ بالا کی طرف لے جایا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خوشخبری دی جاتی ہے، چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے جو ایک طویل حدیث موت اور مابعد الموت کے احوال کے متعلق مروی ہے، اس میں موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی بشارت کا ذکر ہے، نیز قبر میں بشارت دیے جانے کا ذکر بھی ہے۔ (مشکوۃ/ص:۱۴۲، از: انوار البیان/ص:۲۴۸)

اللہ والا بننے کا قرآنی نسخہ:

یہ ہے اولیاء اللہ کی پہچان اور شان، اب اگر واقعی ہم بھی اولیاء اللہ کے زمرے میں شامل ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں، بلاشبہ کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا؛ لیکن ولی تو ہر کوئی بن سکتا ہے، بس اس کے لیے چند چیزوں کا اہتمام کریں: (۱) ایمان اور اتباعِ سنت وشریعت۔ (۲) گناہ اور اسبابِ گناہ سے حفاظت۔ (۳) ذکر اللہ کی کثرت۔ (۴) اور اسی کے ساتھ اللہ والوں کی صحبت۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبة : ۱۱۹)

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں اور اچھوں کے ساتھ رہو۔

حضرات مفسرین نے اس کی غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "حَتّٰى تَكُوْنُوْا مِثْلَهُمْ فِيْ صِدْقِهِمْ" یعنی صادقین وصالحین کے ساتھ رہو، یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح ہو جاؤ۔ ویسے آیت کریمہ کا ظاہر خود یہ بتاتا ہے کہ صادقین وصالحین کی صحبت اختیار کرو، اس سے تم بھی صادق وصالح بن جاؤ گے، پھر جیسے کپڑے والوں کے یہاں کپڑا، دودھ والوں

کے یہاں دودھ اور جوتے والوں کے یہاں جوتا ملتا ہے، تو اللہ والوں کے یہاں اللہ ملتا ہے، اس کی محبت ملتی ہے، اس کا تعلق اور قرب ملتا ہے، لہٰذا ان کی صحبت اختیار کرو، اسی کے ساتھ دوسرا کام یہ ہے کہ ان کی شرعی ہدایات وتعلیمات کا اتباع کرو، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ (لقمان/ص :۱۵)

اور جو لوگ میری طرف رجوع کریں ان کے راستہ کا اتباع کر۔

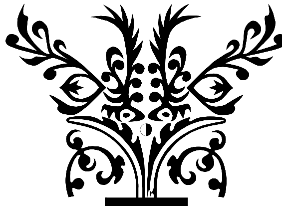
یہاں "سَبِيْلَ" سے مراد تو دین ہے، اور "مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ" سے مراد ایک قول کے مطابق دیندار اور پرہیزگار لوگ ہیں، اس میں ان کے اتباع کا حکم ہے۔ یہ وہ قرآنی نسخے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہر مسلمان کے لیے ولی اللہ بننا آسان ہو جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا عَلٰى طَرِيْقِهِمْ، وَ ارْزُقْنَا مِنْ بَرَكَتِهِمْ، وَ احْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهِمْ.

اے اللہ! ہمیں ان کے طریقے پر ثابت قدم رکھ، ان کی برکات سے نواز دے اور ہمیں اپنا ولیٔ کامل بنا دے۔ آمین یا رب العالمین۔

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَ كُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ)

☆......☆......☆



(۴۰)

فکرِ آخرت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: " وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِيْ الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهٗ فِيْ الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ."

(مسلم، مشکوٰۃ المصابیح : ٤٣٩)

ترجمہ: حضرت مستورد بن شدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمتِ عالم ﷺ سے سنا کہ دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی اپنی ایک انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے، اور پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔

آخرت کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے جس طرح اس عالمِ دنیا کو پیدا فرمایا جس میں ہم اور آپ اپنی زندگی گذار رہے ہیں اور جس کو ہم اپنی آنکھوں اور کانوں وغیرہ حواس سے محسوس کرتے ہیں، جس طرح یہ ایک واقعی حقیقت ہے اسی طرح اللہ رب العزت نے اس عالمِ دنیا کے بعد عالمِ آخرت کو بھی پیدا فرمایا ہے۔ آخرت سے مراد وہ زندگی ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے

224

جانے سے شروع ہو کر کبھی ختم نہ ہوگی، اور اسی میں دنیوی زندگی کے اچھے برے اعمال کی جزا وسزا دی جائے گی۔ عالمِ دنیا کی طرح عالمِ آخرت بھی ایک واقعی اور یقینی حقیقت ہے، جس پر ایمان ضروری ہے، قرآنِ کریم نے آخرت کو مختلف ناموں سے بیان کیا ہے، مثلاً سورۂ ''الحاقۃ'' میں اس کا ایک نام ''الحاقۃ'' ذکر کیا گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، اور اُسے قائم ہونا ہے، قرآن نے گویا اس لفظ سے لوگوں کو یہ بتادیا کہ آخرت کی بات یوں ہی نہیں؛ بلکہ وہ ایک حقیقت ہے، اور ہر حال میں واقع ہونے والی ہے، اس لیے آخرت کے سلسلہ میں کسی قسم کے تردّد اور شک میں پڑ کر اسے نظر انداز نہ کیا جائے، اب رہی بات یہ کہ اس دنیوی زندگی میں ہمارا آخرت کو نہ دیکھنا اور اُسے محسوس نہ کرنا، تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ میں ہونے کے زمانہ میں ہم اس دنیا کو نہ دیکھ سکتے تھے نہ محسوس کر سکتے تھے، لیکن جب ہم ماں کے پیٹ سے منتقل ہو کر دنیا میں آئے، تو ہم نے اس دنیا اور اس کی وہ تمام حیرت انگیز چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، بلکہ ان کا مشاہدہ وتجربہ کرلیا جن کا ہم ماں کے پیٹ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے، بالکل اسی طرح جب اس عالمِ دنیا سے موت کے بعد منتقل ہو کر ہم عالمِ آخرت میں پہنچیں گے، تو وہاں کی ان تمام حیرت انگیز چیزوں اور جنت وجہنم کو دیکھ لیں گے، جن کا اس وقت ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے، لیکن چوں کہ ان کی اطلاع اللہ رب العزت نے اپنی کتاب اور نبی ﷺ کے ذریعہ ہمیں دی ہے اور قرآنِ پاک کے بقول آخرت پر ایمان اہلِ ایمان کی پہچان ہے: ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ (البقرۃ: ٤) اس لیے الحمد للہ! ہم اہلِ ایمان آخرت پر یقین بھی رکھتے ہیں اور فکر بھی کرتے ہیں، اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ فکرِ آخرت درحقیقت چراغِ آخرت ہے؛ جو مومن ہی کے دل میں روشن ہوتا ہے۔

آخرت اور اس کی تمام چیزیں دائمی ہیں:

پھر قرآنِ پاک نے دنیا اور آخرت کے متعلق ایک یقینی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ

"دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے۔" ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ (الرحمن : ٢٦)

بقولِ شاعر:

ہر صبح طائرانِ خوش الحان ☆ کہتے ہیں: "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ"

دنیا کی ہر چیز آنی جانی اور فانی ہے، اس کے برخلاف آخرت اور اس کی ہر چیز غیر فانی اور دائمی ہے، بلکہ خود انسان بھی وہاں پہنچنے کے بعد غیر فانی بنا دیا جائے گا، وہاں اس کو بھی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی دی جائے گی، اس مضمون کو قرآنِ پاک نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَ إِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴾ (المؤمن : ٣٩)

"یہ دنیوی زندگی (اور اس کا ساز و سامان) تو بس چند دِنوں کے استعمال کے لیے ہے اور یقین جانو کہ آخرت ہی دراصل رہنے بسنے کا گھر ہے۔" تو یہاں کی ہر چیز وقتی ہے اور وہاں کی ہر چیز دائمی ہے۔

حدیثِ مذکور میں آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"وَ اللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهٗ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ."

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی فانی زندگی آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی حقیقت وحیثیت نہیں رکھتی جتنا کہ دریا کے مقابلہ میں انگلی پر لگا ہوا پانی، اور یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لیے دی ہے، ورنہ فی الحقیقت دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں، وجہ یہ کہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، خواہ وہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں، وقتی، متناہی، محدود اور فانی ہیں، جب کہ آخرت لامحدود، غیر متناہی، غیر فانی اور دائمی ہے، لہٰذا وہاں کی سزائیں اور مصیبتیں بھی دائمی ہوں گی، اور جزائیں و نعمتیں بھی، چنانچہ قرآن نے شقی اور بدبخت لوگوں کے بارے میں جو

دنیا ہی کے طلبگار تھے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَأَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ (هود : ١٠٦)

جو لوگ شقی ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے، جہاں ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں گی، یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ (البقرة : ١٦٧) یہ لوگ کبھی بھی دوزخ سے نہ نکلیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ وہاں کافروں اور مجرموں کو جو سزا دی جائے گی وہ دائمی ہوگی، اسی طرح آخرت کے اُمیدوار مومنوں اور فرماں برداروں کو جو جزا دی جائے گی وہ بھی دائمی ہوگی۔

فرمایا:

﴿ وَ أَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ (هود : ١٠٨) جو نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴾ (الحجر:٤٨) وہاں ان کو نہ کوئی تھکن ہوگی، نہ وہاں سے کبھی وہ نکالے جائیں گے۔

آخرت کا یقین اور استحضار:

ظاہر ہے کہ جب یہ حقیقت ہے تو اب نقل و عقل دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ ہماری ساری توجہ وطلب اور فکر و کوشش بس آخرت ہی کی بہتری کے لیے ہو، دنیا ضرورت پوری کرنے کی جگہ ہے، چاہت پوری کرنے کی نہیں، لہٰذا دنیا سے ہمارا تعلق بقدرِ ضرورت ہی ہو، ہم دنیا کے طلبگار بننے کے بجائے آخرت کے اُمیدوار بن جائیں، لیکن بظاہر یہ اسی وقت

آسان ہے جب آخرت کے حقائق کا مکمل یقین اور ان کا استحضار نصیب ہو جائے، آج صورتِ حال یہ ہے کہ آخرت کا کسی درجہ میں ہمیں یقین تو ہے؛ مگر اس کا استحضار و دھیان بہت کم ہے، اس لیے آخرت کے بجائے دنیا کی طرف ہماری رغبت اور توجہ زیادہ ہے، جب کہ حضراتِ انبیاء، صحابہؓ اور صلحاء کو یہ چیز میسر تھی، جیسا کہ قرآنِ کریم نے ان کے امتیازی وصف کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ إِنَّا أَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ﴾ (ص: ٤٦)

ہم نے ان کو ایک خاص وصف کے لیے چن لیا تھا، جو (آخرت کے) حقیقی گھر کی یاد تھی۔ یعنی یہ لوگ آخرت پر یقین، اس کا استحضار اور اس کو یاد رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی ساری رغبتیں اور دلچسپیاں آخرت کے ساتھ خاص ہو گئی تھیں، دنیا کی رنگینیوں سے ان کا دل اُٹھ چکا تھا۔

صاحبو! یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ دِل میں آخرت کا یقین اور اس کا استحضار پیدا ہونے کے بعد کسی بھی انسان کے لیے اس کی فکر اور تیاری کرنا، مراد گناہوں سے بچنا اور نیکیوں کا اہتمام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نہایت عبرت ناک واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبید بن عمیرؒ مشہور تابعی گذرے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی فصیح زبان دی تھی، ان کی مجلس میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی بیٹھا کرتے تھے، اور ان کی دل پر اثر کرنے والی گفتگو سے پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے، مکہ مکرمہ میں ایک جوان عورت شادی شدہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے غیر معمولی حسن سے نوازا تھا، یہ حسن بھی بڑی عجیب چیز ہے، بڑے بڑے بہادر، پہلوان اور سورما اس کے ایک نگاہِ غلط انداز کے وار سے ڈھیر ہو کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں، وہ بہادر جو کسی کے داؤ میں نہ آتا ہو بسا اوقات حسن کی بھولی سی نظر سے اس کے قلب وجگر کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، یہ خاتون ایک دِن آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی، شوہر سے کہنے

لگی: ''کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو یہ چہرہ دیکھے اور اس پر فریفتہ نہ ہو؟'' شوہر نے کہا: ''ہاں، ایک شخص ہے، حضرت عبید بن عمیر!'' اس عورت کو شرارت سوجھی، کہنے لگی: ''اگر آپ مجھے اِجازت دیں تو ابھی میں انہیں بھی اسیر محبت بنائے دیتی ہوں،'' شوہر نے اِجازت دی، تو وہ حضرت عبید بن عمیرؒ کے پاس آئی اور کہا: ''مجھے آپ سے تنہائی میں ایک ضروری مسئلہ پوچھنا ہے،'' حضرت عبید بن عمیرؒ مسجدِ حرام کے ایک گوشے میں اس کے ساتھ الگ کھڑے ہو گئے، تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب سرکایا، اور اس کا چاند سا حسین چہرہ قیامت ڈھانے لگا، حضرت عبیدؒ نے اُسے بے پردہ دیکھ کر فرمایا: ''اللہ کی بندی! اللہ سے ڈر،'' وہ کہنے لگی: ''میں آپ پر فریفتہ ہو گئی ہوں، آپ میرے متعلق غور کر لیں''...... دعوتِ گناہ کی طرف اشارہ تھا؛ مگر حضرت عبیدؒ اس کے جھانسے میں کب آنے والے تھے، فرمایا: ''میں چند سوالات پوچھتا ہوں، اگر تو نے ان کے صحیح جوابات دے دیے، تو میں تیری دعوت پر غور کر سکتا ہوں'' اس نے ہامی بھر لی، تو فرمایا: ''موت کا فرشتہ جب تیری روح قبض کرنے آ جائے، اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا؟'' کہنے لگی: ''ہرگز نہیں'' فرمایا: ''جواب درست ہے۔'' فرمایا: ''جب لوگوں کو قیامت کے دِن اعمال نامے پیش کیے جا رہے ہوں گے، اور تجھے اپنے متعلق معلوم نہ ہوگا کہ وہ دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں میں؟ کیا اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا؟'' کہنے لگی: ''ہرگز نہیں'' فرمایا: ''جواب صحیح ہے۔'' فرمایا: ''پل صراط عبور کرتے وقت تجھے اس گناہ کی خواہش ہوگی؟'' کہنے لگی: ''ہرگز نہیں'' فرمایا: ''جواب درست ہے'' پھر فرمایا: ''جب تو آخرت میں اللہ کے سامنے کھڑی ہوگی، اس وقت تجھے اس گناہ کی رغبت ہوگی؟'' کہنے لگی: ''بالکل نہیں'' اس پر آپؒ نے فرمایا: ''اللہ کی بندی! اللہ سے ڈر اور فکرِ آخرت کر!''

اس نصیحت سے اس عورت کے دل کی کائنات بدل گئی، جب وہ گھر لوٹی تو حالت یہ تھی کہ دنیوی لذتیں اُسے بے حقیقت معلوم ہونے لگیں، ساری رغبتیں آخرت کے ساتھ خاص ہو گئیں، پہلے اس کی ہر رات شبِ زفاف ہوا کرتی تھی؛ مگر اب ہر رات شبِ عبادت بن گئی۔ (کتاب الثقات للعجلی: ۲/ ۱۱۹، از: ''کتابوں کی درسگاہ میں'' /ص: ۵۳)

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

فکرِ دنیا کر کے دیکھا، فکرِ عقبیٰ کر کے دیکھ ☆ سب کو اپنا کر کے دیکھا، رب کو اپنا کر کے دیکھ

توشۂ آخرت:

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد انسان کی زندگی کو ایمانی و عملی بنانے، یعنی زندگی کو سنوارنے اور فلاح کے مقام تک پہنچانے کے لیے بنیادی طور پر اللہ کا ڈر اور آخرت کا فکر نہایت ضروری ہے، خوفِ خدا اور فکرِ عقبیٰ کی سچی اور یقینی کیفیت کے دل میں پیدا ہونے کے بعد کسی بھی انسان کے لیے معاصی سے اجتناب اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام آسان ہو جاتا ہے، اور یہی دراصل توشۂ آخرت ہے، یعنی ایمانِ کامل، اعمالِ صالحہ، تقویٰ اور فکرِ عقبیٰ، آخرت میں یہی چیز کام آنے والی ہے، اس لیے رحمتِ عالم ﷺ اپنی امت کو اپنے خطبات و مواعظ اور نصائح کے ذریعہ اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے، جیسا کہ مشہور صحابیٔ رسول سیدنا حنظلہ بن الربیع رضی اللہ عنہ کی مشہور و معروف روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کی مجالسِ مقدسہ کا خاص موضوع ایمان، اعمالِ صالحہ، خوفِ خدا اور فکرِ عقبیٰ ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہؓ کی دلی کیفیت ان مضامین کو سن کر یہ ہوتی گویا وہ دنیا میں نہیں؛ آخرت میں ہیں، اور احوالِ آخرت، جنت و دوزخ ان کے بالکل سامنے ہیں، یہ کیفیت اپنی حقیقت کے ساتھ آج ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہو جائے تو ہماری ساری رغبتیں دنیا سے ہٹ کر آخرت کے ساتھ ہو جائیں، اور دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہو جائے، نیز اعمالِ صالحہ کی رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہمیں توشۂ آخرت، یعنی ایمانِ کامل، اعمالِ صالحہ، تقویٰ اور فکرِ عقبیٰ کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۲۹/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۶ھ مطابق: ۱۷/ جولائی/ ۲۰۱۵ء/ قبل الجمعہ

A/ 11/ بزمِ صدیقی، شیم ڈپلیکس، تاندلجہ، بڑودا، گجرات

واردحال: خانقاہ جامعہ سراج العلوم اُجین، ایم. پی.

(اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کُلَّمَا ذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ، وَ کُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِکْرِہِ الْغَافِلُوْنَ)